

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

دعوت و فکر کے اہم پہلو (مولانا کی تحریروں کی روشنی میں)

بلال عبدالحی حسنی ندوی



سیدنا محمد بن عبد اللہؐ ایک لکھنؤ

دار عرفات، ہنگو کلاں، رائے بریلی

(طبع سوم)

ربیع الاول ۱۴۳۲ھ / جنوری ۲۰۱۳ء

نام کتاب :	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
مرتب :	دعوت و فکر کے اہم پہلو
تعداد اشاعت :	۱۰۰۰
صفحات :	۳۸۴
قیمت :	۲۳۰ روپے
کمپوزنگ :	طارق اشرف (ایپروچ کمپیوٹرز، امین آباد، لکھنؤ)

ملنے کے پتے

- ابراہیم بک ڈپو مدرسہ ضیاء العلوم، میدان پور، تکیہ کلاں
- رائے بریلی (یو پی)
- مجلس تحقیق و نشر اسلام دارالعلوم، ندوۃ العلماء، لکھنؤ
- مکتبۃ الشباب شباب مارکیٹ، ندوہ روڈ، لکھنؤ

ناشر

سید احمد شہید ایکادمی

دارعرقا، تکیہ کلاں، رائے بریلی (یو پی)

فہرست

۴۲..... مغربی تہذیب پر گہرائی کے ساتھ تنقید.....	۷..... عرض مرتب.....
۴۳..... مغربی تہذیب کا شجرہ نسب.....	۱۱..... پیش لفظ.....
۴۷..... دین و دنیا کی تفریق.....	۱۲..... مقدمہ.....
۴۷..... یورپ کی کوتاہ نظری.....	
۴۹..... مکمل مادیت کی طرف.....	
۵۰..... یونانی و رومی تہذیب کا نیا ایڈیشن.....	
۵۱..... تنقید کا وسیع دائرہ.....	
۵۲..... زیر پرستی و خدا فراموشی.....	
۵۳..... قومیت و وطنیت اور اس کے نقصانات.....	
۵۶..... قوت و اخلاق کا عدم توازن.....	
۵۸..... دجل و فریب.....	
۶۰..... غلو اور انتہا پسندی.....	
۶۰..... خالق کائنات سے بغاوت.....	
۶۱..... اسلام پر مغرب کی یلغار.....	
۶۲..... استشراق.....	
مغربی تہذیب کے خلاف مختلف ملکوں میں	
۶۷..... حضرت مولانا کی کوششیں.....	
۶۸..... سعودی عرب.....	
۷۶..... مصر و شام.....	
۸۱..... لبنان.....	
۸۲..... شرق اردن.....	
۸۳..... کویت.....	
	۲۱..... تہذیب کیا ہے؟.....
	۲۱..... یونانی و رومی تہذیب.....
	۲۳..... اسلامی تہذیب.....
	۲۶..... یورپ کا تاریک دور.....
	گیارہویں صدی عیسوی سے سبھی یورپ کی
	مسلمانوں سے کشمکش.....
	۲۸..... یورپ کا ارتقاء.....
	۲۸..... اسلام سے تضاد و اختلاف.....
	۳۱..... مسلمان علماء و مفکرین کا طرز فکر.....
	۳۳..... حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ.....
	۳۶..... مولانا کی نگاہ بصیرت.....
	۳۸..... مولانا کی نگاہ میں سب سے بڑا خطرہ.....
	۳۹..... تین موقف.....
	۴۱..... متوازن اور صحیح طرز فکر.....
	۴۲..... حضرت مولانا کی امتیازی خصوصیت.....

- ۱۱۳ حکام و سلاطین میں تبلیغ دین کا طریقہ کار.....
- ۱۵ سعودی عرب.....
- ۱۳۴ کویت.....
- ۱۳۷ شرق اردن.....
- ۱۴۲ لبنان.....
- ۱۴۲ مراکش.....
- ۱۴۴ یمن.....
- ۱۴۴ امارات.....
- ۱۴۶ ایران.....
- ۱۴۸ ترکی.....
- ۱۵۲ پاکستان.....
- ۱۵۷ تیونس.....
- ۸۳ عالم عربی کے زوال کے اسباب.....
- ۸۴ ”قومیت عربیہ“ کا فتنہ.....
- ۸۷ عربوں کے لیے جامع دعوت فکر.....
- ۸۹ مغربی تہذیب کے مراکز میں مولانا کا پیغام.....
- یورپ و امریکہ میں رہنے والے مسلمانوں کی ذمہ داریاں.....
- ۹۱ ترکی.....
- ۹۳ پاکستان.....
- ۹۵ متوازن فکر و دعوت.....
- ۹۸

باب دوم

حکام و امراء کی دینی و فکری رہنمائی

(۱۵۷-۱۰۴)

باب سوم

ادب اسلامی کی تشکیل

ایک تجدیدی کارنامہ (۱۵۸-۱۸۴)

- ۱۶۱ ادب میں لادینیت اور الحاد.....
- ۱۶۲ حضرت مولانا کی فکر و تشویش.....
- ادب پر اجارہ داری کے خلاف مولانا کی کوششیں.....
- ۱۶۴ ”رابطہ ادب اسلامی عالمی“ کی تشکیل.....
- ۱۷۱ تجدیدی کام.....
- ۱۷۲ معاصر عرب ادباء کا اعتراف و تحسین.....
- ۱۷۷ اردو زبان و ادب کے میدان میں.....
- ۱۸۱ معاصر ادباء و مصنفین کا خراج تحسین.....
- ۱۰۴ دعوت دین.....
- ۱۰۶ دین کو برسر اقتدار لانے کے دور راستے.....
- ۱۰۶ پہلا راستہ.....
- ۱۰۶ دوسرا راستہ.....
- ۱۰۷ سلاطین و امراء کی تربیت و ارشاد کے چند واقعات.....
- ۱۰۸ شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلام.....
- ۱۰۹ حضرت مجدد الف ثانی.....
- ۱۰۹ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی.....
- حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور ان کا اسلوب دعوت.....
- ۱۱۰ ذاتی زندگی کے اوصاف و کمالات.....
- ۱۱۱ چودھویں صدی کے عالم اسلام کا ایک اجمالی خاکہ.....
- ۱۱۲ وقت کی ضرورت.....

- ۲۲۸..... تحریک پیام انسانیت کی ضرورت
 ۲۳۱..... ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا
 ۲۳۳..... مولانا کی تقریروں کی خصوصیات
 تحریک کے سلسلہ میں بعض خدشات اور
 ۲۳۹..... مولانا کی رائے
 تحریک کی افادیت اور طریقہ کار میں وسعت
 ۲۴۱..... ملک کے وزرائے اعظم کے نام مکاتیب
 ۲۴۳..... مسز اندرا گاندھی
 ۲۴۴..... مسز راجیو گاندھی
 ۲۵۲..... مسز وی بی سنگھ
 ۲۵۳..... مسز چندر شیکھر
 ۲۵۵..... نرسمہا راؤ
 ۲۵۵..... مسز دیو گوڑا
 ۲۵۸.....

باب ششم

ملک و بیرون ملک درپیش دینی و ملی
 مسائل اور ان کے حل کی کوشش
 (۲۶۰-۳۱۳)

- ۲۶۱..... ملک کی آزادی سے پہلے
 ۲۶۲..... تقسیم کے بعد
 ۲۶۳..... ”نشان راہ“
 ۲۶۶..... فسادات اور ہندوستانی مسلمان
 ۲۶۸..... ”مسلم مجلس مشاورت“ کا قیام
 ۲۷۲..... آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

باب چہارم

تعلیم، عملی جدوجہد، طریقہ کار
 اور افکار و آثار (۱۸۵-۲۱۹)

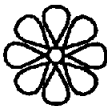
- تعلیم کے میدان میں حضرت مولانا کی خدمات ۱۸۵
 تدریس ۱۸۵
 نصاب تعلیم میں تبدیلیاں ۱۸۹
 تعلیم کے میدان میں حضرت مولانا کی ہمہ
 جہت کوششیں ۱۹۳
 دینی تعلیم ۱۹۴
 عصری تعلیم ۱۹۷
 دینی تعلیمی تحریک ۲۰۲
 عالمی سطح پر فکر و کوشش ۲۱۰
 مولانا کے نزدیک اسلام کی علمی تحریک کی
 خصوصیات ۲۱۱
 مولانا کے تعلیمی نظریات ۲۱۲
 مغربی نظام تعلیم اور مسلمانوں کی ذمہ داری ۲۱۳
 کرنے کا کام ۲۱۸

باب پنجم

پیام انسانیت اور ملکی اصلاحات
 کی فکر و کوشش (۲۲۰-۲۵۹)

- داعی کی اولین ضرورت ۲۲۰
 دل پر ایک چوٹ ۲۲۰
 مخلوط اجتماعات ۲۲۲

- ۳۱۹..... روشک و بدعت .. ”یونیفارم سول کوڈ“ کے خلاف مولانا کی سعی ..
- ۳۲۵..... رسالت ۲۷۵.....
- ۳۳۲..... ردقادیانیت ۲۷۷..... مولانا کی قیادت میں بورڈ کی عظیم کامیابی
- ۳۳۷..... روشیعت ۲۸۰..... بامری مسجد کا مسئلہ
- ۳۴۳..... عقیدہ کی اہمیت اور ایک اہم اصول ۲۸۵..... خلافت اسلامیہ کا سقوط
- ۳۴۵..... عقیدہ آخرت کمال اتاترک اور حضرت مولانا کی حقیقت رسی
- ۳۵۰..... اصلاح معاشرہ ۲۸۶.....
- ۳۵۱..... دعوت و اصلاح کا آغاز ۲۸۹..... مسئلہ فلسطین
- ۳۵۳..... علماء سے خطاب ۲۹۰..... حضرت مولانا کی فکر و سعی
- ۳۵۶..... طالبان علوم نبوت کی ذمہ داریاں ۲۹۳..... مسلمانوں کی تاریخ کا ایک سیاہ دن
- ۳۶۱..... اسلامی افواج کو خطاب ۲۹۳..... مولانا کی نظر میں شکست کے اسباب
- ۳۶۲..... خواص کی ذمہ داریاں ۲۹۸..... روشنی کی نئی کرن
- غیر اسلامی ماحول میں رہنے والے مسلمانوں کے
- ۳۶۳..... امراض کی نشاندہی اور علاج کی دعوت .. ۳۰۱..... عربوں کا بے باکانہ احتساب
- ۳۶۹..... خواتین سے خطاب قومیت و وطنیت کا فتنہ اور مولانا کی فکر و بصیرت
- ۳۷۳..... عمومی امراض کی نشاندہی اور ان کا علاج ۳۰۴.....
- ۳۷۴..... ہندوستان میں اصلاح معاشرہ کی تحریک ۳۰۵..... ”قومیت عربیہ“ پر سخت تنقید
- ۳۸۹..... صفائی قلب ۳۰۸..... صرف اسلامی وحدت کی دعوت
- ۳۸۱..... اخلاص و احتساب مشرقی پاکستان میں لسانی و تہذیبی جاہلیت کا
- ۳۸۲..... نیک صحبت کی ضرورت ۳۱۰..... فتنہ
- ۳۸۳..... اصلاح و استفادہ سے کوئی مستغنی نہیں ..



» باب ہفتم «

اصلاحیات

(۳۸۴-۳۱۴)

- ۳۱۴..... اصلاح عقائد ۳۱۴..... توحید

عرض مرتب

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على

سيد المرسلين محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو، بجا طور پر بیسویں صدی کی اسلامی شخصیت قرار دیا جاسکتا ہے، اس کی بنیادی وجہ مولانا کی وہ جامع اور متوازن فکر ہے جس نے پورے عالم اسلام پر اثر ڈالا ہے۔

موجودہ دور میں اگر اسلامی مکاتب فکر کا مطالعہ کیا جائے تو بنیادی طور پر تین مکاتب فکر ہمارے سامنے آتے ہیں، ایک مکتب فکر تو وہ ہے جس میں صرف اندرونی اصلاحات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور مسلمانوں کی پستی کا راز صرف اسی کو بتایا گیا ہے۔ دوسرے مکتب فکر میں مقابلہ کی پالیسی اختیار کی گئی ہے کہ حق تو صرف غالب ہونے ہی کے لیے ہے، اس کو غالب کرنا ہے، ذرائع اور وسائل کچھ بھی اختیار کیے جائیں۔ اس میں اس کی ضرورت کم سے کم محسوس کی جاتی ہے کہ حق کے غالب نہ ہونے کے اسباب پر بھی غور کیا جائے، اور ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ تیسرا مکتب فکر درمیانی ہے، جس میں اعتدال کی دعوت دی گئی ہے، ایک طرف اندرونی اصلاحات پر زور دیا گیا ہے اور دوسری طرف غلبہ حق کے لیے کوشاں رہنے کو ایک دینی ضرورت بتایا گیا ہے۔ یہ وہ معتدل اور متوازن مکتب فکر ہے جس کی دعوت حضرت مولانا نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں پوری طاقت کے ساتھ پیش کی ہے، اور اس کی عملی تدابیر اختیار فرمائی ہیں۔

حضرت مولانا کے نزدیک سب سے پہلی ضرورت اندرونی اصلاحات کی ہے، پھر دین کو اقتدار تک پہنچانے کی ضرورت ہے، اس کے لیے مولانا نے ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کرنے کے بجائے حکیمانہ راستہ اختیار کرنے کی دعوت دی ہے، مولانا کے نزدیک اس کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ اس طبقہ کو متاثر کیا جائے جس کے ہاتھ میں زمام اقتدار آنے والی ہو، یا وہ کسی بھی شعبہ زندگی میں بنیادی کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس طبقہ نے

اگر صحیح دینی تبلیغ قبول کر لی تو غلبہ دین کی کوششیں آسانی سے کامیابی حاصل کر لیں گی، اور اگر ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کی گئی تو اس میں صلاحیتوں کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ حضرت مولانا نے اس کے لیے جو عملی اقدامات کیے ہیں، ان کو کئی خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ حضرت مولانا کی سب سے پہلی کوشش یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ (Intellectual Class) کو متاثر کیا جائے۔ مولانا نے اس طبقہ کی نفسیات کو سمجھا ہے، اور اس کو ایسے اسلوب میں خطاب کیا ہے جس سے وہ مانوس ہو، مولانا کی اکثر تصنیفات اور خطاب اس طبقہ کے لیے خاص طور پر اثر انگیز ہیں، جن میں سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت مولانا کی معرکہ الآراء تصنیف "ماذا خسّر العالم بانحطاط المسلمين" (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر) کو ملی، اس کتاب نے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ پر زبردست اثر ڈالا ہے، طرز فکر کو بدلنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے، اور معتدد ملکوں میں اس کتاب کے بہترین مثبت نتائج سامنے آئے ہیں۔

مولانا نے اس سلسلہ میں متعدد یونیورسٹیوں کے اساتذہ، طلباء اور ذمہ داروں کو خطاب کیا ہے اور خاص طور پر نظام تعلیم کو صحیح رخ دینے کی کوشش کی ہے۔ رائج نظام تعلیم کی خرابیوں کو اجاگر کیا ہے اور اس کے خطرناک نتائج کی طرف توجہ دلائی ہے اور خاص طور پر اسلامی ملکوں میں نئے نظام تعلیم کو نافذ کرنے کی طاقتور دعوت پیش کی ہے۔

متعدد اسلامی ملکوں کے وزرائے تعلیم کے سامنے خطاب کا بھی مولانا کو موقع ملا، مولانا نے اس موقع پر دل نکال رکھ دیا اور زبانِ دل سے گفتگو کی۔ یونیورسٹیوں کے ذمہ داروں کو خطوط لکھ کر بھی ذہن سازی کی کوشش کی۔ مولانا کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے اس کو خاص اہمیت دی ہے اور ملک کی ترقی کے لیے اور اس کو صحیح رخ دینے کے لیے سب سے زیادہ اہم نظام تعلیم ہی کو قرار دیا ہے۔

مولانا کا دوسرا کام یہ ہے کہ انھوں نے حکمران طبقہ کو متاثر کیا اور اس کی ذہن سازی کی کوششیں کی ہیں، ملاقاتوں کے ذریعہ سے بھی، خطاب کے ذریعہ سے بھی اور خاص طور پر مراسلت کے ذریعہ سے، مختلف ملکوں میں اس کے بہترین نتائج مرتب ہوئے۔

حضرت مولانا نے تیسرا اہم کام یہ کیا کہ ادب کو اصلاح و تجدید کا ذریعہ بنایا، اس زمانے

میں ادب پر دین سے اور ملحدانہ افکار رکھنے والے ادباء و مفکرین کی چھاپ تھی، جس کے نتیجے میں نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ تیزی سے الحاد کی طرف جارہا تھا اور ادب کے راستہ سے دین بیزاری پیدا ہو رہی تھی۔ حضرت مولانا نے صاف صاف اس حقیقت کا اظہار کیا کہ اگر ادب کی لگام اسی طرح ملحدوں کے ہاتھ میں رہی تو نوجوانوں کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ مولانا نے عربی زبان و ادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، عربی ادب کی پوری تاریخ ان کے سامنے تھی، مولانا نے خود کمان سنبھالی اور عربی ادب کی تحریک کو ایک نیا رخ دیا۔ مولانا نے ایک طرف اس کی دعوت دی کہ ادب کی سرحدوں کو وسیع کیا جائے، دوسری طرف خود مولانا نے عربی زبان و ادب کے بہترین نمونے پیش کیے، اس طرح ادب پر ترقی پسند ادباء کی اجارہ داری ختم ہوئی اور عربی ادب کے افق پر جابجا اسلام پسند ادباء نظر آنے لگے، نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ جو اب تک تحریری ادب سے مانوس تھا اس کے سامنے تعمیری ادب کے بہترین نمونے آئے، وہ اس سے متاثر ہوا، اور اس کے ذہن و فکر میں تبدیلی پیدا ہوئی۔

ہر قوم کے عروج و زوال کی اپنی ایک تاریخ ہوتی ہے، قوموں کے مستقبل پر اس کا اثر پڑتا ہے، کوئی ترقی پذیر قوم اپنی تاریخ سے صرف نظر نہیں کر سکتی، اس میں اس کے لیے سیکڑوں ایسے مقامات آئے ہیں جن سے اس کو سبق حاصل ہوتا ہے اور آگے کے سفر میں سہولت ملتی ہے۔ مولانا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ کو اسی نظر سے کھنگالا ہے، اس کے نشیب و فراز کو پرکھا ہے، اور ملت کو اس میں سے قیمتی موتی نکال کر دیتے ہیں، کاروان ملت کے مسافروں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔

ملکی سطح پر حضرت مولانا کے اہم ترین کاموں میں سے ایک یہ ہے کہ انھوں نے ملک میں مسلمانوں کے تحفظ و بقاء کے لیے زمین ہموار کی ہے، ”پیام انسانیت“ کی تحریک چلا کر مولانا نے ملک کے لیے مسلمانوں کی افادیت ثابت کی ہے۔ اور کسی بھی قوم کے بقاء اور ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی نافعیت اور افادیت ثابت کرے، اس تحریک سے یہ اہم ترین ضرورت پوری ہوئی ہے، اور دوسرے دعوتی کاموں اور اصلاحی و فکری تحریکات کے لیے بھی زمین ہموار ہوئی ہے۔

پیش نظر کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ حضرت مولانا کی تصنیفات اور مکتوبات کی

روشنی میں مولانا کی دعوت اور فکر کے ان اہم گوشوں کو نمایاں کیا جائے تاکہ دعوتی اور فکری کام کرنے والوں کو اس سے رہنمائی مل سکے۔

حضرت مولانا کی وفات کے بعد سے اردو اور عربی میں دسیوں کتابیں مولانا کی سیرت و حیات اور نقوش و تاثرات پر لکھی گئیں، جن میں سب سے ممتاز کتاب حضرت مولانا کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کی ہے جو ”ایک عہد ساز شخصیت کے نام سے شائع ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی، اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سیرت و حیات کے ساتھ حضرت مولانا کی فکر کا جوہر آگیا ہے۔ راقم سطور نے حضرت مولانا کی وفات کے بعد ہی ”سوانح مفکر اسلام“ کے نام سے کتاب ترتیب دی تھی لیکن اس کی ضرورت باقی تھی کہ مولانا کی دعوت و فکر پر خود مولانا کی تحریروں اور تقریروں کو سامنے رکھ کر قدرے تفصیل سے گفتگو کی جائے۔ پیش نظر کتاب اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے مرتب کی گئی ہے۔

عم مخدوم و معظم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم اور عم مخدوم مولانا سید واضح رشید ندوی مدظلہم نے کتاب ملاحظہ فرمائی، اصلاحات بھی فرمائیں اور بعض اہم گوشوں کی طرف رہنمائی فرمائی۔ واقعہ یہ ہے کہ پوری کتاب ان ہی حضرات کی توجہ اور رہنمائی کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمروں میں برکت عطا فرمائے، اور ان کے فیوض عام فرمائے۔

راقم خاص طور پر محترم المقام جناب پروفیسر وحی احمد صدیقی صاحب کامنوں ہے کہ انھوں نے فاضلانہ مقدمہ لکھ کر کتاب کی قیمت بڑھائی، راقم کے لیے سعادت کی بات ہے کہ مشہور عالم و فقیہ مولانا قاضی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے بھی کتاب پر کلمات تحسین تحریر فرمائے، عزیز گرامی قدر مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی سلمہ کی کوششوں سے یہ کام ممکن ہو سکا، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

اخیر میں ان تمام معاونین کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے جنھوں نے کتاب کی تہیض یا پروف کی تصحیح اور اشاعت میں حصہ لیا اور محنت کی، ان میں عزیز ی مولوی محمد نفیس خان ندوی سلمہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو بہتر جزاء عطا کرے اور کتاب کو مقبول فرمائے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

بلال عبدالحی حسنی ندوی
دار عرفات

۱۶ رمضان المبارک ۱۴۲۷ھ

پیش لفظ

علامہ محمد تقی عثمانی
(دارالعلوم کراچی، پاکستان)

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى.

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمارے زمانے کی ان گنی چنی شخصیات میں سے تھے جنہوں نے خدمت دین کے بہت سے شعبوں میں اپنے ماتر طیبہ اور جگہ گاتی ہوئی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے کارناموں اور خدمات پر مختلف پہلوؤں سے کام کی ضرورت ہے، جو بجز اللہ ہو رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔

اسی سلسلہ میں حضرت ہی کے خانوادہ کے ایک چشم و چراغ جناب مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی زید مجدہم نے یہ کتاب تحریر فرمائی ہے جس میں حضرت کی دعوت و فکر کے اہم پہلو انہی کی تحریروں کی روشنی میں پیش کیے گئے ہیں، میں اپنی نااہلی اور مصروفیات کی بنا پر کتاب کا پورا مطالعہ کرنے سے تو محروم رہا، لیکن جتنے جتنے نظر ڈال سکا، اور جہاں نظر ڈالی مفید مضامین نظر آئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرما کر اسے قارئین کے لیے نافع بنائیں۔

آمین ثم آمین

نبیہ

محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ
۱۵ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ

مقدمہ

پروفیسر وصی احمد صدیقی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی مکمل سوانح حیات کئی لائق حضرات نے تصنیف کی ہے جس میں موجودہ کتاب کے مصنف جناب مولانا بلال عبدالحی حسنی بھی شامل ہیں، ان کتابوں میں حضرت مولانا کے زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے، ان کے خاندان کا ذکر، جس کا تقریباً ہر شخص علوم دین سے شناسا کی بلکہ مہارت رکھتا تھا اور خواتین بھی زبردست دینی اور علمی ذوق رکھتی تھیں، ان کی پرورش، برادر بزرگ کی شفقتیں، ان کے اساتذہ کرام، ان کا تعلیمی سفر، غرض ان کی نجی زندگی کو آئینہ کی طرح سامنے کیا گیا ہے جو بقول کارلائل اس بات کا مصداق ہے کہ ”عظیم وہ ہے جس کو اس کے گھر والے عظیم سمجھیں۔“

حضرت مولانا اقلیم روحانی کے بھی بادشاہ تھے، اپنی باطنی تربیت کے لیے انہوں نے کیا ریاضت کی؟ کن بزرگوں اور مرشدوں سے تعلق رکھا؟ اس کا بھی سیر حاصل بیان ملتا ہے، غرض کوئی گوشہ تشنہ نہیں، مگر اس کتاب میں ذہین اور لائق مصنف نے حضرت مولانا کے زندگی کے ان پہلوؤں کو لیا ہے جو ان کے دعوت و فکر کو اجاگر کرتی ہے، اس میں حضرت مولانا ایک مؤرخ، ایک محقق، ایک مفکر، ایک معلم اور ایک مبلغ کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، اس میں اضطراب اور خلش کا بیان ہے، مومن کے لیے اقدار حیات کا تعین ہے، اس کا ذکر ہے، ہر جگہ یہ بات ہویدا ہے کہ اسلام کامل اور مکمل طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے، اور ہمیں اسلام ہی سے جدید دلوں میں ایمان کی چنگاری روشن کرنی ہے کیونکہ اسلام کے ابدی حقائق ایسے ہیں کہ وہ ہر دور میں دنیا کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ حضرت مولانا نے علم کی جستجو کی جو مومن کا گمشدہ مال تھا اور اسے بازیاب کیا، انسانیت کے پودے کے برگ و بار پھر سے تازہ ہو گئے۔ مولانا بلال ان باتوں کی وضاحت

میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں، بیان ایسا دلچسپ اور بھرپور کہ وہ لوگ جنہوں نے حضرت مولانا کی کتابیں پڑھی ہیں، ان کے مشن سے واقف بلکہ شریک رہے ہیں، اور حضرت مولانا سے نیاز مندی کا تعلق رکھتے تھے، وہ بھی اسے آموختہ نہیں سمجھیں گے اور ہر بات ان کو نئی لگے گی، یہ تحریر کی لذت ہے۔

کتاب کی ابتدا زمانہ وسطیٰ میں مسلمانوں کی علم دوستی کے بیان سے ہے اور عیسائیوں کی علم دشمنی سے، اس زمانہ کی جو سلطنتیں تھیں اس کا اندروں چنگیز سے تاریک تر تھا، یونانیوں نے مذہب کو نظر انداز کر کے زندگی سے زیادہ سے زیادہ لطف اٹھانے کو مقصد حیات سمجھا تھا، یہی حال رومیوں اور ایرانیوں کا تھا، مذہب جو نام نہاد تھا اسے بھی انتظام اور سیاست سے الگ کر دیا تھا اور خواہشاتِ نفس کی پیروی ان کا عمل تھا، اور سب جنسی انارکی میں مبتلا تھے، کہیں بھی علمی نظریات، خیالات اور تصورات کی کارفرمائی نہ تھی، پھر عرب میں آفتابِ نبوت طلوع ہوا اور کلامِ پاک کا نزول ہوا جس کی پہلی آیت ”پڑھئے“ کی ہدایت کر رہی ہے۔ سرکارِ دو عالم اس وقت کے معاشرہ میں کیا تبدیلی لائے تھے وہ حضرت جعفر طیارؒ کی نجاشی کے دربار میں تقریر سے واضح ہے۔

عیسائیوں نے اپنے کلیسا سے ”پڑھئے“ جیسے گناہ کی اجازت مانگی تاکہ اسلامی علوم کو حاصل کر کے ان کا توڑ کیا جائے، پوپ نے صرف اسلام دشمنی میں اس کی اجازت دی۔ وہ زمانہ جو یورپ کا تاریک دور کہلاتا ہے اس وقت مسلمانوں کے علم و حرکت کا کارواں رواں دواں تھا، یہاں دین و دنیا میں تفریق نہ تھی بلکہ دنیا مزرعِ آخرت تھی، وحشی قوم تاتاری جنھوں نے دنیا کو زیر و زبر کر دیا تھا ایمان لے آئی تھی۔ وقت گزر گیا مسلمانوں کا انحطاط شروع ہوا اور یورپ آگے بڑھا، بیت المقدس عیسائیوں کے ہاتھ میں گیا، صلیبی جنگیں شروع ہوئیں، سلطان صلاح الدین ایوبی اپنی بے مثال فتوحات کے ساتھ سامنے آئے، ایک مرتبہ پھر بیت المقدس کی بازیافت ہوئی۔ تمام علم یورپ نے مسلمانوں سے سیکھے لیکن یونانیوں کو اپنا استاد کہا، پھر ایسا وقت آیا جب یورپ کی روشنی علم و ہنر نے مسلم ممالک، ان کے باشندوں، ان کے زعمیوں کی آنکھوں کو چکا چوند کیا اور سب نام نہاد جدیدیت کی طرف آئے۔ مصر کے وزیرِ تعلیم طہ حسین ہوئے جو مغرب سے بے حد مرعوب تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو سرسید نے مغربی نظامِ تعلیم کی طرف متوجہ کیا، اور اس کو عمل میں لائے۔ اکبر الہ آبادی کا طنز مذاق ہی

رہ گیا، کسی نے کان نہیں دھرا۔ سید جمال الدین افغانی گوانگریزوں کے خلاف تھے مگر ان کا محاذ سیاست تھا۔ حضرت مولانا نے علامہ اقبال کو جدید مشرق کا سب سے بالغ نظر مفکر قرار دیا مگر ان کے اثرات بھی محدود رہے۔ مولانا مودودی کے لیے فرمایا کہ انہوں نے اپنے مضامین سے جدید ذہنوں میں علم دین کی وقعت پیدا کی۔

حضرت مولانا نے خالص دینی ماحول میں پرورش پائی لیکن باہر کی دنیا کو دیکھا اور برتا اور یہ محسوس کیا کہ مغربی تہذیب کے پس پشت جو فلسفہ ہے وہ الحاد کی طرف لے جا رہا ہے، جہاد یہ ہے کہ جہالت کی بنیادی افکار سے علم و عقل کے میدانوں میں نبرد آزما کی جائے، انہوں نے نہ خالص منفی رویہ اختیار کیا کہ جدید کو رد کیا جائے، نہ خالص مثبت کہ مکمل قبول کیا جائے بلکہ وہ معتدل موقف اختیار کیا جو حضرت مولانا کا خاص امتیاز ہے، مولانا کی معرکہ لا ارا تصنیف ”ماذا خسّر العالم بانحطاط المسلمين“ میں مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب کا ذکر ہے، یورپ کی کوتاہ نظری پر تبصرہ کیا ہے اور مغربی مصنفین کی کتابوں سے ثابت کیا کہ یورپ کا موجودہ مذہب عیسائیت نہیں ہے، مادہ پرستی ہے، قوت اور اخلاق میں عدم توازن ہے، غلو اور انتہا پسندی ہے، خالق کائنات سے بغاوت ہے۔ حضرت مولانا نے مستشرقین کے منفی اثرات کا ازالہ اپنی تحریروں سے کیا اور علمائے اسلام کو اس کی طرف متوجہ کیا۔

مغربی تہذیب اور انداز فکر کے خلاف حضرت مولانا نے مسلم ممالک میں بھی بیداری پیدا کی، ”قومیت عربیہ“ کے نعرہ کو فتنہ کہا، یورپ اور امریکہ کے بے شمار ملکوں کا سفر کیا اور وہاں بے مسلمانوں کو اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا، پاکستان، مصر، شام، شرقِ اردن، ترکی تشریف لے گئے، یورپ کی خوبیوں اور خامیوں پر استادانہ شان سے انگلی رکھی، اس پورے باب کو مولانا بلال عبدالحی نے ایک چھوٹا سا مذہب اور اخلاق کا دائرۃ المعارف بنا دیا ہے۔

کتاب کا دوسرا باب دعوتِ دین سے تعلق رکھتا ہے اور فاضل مصنف نے بڑی خوبی سے حضرت مولانا کے اندازِ دعوت کو بیان کیا ہے۔ مولانا کا فرمانا تھا کہ داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کھلے دروازے سے داخل ہو، جو دروازے مقفل ہوں ابتدا ہی سے اس کا قفل کھولنے کی کوشش نہ کریں ”اے اہل کتاب جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہو اس کی طرف آؤ“۔ حضرت مولانا نے سوال کیا ہے کہ دین کو ان ہاتھوں تک پہنچایا جائے جن کے

پاس زمام اقتدار ہو یا دیندار لوگوں کو اقتدار تک پہنچایا جائے؟ پھر فرمایا کہ کرسی، اقتدار والوں کو مبارک۔ حضرت مولانا نے سلاطین اور امرا کی تربیت اور ارشاد کے چند واقعات لکھے ہیں، اور ان بزرگوں کا ذکر کیا ہے جو شریعت اور طریقت کے آسمان پر ستاروں کی طرح چمک رہے تھے جیسے حسن بصریؒ، شیخ عزالدینؒ، مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ وغیرہ۔

چودھویں صدی کے عالم اسلام کا ایک خاکہ کھینچا ہے، امیر سعود کو خط، امیر فیصل سے ملاقاتیں، ان کو مشورے اور نصیحتیں۔

مولانا بلال نے حضرت مولانا کا تقریباً پیغمبرانہ جملہ نقل کیا ہے کہ وہ اپنی دعوت کے لیے کسی اجرت کے طلب گار نہیں۔ امیر سعود کو خط سے اور امیر فیصل سے ملاقاتیں کر کے یہی نصیحت کی کہ ملک کی اصلاح کے لیے تعلیم پر پورا زور دیں، یہی ملک کی بقا اور اسلام کی بقا کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ لبنان، مراکش، ترکی، پاکستان ہر جگہ نظام اسلامی کے نفاذ کی تلقین کی۔ امام خمینی سے ملاقات رہی اور عشق کے دردمند نے اپنا پیام انھیں بھی دیا۔ ایران میں حضرت مولانا نے سوال کیا کہ جس ملک میں صرف بطل عظیم اور عبقری لوگ پیدا ہوتے تھے اب وہاں قضا الرجال کیوں ہے؟ وزیر تعلیم سے گفتگو کرتے ہوئے حضرت نے اقبال کا شعر پڑھا

نہ اٹھا پھر کوئی رومی غم کے لالہ زاروں سے

وہی آب و گل ایران وہی تبریز ہے ساقی

مصنف کتاب نے ان سب باتوں کو ریاضی کے اصولوں کی طرح نہیں بیان کیا ہے، ان کے لکھنے کا سلیقہ یہ ہے کہ لگتا ہے کہ حضرت مولانا پڑھنے والے سے خود یہ باتیں کر رہے ہیں، مختلف جگہوں کی تقریروں اور مختلف کتابوں اور خطوط کی تحریروں کو اس طرح مربوط کیا ہے کہ ان میں وحدت آگئی ہے۔ جوش اور جذبہ بین السطور میں ہے۔

تیسرے باب میں ایک تجدیدی کارنامہ کے عنوان سے زبان و ادب کی اہمیت پر بات کی ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانوں نے اور علوم کی طرح قرآن اور حدیث کے ساتھ ادب اور لغت پر بھی توجہ دی اور ادب میں مقصدیت پیدا کی، غیر مسلم ادباء کے کارناموں کو بھی تسلیم کیا مگر یہ دیکھا کہ اسلام پسندوں کی ادب پر پکڑ کم ہوتی گئی، اگرچہ ادب میں فحش گوئی اور بے حیائی کا عنصر شامل ہوتا گیا تاہم وہ لادینیت سے بچا رہا مگر ایک وقت آیا کہ بلاد عربیہ میں ایسے اہل قلم میدان میں آ گئے جن کے ذہنوں میں انتشار اور تحریروں میں تشکیکی رجحان پایا

جاتا تھا، مولانا اس کے خلاف کھڑے ہو گئے اور ایسا ادبی لٹریچر تیار کر دیا جو زبان اور چاشنی میں کسی طرح مصری ادباء کے لٹریچر سے کم نہیں، پہلی صدی سے مختلف اسلامی مصنفین میں ادب عالی کو ڈھونڈھ نکالا اور دکھایا کہ مسجد میں لگا ہوا گلاب اتنا ہی خوبصورت ہے جیسے کسی اور جگہ۔ رابطہ ادب اسلامی کی تشکیل کی اور معاصر عرب ادباء سے خراج تحسین پایا۔

”مختارات“ مولانا کا بہترین مجموعہ ہے جو ملک کے اندر اور باہر بڑے عربی اداروں اور یونیورسٹیوں میں عربی ادب کے نصاب میں داخل کیا گیا۔ حضرت مولانا کی اردو تحریروں پر رشید صاحب نے جو بات کہی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

”کتاب پڑھتا گیا اور رائے قائم کرتا گیا کہ یہ تقریر سب سے اچھی ہوگی، دوسری کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ پچھلی سے اونچی۔ اس طرح خوب سے خوبتر کی طرف سفر کرتا گیا، آپ کے لیے ذہن میں جو تحسین کا دفتر کھلا وہ فی الحال قابو میں نہیں آتا کہ لکھ کر آپ تک پہنچا دوں، کتنے محدود صفحات میں آپ نے بصائر و معارف کا کیسا گراں بہا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے۔“

پھر نقوش اقبال حضرت مولانا کی بہترین کتاب ہے، بڑے بڑے تنقید نگاروں نے داد دی، اسے پڑھ کر صاحب ”گل رعنا“ کی یاد آتی ہے۔

اب مولانا بلال تعلیم کے میدان میں حضرت مولانا کی خدمات کا ذکر لاتے ہیں، انھوں نے طلباء کے ذہنی سطح کو سامنے رکھتے ہوئے طریقے دریافت کرنے کے لیے کہا، تعلیمی لیاقت کو ابھارنے کی کوشش پر توجہ دینے کی ہدایت دی، مقصدیت کو سامنے رکھنا ضروری سمجھا۔ انھوں نے فرمایا کہ حدیث کے درس میں تقابلی فقہ پر زور نہیں صرف کرنا چاہیے اور اخلاقی اور معاشرتی معاملہ کو ابھارنا چاہیے، شاگردوں سے خاص تعلق پیدا کرنا چاہیے۔ حضرت مولانا نے بحیثیت استاد کے دس سال کام کیا، نصاب تعلیم میں تبدیلیاں لائے جس کی علامہ سید سلیمان ندویؒ نے بڑی قدر کی، مدرسوں کو سرکاری امداد سے بچنے کی تلقین کی، یہ پرواز میں کوتاہی والی بات رہی۔

حضرت مولانا کے ذہن میں ہمیشہ یہ خیال رہا کہ وہ ایسے ملک میں رہ رہے ہیں جہاں دوسرے مذاہب کے لوگ بھی رہتے ہیں اور ان کے اعتماد کو حاصل کرنا ہے اور بھائی چارہ کی فضا بنانا ہے۔ انھوں نے انسانیت کا پیغام دیا اور ملکی اصلاحات کی فکر اور کوشش کی، انھوں نے

مخلوط اجتماعات کو خطاب کیا اور اس کو باقاعدہ تحریکی شکل میں پیش کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ موجودہ دور میں عالم انسانی کی ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ اغراض، تعصبات، قوم پرستی اور سیاسی مقاصد سے بے تعلق ہو کر عام انسانوں کے سامنے وہی حقیقتیں رکھی جائیں جن پر انسانیت کی نجات اور سلامتی موقوف ہے۔ فرمایا کہ پیام انسانیت کی تحریک ملک کے تمام دینی، تعلیمی، علمی کوششوں کے لیے ایک حصار کی حیثیت رکھتی ہے، انسانیت کی شمع مسلسل طور پر روشن رکھنی چاہیے، اچھا انسان انسان سے مایوس نہیں ہوتا۔

حضرت مولانا نے اس نکتہ کی وضاحت کی کہ سارے انسان خدا کا کنبہ ہیں، یہ بات اس مذہب نے کہی ہے جس کو عقیدہ توحید پر ذرا سی آنچ گوارا نہیں۔ انہوں نے ملک کے وزرائے اعظم کے نام مکاتیب لکھے۔ مسز گاندھی سے امیر جنسی کے متعلق کہا کہ ”آزادی کی کسی تحریک، جدوجہد اور اس کے قائدین کی ناکامی کے لیے اس سے بُری بات نہیں ہو سکتی کہ لوگ اب برطانویوں کو یاد کرنے لگے ہیں۔“

حضرت مولانا کی اس تحریک نے بڑے اچھے اثرات چھوڑے، ان کے جانشین اس مشن کو قائم رکھے ہیں۔

اس کتاب کا ہر باب دینداری اور دانشوری سے مملو ہے لیکن آخری بات کو اولیت حاصل ہے کیونکہ اس کا تعلق اصلاحیات سے ہے۔ حضرت مولانا جس خاندان کے تھے وہاں توحید اور سنت اول و آخر، ظاہر و باطن رہا ہے، حضرت نے عقیدہ کی درنگی کو توحید سے وابستہ کیا اور اعتدال وغیرہ کو اسلام کی طاقت سے وابستہ نہیں کیا، اللہ پاک نے بالکل صاف بات کہہ دی کہ ”تم اپنے دین پر اور کافر اپنے دین پر۔“

مولانا نے انتہائی حقارت سے یہ بات کہی کہ شرک ایک مستقل دین اور ایک مکمل حکومت ہے، اس کا اور اللہ کے دین کا کسی ایک جسم یا دل یا نظریہ زمین پر ایک ساتھ قائم ہونا ناممکن ہے۔ پھر فرمایا کہ شرک اور کفر اگر مستقل دین ہیں تو بدعت مستقل شریعت ہے، اللہ نے اپنی نعمت ہم پر تمام کردی اور تکمیل نعمت کے یہ خلاف کہ دین و شریعت کا ایک بڑا حصہ مشتبہ اور متعین چھوڑ دیا جائے، جو بات عہد رسالت میں دین نہ تھی وہ آج بھی دین نہیں ہو سکتی۔ پھر فرمایا کہ رسالت کا عقیدہ، عقیدہ توحید کے بعد بنیادی حیثیت رکھتا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ حقیقت توحید تک رسائی، رسالت کے عقیدہ اور ایمان کے بغیر ممکن نہیں۔ حضرت مولانا نے

آٹھ پر مغز خطبات جامعہ مدینہ منورہ میں دیے تھے جو کتابی شکل میں آگئے، اور جن کا اردو ترجمہ ہوا ہے۔

قادیانیت کے سلسلہ میں حضرت رائے پوری کی فرمائش پر پورے قادیانی لٹریچر کا جائزہ لے کر کتاب تیار کر دی تھی۔ عقیدہ آخرت کے متعلق حضرت مولانا نے فرمایا کہ اس علم کا سرچشمہ وحی الہی ہے، جو حضرات انبیاء علیہم السلام کے واسطے سے لوگوں کے لیے مشعل راہ ہے، انسان کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا، موت اور عالم برزخ ایک درمیانی منزل ہے، موت ایک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر۔

حضرت مولانا نے اصلاح معاشرہ کی طرف بڑی توجہ دی، ان کا خیال تھا کہ اسلامی نظام کے قیام کے لیے اس کی حیثیت بنیاد کی ہے، معاشرہ شاخ نشین ہے، شاخ نہیں تو نشین کا وجود بھی ممکن نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے جس طرح ہر طبقہ کو مخاطب کیا تھا اسی طرح حضرت مولانا نے علماء سے بھی خطاب کیا ہے، طالبان علم نبوت کو ان کی ذمہ داریاں بتائیں اسلامی افواج کو خطاب کیا ہے، غیر اسلامی ماحول میں رہنے والے مسلمانوں کے امراض کی نشاندہی کی اور علاج کی دعوت دی۔

جناب مولانا بلال عبدالحی نے جو محنت اس کتاب کی تیاری میں کی ہے وہ بے حد قابل داد ہے، وہ کارنامے جو ایک بڑی مدت پر محیط تھے ان کے ذکر کو یکجا کرنا اور اس طرح کرنا کہ تسلسل میں فرق نہ آئے بڑے سلیقہ کا کام ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ وہ ایک بڑے لائق، بڑے ذہین اور بڑے انشا پرداز باپ کے بیٹے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ صندل کے عطر کی خوشبو صندل کی خوشبو سے بڑھ جاتی ہے، محمد میاں مرحوم کی روح اپنے بیٹے کے کارنامے پر بشاش ہوگی۔

ع داستانِ فصلِ گلِ خوش می سراید عندلیب

وصی احمد صدیقی

دارالعلوم، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

﴿باب اول﴾

مغربی تہذیب کا طوفان اور اس کا مقابلہ

اسلام کے عروج و زوال کا مطالعہ کرنے والا خوب واقف ہے کہ چھٹی صدی ہجری تک مسلمان ہی علمی تمدنی اور فوجی لحاظ سے دنیا کی دوسری قوموں سے بہتر تھے اور کوئی قوم ان کو شکست دینے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ اس وقت تک دین دنیا کی کوئی تفریق نہ تھی، دنیا برتنے کے لیے جن علوم کی ضرورت پڑ سکتی تھی مسلمانوں نے ان کو ترقی دی، اور بہت سے نئے علوم بھی وجود میں آئے، لیکن ان کو دین کی سرپرستی حاصل تھی، ان کی باگ ڈور اہل دین کے ہاتھوں میں تھی، اسلام کی بنیاد ہی علم پر پڑی تھی، سب سے پہلی وحی میں قلم کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ اسلام نے ہمیشہ علم دوستی کا ثبوت دیا اور زمانہ کو علم سے بھر دیا، صدیوں تک دنیا کی کوئی قوم مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکی۔

اسلام کے بعد عیسائیت سب سے بڑا مذہب تھا لیکن اس کی بنیاد ہی علم دشمنی پر تھی، علم حاصل کرنا، لکھنا پڑھنا ان کے یہاں بہت بڑا گناہ تھا، وہ صدیوں مسلمانوں سے نبرد آزما رہے، تاہم میدان مسلمانوں ہی کے ہاتھ رہا۔

آہستہ آہستہ صورت حال تبدیل ہونا شروع ہوئی، مسلمانوں نے علم سے بے توجہی برتنی شروع کی اور دوسری طرف عیسائی مفکرین نے یہ حقیقت سمجھ لی کہ علمی بالاتری کے بغیر وہ آگے نہیں بڑھ سکتے، کلیسا نے ابتدا میں اس کی پر زور مخالفت کی اور مذہب و تمدن کی کشمکش جاری رہی بالآخر کلیسا نے شکست کھائی اور اس کو زنگی کے میدان سے بالکل الگ کر دیا گیا۔ سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیروی

شاہ فرانس لوئس نہم (۱۲۷۰ء) جس کو مصر میں گرفتاری کے بعد تیونس پر حملہ میں ناکامی ہوئی اس نے مرتے وقت وصیت نامہ میں لکھا کہ ہم عرصہ دراز سے مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں، صلیبی جنگوں کا تسلسل زمانہ سے جاری ہے لیکن ہم غالب نہیں آسکے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حملہ کے وقت مسلمانوں میں ایسا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جس کا مقابلہ مشکل ہے۔ اس جذبہ کو روکنے کے لیے اب دوسرے وسائل اختیار کرنے چاہیے۔ اور اس کی صرف یہی تدبیر ہے کہ ہم ان کے ذہنوں کو متاثر کریں۔ (۱)

اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد ریمین لیل (Raman Lull) (۱۳۱۰-۱۲۳۲ء) اور روجر بیکن (Roger Bacon) (۱۲۹۴-۱۲۱۴ء) نے پوپ سے مل کر ان سے اسلامی علوم حاصل کرنے کی اجازت چاہی، پوپ کو اس میں تردد تھا۔ مگر جب اس کو یہ بتایا گیا کہ اس کا مقصد عیسائیت کی خدمت ہے اور اس کے ذریعہ مسلمانوں کے ذہنوں کو متاثر کرنے میں مدد ملے گی اور ان پر غلبہ حاصل کیا جاسکے گا تو پوپ نے بڑی رد و قدح کے بعد اس کی اجازت دے دی۔ اس سے قبل خفیہ طور پر یورپ کے لوگ اندلس میں تعلیم حاصل کرتے تھے، بعض اسلامی کتابوں کے ترجمے بھی ہوئے تھے۔ پوپ کی اجازت کے بعد یہ کام وسعت کے ساتھ شروع ہوا۔ (۲)

یورپ میں تعلیمی ادارے تیرہویں صدی عیسوی سے قائم ہونا شروع ہوئے۔ پندرہویں صدی میں پریس کی ایجاد اور قسطنطنیہ اور اندلس کے علمی سرمایہ کی منتقلی کے بعد علمی یہ وصیت نامہ پیرس میں آج بھی محفوظ ہے جس میں چار نکاتی پروگرام پیش کیا گیا ہے۔ ۱- مسلمان قائدین کے درمیان تفرقہ ڈالنا، اور پھر جہاں تک ممکن ہو ان ٹکڑوں کو بھی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں اس طرح بانٹ دینا کہ ان کی قوت بکھر جائے۔ ۲- اسلامی ملکوں میں حکومت کا نظام ابتر کرنا، اور اس کے لئے رشوت ستانی، فساد، اور بے حیائی کو اس طرح عام کر دینا کہ چول اپنی جگہ سے ہٹ جائے۔ ۳- کسی ایسی جماعت یا لشکر کو ہرگز منظم نہ ہونے دینا جو اسلامی پیغام پر ایمان راسخ رکھتا ہو اور اپنے ملک و وطن کے حق کو سمجھتا ہو، اور دین کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو۔ ۴- ایسے یورپین ایماں کو قیام جو جنوب میں غزہ سے لے کر شمال میں اٹلی تک چلا گیا ہو اور پھر مشرق میں اس کی سرحدیں اس قدر وسیع ہوں کہ وہ یورپ تک پہنچ جائے۔ (الغزوہ الفکر ص ۲۹-۳۰ تالیف ڈاکٹر اسماعیل علی محمد)

(۲) ۱۳۱۲ء میں روجر بیکن اور ریمین لیل کے مشورہ سے پوپ نے اسلامی علوم کی تعلیم کا حکم صادر کیا اور یورپ کے متعدد تعلیمی اداروں میں اسلامی علوم کی تعلیم شروع ہوئی۔

انقلاب آیا اور یورپ کی ترقی کا آغاز ہوا جس کے نتائج واضح شکل میں سولہویں اور سترہویں صدی میں ظاہر ہونے لگے، جس کے نتیجہ میں یورپ کو عالم اسلام پر برتری حاصل ہوئی۔ دنیا کے عروج و زوال کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جن قوموں نے ترقی کی ان کی فکر و تہذیب کی چھاپ دوسری مغلوب قوموں پر پڑی وہ قومیں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں، جب تک مسلمان ترقی یافتہ قوم سمجھے جاتے تھے اس وقت تک دنیا پر اسلامی ثقافت کا اثر قائم رہا اور جب یہ گیند عیسائیوں کے پالے میں چلی گئی اور اخیر دور میں یہودی ان کے حلیف بن گئے تو دنیا پر آج اسی تہذیب کا اثر دکھائی دیتا ہے۔

تہذیب کیا ہے؟

”تہذیب“ اور ”ثقافت“ یہ دونوں الفاظ عام طور پر ایک ساتھ بولے جاتے ہیں اور اکثر ان کو ہم معنی ہی سمجھا جاتا ہے لیکن محققین کی رائے میں ثقافت علمی نظریات، خیالات و تصورات کا نام ہے جب کہ ان نظریات کے عملی تجربات اور ترقیات کو تہذیب کہتے ہیں۔ ثقافت کی تشکیل معاصر فلسفوں، علمی نظریات اور ذہن کی تخلیقی صلاحیتوں سے ہوتی ہے۔ اسی کے تانے بانے سے ہو کر انسان جن مراحل سے گزرتا ہے اور جو تجربات اس کے سامنے آتے ہیں اس کو تہذیب سے تعبیر کرتے ہیں۔ عام طور سے اس کے چار عناصر ترکیبی بیان کیے جاتے ہیں: اقتصادی ذرائع، سیاسی نظم، اخلاقی اصول اور علوم و فنون کا استحکام۔ تہذیب کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب سے زمین پر انسان کو قرار و سکون حاصل ہوا، تہذیب کی کڑیاں مسلسل ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں اور ہر زمانے نے آئندہ آنے والوں کے لیے تہذیب کی تاریخ میں کچھ اضافہ کیا ہے۔

یونانی و رومی تہذیب

تہذیب و علم کی تاریخ میں یونان کا ذکر جلی حروف میں ملتا ہے، علم و فلسفہ، ادب و شاعری اور تہذیب و تمدن میں اس کو دنیا کی امامت کا درجہ ملا تھا، ساری دنیا پر اس کا سکہ بیٹھا ہوا تھا، لیکن اس یونانی تہذیب کی بنیاد ہی مادیت پر تھی۔ یورپ کے مورخین نے اس کو تسلیم کیا ہے اور ان کی دینی کمزوری، مذہبی اعمال و رسوم میں سنجیدگی کی کمی اور کھیلوں اور تفریحات کی

کثرت کا ذکر کیا ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس کی چار بنیادی خصوصیات بیان فرمائی ہیں :

۱- غیر محسوسات کی بے وقتی اور ان میں اشتباہ (یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی ذات کا تصور مختلف دیوتاؤں کی شکل کے بغیر نہ کر سکے)

۲- خشوع و خضوع اور روحانیت کی کمی۔

۳- دنیاوی زندگی کی پرستش اور دنیاوی فوائد و لذائذ کا اہتمام شدید۔

۴- حب وطن میں افراط و غلو۔

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

”اگر ہم ان کو ایک مفرد لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو اس کے لیے تنہا ”مادیت“ کا لفظ کافی ہے۔“ (۱)

یونانیوں کے اس طرز فکر نے ان کی معاشرت و اخلاق کو بگاڑ کر رکھ دیا، خواہشات نفس کی پیروی، زندگی سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوزی اور بوالہوسی کو روشن خیالی اور آزادی کی علامت سمجھا جانے لگا۔

یونانیوں کے بعد رومیوں نے ان کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا، ان کی تہذیب بھی یونانی تہذیب کا نیا ایڈیشن کہی جاسکتی ہے، چونکہ وہ عسکری قوت، وسعت مملکت میں یونانیوں سے آگے بڑھ گئے تھے اس لیے ان کے یہاں طاقت کا احترام عبادت اور تقدیس کے درجہ کو پہنچ گیا تھا۔

انہوں نے شروع ہی سے طے کر لیا تھا کہ دیوتاؤں کو سیاست اور حکومت سے دور رکھا جائے۔ چند ظاہری رسمیں پوری کر کے وہ آزاد تھے۔

”سرو (Cicero) بیان کرتا ہے کہ تھیٹر میں جب اس قسم کے اشعار پڑھے

جاتے تھے تو لوگ انہیں نہایت ذوق و شوق سے سنتے تھے کہ دیوتاؤں کو دنیوی

معاملات سے کوئی سروکار نہیں“ (۲)

(۱) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر صفحہ ۱۹۸۔

(۲) ایضاً صفحہ ۲۰۵ بحوالہ تاریخ اخلاق یورپ

حضرت مولانا اس رومی تہذیب کا انجام کار بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :
 ”جمہوری دور کے آخر میں روم میں اخلاقی انحطاط، حیوانی، ہوس رانی اور تعیش کا
 ایسا سیلاب آیا کہ رومی اس میں بالکل ڈوب گئے اور وہ اخلاقی نظام و ضوابط جو
 رومی قوم کی ابتدائی خصوصیت تھی خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے، اجتماع اور
 معاشرت کی عمارت میں ایسا زلزلہ آیا کہ قریب تھا کہ وہ زمین پر آ رہے۔“ (۱)

جہاں تک ایرانی تہذیب کا تعلق ہے تو شاید اس کو تہذیب کہنا بھی بد تہذیبی شمار کی
 جائے، اگرچہ ایران متمدن دنیا کی تولیت و انتظام میں روم کا شریک تھا لیکن اس کے پاس
 کوئی دین یا اخلاقی نظام نہیں تھا، عورت کا درجہ جانور سے بدتر تھا، تمام عورتوں کو سب کے لیے
 حلال کر دیا گیا تھا اور پانی آگ اور چارہ کی طرح اس کو سب کی مشترک ملک قرار دے دیا گیا
 تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا ایران جنسی انار کی اور شہوانی بحران میں ڈوب گیا، نہ باپ اپنے
 لڑکے کو پہچان سکتا تھا اور نہ لڑکا اپنے باپ کو، کسی کو اپنی ملکیت میں کوئی اختیار باقی نہیں رہ گیا
 تھا۔ وہ کھلے ہوئے آتش پرست اور مشرک تھے۔ شاہ پرستی کا یہ حال تھا کہ حکومت شاہی
 خاندان کی جاگیر سمجھی جاتی تھی، کوئی سن رسیدہ شخص وارث نہ ہوتا تو بچے کو ہی اپنا شہنشاہ تسلیم
 کر لیتے اور طرفہ یہ کہ ان تمام بد اخلاقیوں اور انسانیت سوز حرکتوں کے باوجود اپنی قوم کو دنیا
 کی افضل ترین قوم گردانتے تھے۔

حاصل یہ کہ تہذیب انسانیت کی گاڑی ایک ایسے ڈھلوان پر بڑگئی تھی کہ اس کے بچاؤ
 کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اور قریب تھا کہ وہ گہری کھائی میں گر کر پوری طرح تباہ و برباد
 ہو جائے کہ اچانک ”ختم نبوت“ کا آفتاب طلوع ہوا۔

اس وقت کے تمدن سے بہت دور عرب کے تپتے صحرا میں باد بہاری کا ایسا دلنواز جھونکا
 چلا کہ جس نے ساری دنیا کی کھیتی لہلہادی، تہذیب انسانیت کو نئی بنیادوں پر استوار کیا گیا،
 تہذیب کی شمعیں روشن کی گئیں اور دیکھتے دیکھتے دنیا میں اس نئی تہذیب کا غلغلہ بلند ہو گیا۔

اسلامی تہذیب

گزشتہ اوراق میں یہ بات گزر چکی ہے کہ تہذیب کی تشکیل چار چیزوں سے ہوتی ہے: اقتصادی ذرائع، سیاسی نظم، اخلاقی قواعد و ضوابط اور علوم و فنون کا استحکام۔ بعثت نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے بعد سب سے پہلے بگڑے ہوئے اخلاقی نظام کو سنوارا گیا، اس کے اصول و ضوابط متعین کیے، کمزوروں کو ان کا حق دیا گیا، صنف نازک کو اس کا درجہ ملا اور زندگی کی چول جو اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی اس کو بٹھایا گیا۔ نبی کریم ﷺ کے عم زاد بھائی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے نجاشی (شاہ حبشہ) کے دربار میں جو تقریر کی وہ انہیں اخلاقی بلند یوں کا مظہر تھی جو نبی کریم ﷺ نے انسانیت کو عطا فرمائیں تھیں۔

علوم و فنون کے استحکام و ترقی کی شاہ کلید تو قرآن مجید کی یہ پہلی آیت ہے جس سے وحی کا آغاز ہوتا ہے، سب سے پہلے اس میں پڑھنے ہی کا حکم دیا گیا ہے، اور قلم کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ حضور ﷺ نے تعلیم و تعلم کی بڑی اہمیت بیان فرمائی ہے۔ بدر کے قیدیوں کا یہی فدیہ متعین کیا گیا تھا کہ ان میں جو پڑھے لکھے ہوں وہ بچوں کو تعلیم دیں۔ آپ ﷺ نے بعض صحابہ کو عبرانی اور دوسری زبانیں سیکھنے کا بھی حکم فرمایا تھا۔ تمام مذاہب میں اسلام نے علم کی اہمیت جس طرح اجاگر کی ہے اور اس کو طاقت بہم پہنچائی ہے دنیا کا کوئی مذہب اس کا عشر عشر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ حضور ﷺ کے دور ہی سے علم کی ترقی کا سلسلہ شروع ہوا اور آپ ﷺ نے علم کے لیے جو بنیادیں فراہم کیں، بعد میں اس پر بڑے بڑے محلات اور فلک بوس عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے جس طرح دنیا کو علم سے بھر دیا اس کی نظیر کسی دوسرے مذہب یا مکتب فکر میں نہیں ملتی۔ اسلام کا یہ بھی امتیاز ہے کہ اس نے صحیح بنیادوں پر علم کو آگے بڑھایا اور اس کے ساتھ عظمت رب شامل کی۔ پہلی ہی وحی میں اقرار (پڑھنے) کے ساتھ باسم ربک (اپنے رب کے نام سے) کی شرط لگا دی گئی تاکہ انسان بے مہار نہ ہو اور علم کا استعمال بے جا نہ ہو سکے۔

جہاں تک سیاسی نظم و ضبط کا تعلق ہے تو یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہجرت مدینہ کے بعد جس اسلامی سلطنت کی بنیاد پڑی وہ ایسے مضبوط اصولوں اور ٹھوس بنیادوں پر قائم

ہوئی تھی کہ اس نے دنیا کی بڑی بڑی شہنشاہیوں کو جو اندر سے کھوکھلی ہو چکی تھیں اور ساری انسانی قدریں کھوکھلی تھیں صرف ہلا کر ہی نہیں بلکہ مٹا کر رکھ دیا اور پھر دو سو سال کے اندر اندر اس سلطنت میں ایسی وسعت ہوئی کہ خلیفہ وقت ہارون رشید نے بادل کے ایک ٹکڑے کو دیکھ کر کہا کہ ”امطری حیث شنت فسیاتینی خراجک“ جہاں چاہے جا کر برس تیرا محصول یہیں میرے پاس آئے گا۔

اسلامی سلطنت کی وسعت کے ساتھ ساتھ اسلام کا اقتصادی نظام بھی مضبوط ہوتا چلا گیا، جس کی اصل بنیاد اسلام کا وہ نظام زکوٰۃ و صدقات ہے جو اقتصادی نظام کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اتنی وسیع سلطنت میں جو تقریباً آدھی دنیا پر مشتمل تھی مفلوک الحال لوگ شاید ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملتے۔ امن و امان کا یہ حال ہوا کہ آپ ﷺ کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی ایک بڑھیا ایک شہر سے دوسرے شہر تک آرام سے جا سکتی تھی، اس کو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔

شروع ہی سے علوم دینیہ کے ساتھ دوسرے علوم جو انسانی زندگی کے لیے مفید اور ضروری تھے مسلمانوں کی توجہ کا مرکز رہے اور تدریجی طور پر ان علوم نے ارتقاء کے مراحل طے کیے۔ یونانی علوم کا بڑا حصہ عربی میں منتقل کیا گیا اور اس کے مضر اجزاء کو چھوڑ کر اس کے بقیہ حصوں سے فائدہ اٹھایا گیا۔ اس سلسلہ میں مسلمان علماء نے نہ کسی قسم کا تعصب برتا اور نہ ہی وہ غفلت کا شکار ہوئے، بلکہ پورے حزم و احتیاط کے ساتھ انہوں نے ان علوم سے فائدہ اٹھایا۔ علمی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں، ہسپتال بنائے گئے اور نئے نئے تجربات کیے گئے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ جدید سائنس کی بنیاد بھی مسلمانوں نے ہی رکھی اور بہت سے ایسے اصول بنائے جن کی بنیادوں پر سائنسی ترقیات ممکن ہو سکیں۔

لیکن یہ سب اسی وقت تک ہو سکا جب تک مسلمانوں نے اسلام کے اصولوں کو سامنے رکھا، دین اور دنیا میں تفریق نہیں کی اور علوم و فنون کی ترقی دین کے سایہ میں ہوتی رہی، پھر وہ وقت بھی آیا کہ دنیاوی علوم مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ دینی اصولوں میں بھی غفلت برتی جانے لگی اور آہستہ آہستہ دنیا پر مسلمانوں کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی پھر تاریخ نے پانسہ

پلٹا اور اسلامی طاقت منتشر ہو کر رہ گئی۔

یورپ کا تاریک دور

پانچویں صدی عیسوی سے لے کر دسویں صدی عیسوی تک کا زمانہ یورپ کا تاریک ترین دور (Dark Ages) کہلاتا ہے۔ آپس کی خانہ جنگیاں، بربریت، مظالم اور جہالت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، دوا علاج کا استعمال بھی ان کے یہاں جرم تھا اس لیے کہ ان کے دینی پیشوایان کو ڈر تھا کہ کہیں ان کی اجارہ داری پر ضرب نہ آجائے۔

رابرٹ بریفالٹ (Roberot Briffault) لکھتا ہے :

”پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور یہ تاریکی تدریجاً زیادہ گہری اور بھیا تک ہوتی جا رہی تھی..... اٹلی اور فرانس جیسے شہروں میں طوائف الملوکی اور ویرانی کا دور دورہ تھا۔“ (۱)

چھٹی صدی سے لے کر گیارہویں صدی تک کا یہی وہ دور تھا جس میں اسلامی تہذیب و تمدن اپنے عروج پر تھا اور دنیا کے کونے کونے میں اس کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی تھی، قدرتی طور پر یورپ میں بھی اس کے اثرات پڑنے لگے جس کی آخری مثال یہ ہے کہ وہاں باقاعدہ تحریک چل پڑی کہ تصویرگری اور بت تراشی ایک خلاف مذہب فعل ہے اور ان میں کوئی تقدیس نہیں۔ شاہان رومانے اس تحریک کی پشت پناہی کی، مسیحی اور بت پرست یورپ اور رومی و یونانی تمدن میں تصویروں اور بتوں کے خلاف یہ انکار و جہاد یقیناً اسلام کی بت شکنی اور اعلان توحید کی صدائے بازگشت تھی۔

گیارہویں صدی عیسوی سے مسیحی یورپ کی مسلمانوں سے کشمکش

مسلمانوں کا زوال شروع ہوا اور ادھر یورپ اپنی طویل نیند سے بیدار ہوا، اس نے علم کے میدان میں ترقی شروع کی، اور آہستہ آہستہ پانچ صدیاں بھی نہیں گزری تھیں کہ دنیا کے افق پر اس کا ستارہ چمکنے لگا۔

صلیبی جنگوں کا جب آغاز ہوا تھا تو مسیحی یورپ کو شکستوں کا منہ دیکھنا پڑا تھا (۲) لیکن جلد ہی انہوں نے اپنی قوت مجتمع کر کے شام و فلسطین کا رخ کیا اور بڑی فتوحات حاصل کیں یہاں تک کہ بیت المقدس ان کے قبضے میں چلا گیا۔ یہ مسلمانوں کی بہت بڑی شکست تھی جس سے ان کو دوچار ہونا پڑا، صلیبیوں کی ایسی دھاک بیٹھ گئی کہ وہ حجاز مقدس پر حملہ کرنے کے خواب دیکھنے لگے، مگر اسی عرصہ میں عالم اسلام کے افق سے ایک نیا ستارہ طلوع ہوا، عماد الدین زنگی اور ان کے فرزند نور الدین زنگی کی قیادت میں مسلمانوں نے پے در پے صلیبیوں کو شکست دی، بالآخر سلطان صلاح الدین ایوبی نے دوبارہ بیت المقدس کو آزاد کرایا اور فلسطین کا پورا علاقہ صلیبیوں سے پاک ہو گیا۔

اس نئی طاقت کے مقابلہ کے لیے سارا یورپ متحد ہو گیا اور اس نے ایک ہو کر شام پر حملہ کیا، سلطان کی فوجیں مردانہ وار مقابلہ کرتی رہیں، آخر پانچ برس کی خونریز جنگوں کے بعد دونوں فریق صلح پر رضامند ہو گئے لیکن پلڑا مسلمانوں ہی کا بھاری رہا، پورا فلسطین ان کے قبضہ میں رہا، صرف ایک چھوٹی سی ریاست عیسائیوں کے پاس تھی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کی وفات کے بعد پھر مسلمانوں کی طاقت منتشر ہونا شروع ہوئی، قومیں مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں، تاتاریوں نے بڑے بڑے متمدن اسلامی شہروں کو تاراج کیا تاہم مصر میں ان کو الملک المظفر سیف الدین قطز کے ہاتھوں شکست کھانی پڑی۔ ان کے بعد الملک الظاہر بھرس نے ان کو آخری شکست دی اور شام سے بے دخل کر دیا۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ تاتاری قوم مسلمان ہو گئی۔ ان جدید الاسلام تاتاریوں میں عالم اسلام کی قیادت کی صلاحیت نہیں تھی مگر اللہ کو ابھی مسلمانوں سے کام لینا منظور تھا، آٹھویں صدی ہجری میں عثمانی ترک سامنے آئے اور پندرہویں صدی عیسوی میں محمد الفاتح نے قسطنطنیہ فتح کر کے

(۲) یورپ کو صلیبی جنگوں میں نقصانات تو اٹھانے پڑے لیکن ان کا شعور بیدار ہوا اور انہوں نے مسلمانوں کے تمدن سے فائدہ اٹھایا، رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے :

”یورپ کی ترقی کا کوئی شعبہ اور کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں اسلامی تمدن کا دخل نہ ہو اور اس کی ایسی نمایاں یادگاریں نہ ہو جنہوں نے زندگی پر بڑا اثر ڈالا ہے۔“ (ماخوذ از عروج و زوال کا اثر صفحہ ۵۴)

شیخ محمد المبارک نے لکھا ہے کہ مغربی تہذیب کا ایک تہائی حصہ خالص اسلامی تہذیب سے ماخوذ ہے۔ (الفکر الاسلامی)

یورپ پر مسلمانوں کی دھاک بٹھادی، اس طرح تین سو سال تک عثمانیوں نے پورے کر وفر کے ساتھ عالم اسلام پر حکومت کی۔

دولت عثمانیہ کے معاصر مشرق میں دو بڑی سلطنتیں قائم تھیں، ایک ہندوستان کی مغلیہ سلطنت، دوسرے ایران کی صفوی سلطنت۔ لیکن دونوں اپنے مسائل و معاملات میں ایسی الجھی رہیں کہ باہر کی دنیا سے ان کو کوئی سرکار نہ تھا۔

یورپ کا ارتقاء

سولھویں صدی اور سترھویں صدی سے ترک بھی جمود کا شکار ہونے لگے اور ان میں تنزل اور انحطاط شروع ہو گیا۔ یورپ کا یہی زمانہ ارتقاء کا ہے، وہ پورے جوش کے ساتھ آگے بڑھنے میں لگ گیا، سائنسی میدان میں انہوں نے طرح طرح کے انکشافات شروع کیے اور اسی زمانہ میں ان کے یہاں بڑے بڑے محقق، موجد، اور مجتہد فن پیدا ہوئے، فنون حربیہ میں بھی وہ بہت آگے بڑھ گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۷۷۴ء میں اس کی فوجوں نے عثمانی افواج کو شرمناک شکست دی۔ اس سے سبق لیتے ہوئے عثمانی حکومت نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن وقت بہت گزر چکا تھا اور مریض جاں بلب ہو رہا تھا، طاقت کی چند گولیاں دے کر اس کو کچھ دیر کے لیے سنبھالا تو دیا جاسکتا تھا مگر اس لب گور مریض کی جان بچانا بہت مشکل کام تھا۔ دوسری طرف یورپ طاقت و نشاط سے بھر پور عزم و حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا، دیکھتے دیکھتے وہ عالمگیر طاقت و اقتدار اور فنی اور تہذیبی قیادت کا مالک بن گیا اور دنیا کا کوئی ملک اس کے اثر و نفوذ سے باہر نہ رہ سکا۔

اسلام سے تضاد و اختلاف

یورپ نے اپنے علمی سفر کا آغاز اگرچہ مسلمانوں کی انگلی پکڑ کر کیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ مسلمان ہی ان کے معلم اول ہیں لیکن اسلام دشمنی کے نتیجہ میں یورپ نے یونان کو اپنا اصل معلم قرار دیا اور یونانی تہذیب و تمدن کو بے کم و کاست اپنے اندر سمولیا جس کی وجہ سے مادیت اس کی سرشت میں داخل ہو گئی۔

یورپ کی مادہ پرستانہ ذہنیت کا پوری دنیا پر اثر پڑا، وہ اپنی طبعی تحقیقات اور علمی صنعتی اکتشافات و اختراعات میں انتہائی بلندیوں کو چھو رہا تھا تو دوسری طرف دین و اخلاق میں آخری درجہ کے تنزل و انحطاط کا شکار ہو رہا تھا۔ ایک طرف وہ صنعتی کمالات و عجائبات، طبعی قوتوں کی تسخیر میں انسان سے پرے کوئی مخلوق معلوم ہوتی ہے، تو دوسری طرف اخلاق و اعمال، حرص و طمع، سنگ دلی و بے دردی میں اس کی سطح جانوروں سے بھی کم تر نظر آتی ہے۔ دولت و قوت کے حصول کے لیے زندگی کے تمام اصولوں کو پیروں تلے روند ڈالنا ان کے لیے آسان ہو گیا، تمدن و اخلاق کے صحیح اصول و مبادی کا سرشتہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، ملحدانہ فلسفہ نے ان کے ذوق کو فاسد کر دیا اور طبعیتوں میں انحراف پیدا کر دیا۔

جاہلیت مسلح ہو کر نئے قالب میں سامنے آ رہی تھی جس کے جلو میں دنیا کی آرائش و زیبائش کا پورا سامان موجود تھا۔ یہ ایک ایسا انقلاب تھا کہ اس کا سب سے بڑا نشانہ مسلمان بنے، اس لیے وہی اس کی راہ میں رکاوٹ ڈال سکتے تھے، جاہلیت کا تضاد و اختلاف اسلامی نظام زندگی ہی سے تھا، بقیہ مذاہب و افکار سے اس تہذیب جدید کا کوئی بڑا ٹکراؤ نہیں تھا۔ اسلام سے مغربی تہذیب کی کشمکش کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تنہا اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو مخصوص عقائد و اقدار رکھتا ہے اور اس سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ جب کہ دوسرے مذاہب میں کوئی ایسا ٹھوس نظام نہیں ہے، وہ ہر فلسفہ کو قبول کرنے کو تیار ہیں۔ بقول حضرت مولاناؒ کے :

”اصل مسئلہ ہمارے مسلم معاشرہ کو پیش آیا، وہاں تو حید کا ایک مفہوم ہے، اس کے حدود معین ہیں کہ یہاں تک ایمان ہے، اس کے بعد کفر کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔“ (۱) ”اس کو اصرار ہے کہ نور و ایمان کے حدود متعین ہیں، اس کو اصرار ہے کہ اسلام ایک تمدن بھی رکھتا ہے، خالی عقائد کا نام نہیں، جب مغربی تہذیب اپنے پورے تصورات کے ساتھ، پورے اقدار حیات کے ساتھ، پورے مقاصد کے ساتھ آئی تو اس کا اس سے ٹکراؤ لازمی تھا، ٹکراؤ ہوا اور خوب ہوا۔“ (۲)

چونکہ یہ تہذیب اپنے جلو میں ترقیات و اکتشافات کا ایک بحر بیکراں رکھتی تھی، اس لیے اس تہذیب کے اثرات بالعموم عالم اسلامی پر اور بالخصوص عالم عربی پر بڑے گہرے پڑ رہے تھے، نوجوان کے سروں میں اسی کا سودا ساتا جا رہا تھا، اور یہ تہذیب اپنی تمام فحشیوں، بد اخلاقیوں، سرمستیوں اور انسان سوز حرکتوں کے ساتھ ان ملکوں میں جگہ بناتی جا رہی تھی، حکومتیں اس کے سامنے جھکنے لگی تھیں، انگریزی استعمار نے اکثر ملکوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا، دنیا کا کوئی بھی خطہ اس تہذیب و فکر سے آزاد نہ رہ سکا تھا، مصر جس کو یورپ کبھی فتح نہ کر سکا یورپ سے علمی اور ثقافتی میدان میں مرعوب ہو گیا، اور اس نے نوجوانوں کی منتخب جماعت کو استفادہ کے لیے یورپ بھیجا، جس نے واپس آ کر مغربی تہذیب و تمدن کے اختیار کرنے کی تلقین کی، مصری وزیر تعلیم طہ حسین جو مغرب ہی کے پروردہ تھے بڑے فخر سے لکھتے ہیں۔

”ہم عہد حاضر میں یورپ سے ایسا قرب اور رابطہ چاہتے ہیں جو روز بروز بڑھتا رہے یہاں تک کہ ہم لفظ اور معنی، حقیقت اور شکل ہر اعتبار سے اس کا ایک حصہ بن جائیں۔“ (۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں :

”ہمیں اہل یورپ کے طریقہ پر چلنا چاہیے اور ان کی سیرت و عادات اختیار کرنا چاہیے تاکہ ہم ان کے برابر ہو سکیں اور تہذیب کے خیر و شر، تلخ و شیریں، پسندیدہ و ناپسندیدہ ہر چیز میں ان کے رفیق کار اور شریک حال ہو سکیں۔“ (۲)

تہذیب مغرب سے مرعوبیت کی یہ انتہا ہے کہ ایک مسلمان مفکر و ادیب اور مسلمان ملک کا وزیر تعلیم تقلید و نقالی اور مغرب میں فنا اور تحلیل ہو جانے کی بے باکانہ دعوت دے رہا ہے۔ اس سے عمومی طور پر پست و ذنی سطح کا پتہ چلتا ہے جس کی بنیادی وجہ یورپ سے مرعوبیت اور پوری طرح اس کے خد و خال سے ناواقفیت تھی، اس وقت اس تہذیب کے برے پہلو اور اس کی خرابیاں برسر عام نہیں ہوئی تھیں اور زیادہ تر اس کے محاسن ہی لوگوں کے سامنے آرہے تھے۔

(۱) مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش صفحہ ۱۵۲

(۲) ایضاً صفحہ ۱۵۶

اسلام کے لیے یہ ایک بہت بڑا فتنہ تھا جس نے پوری شد و مد کے ساتھ سراٹھایا اور دیکھتے دیکھتے عالم اسلام کو اپنے ٹکڑے میں جکڑ لیا۔

مسلمان علماء و مفکرین کا طرز فکر

اس نئی تہذیب کے بارے میں مسلمان علماء و مفکرین کے ابتداء میں ہمیں دو طبقے نظر آتے ہیں: ایک طبقہ وہ ہے جو اس تہذیب سے پوری طرح متاثر ہو گیا اور مسلمانوں کی ترقی کو اس نے اسی تہذیب کے ساتھ مربوط سمجھ لیا اور کھلے عام اس کو اختیار کرنے کی دعوت دی، وہ اس تہذیب کے مضر اثرات کو جو مسلمانوں پر پڑ رہے تھے محسوس نہ کر سکا اور اس نے مسلمانوں کی ترقی کا راز اسی میں سمجھا کہ وہ بھی نئی مہذب قوموں کی طرح اسی تہذیب میں ڈھل جائیں تاکہ دنیا میں ان کو احترام کی نظر سے دیکھا جاسکے۔

اس طبقہ کے سرخیل ہندوستان میں سرسید احمد خاں تھے جنہوں نے مغربی نظام تعلیم کو پوری طرح اختیار کر لیا اور بغیر کسی کانٹ چھانٹ کے مغربی تمدن کو اختیار کرنے کی ضرورت سمجھی، اس کے کمزور پہلو ان کی نگاہوں سے اوجھل رہے، اس میں ان سے اتنا غلو ہوا کہ وہ عقیدہ اور قرآن مجید کی تفسیر بھی اسی بنیاد پر کرنے لگے۔

مصر کے مفتی محمد عبدہ بھی تجدید کی اس دعوت میں سرسید احمد خاں کے قریب ہی نظر آتے ہیں، ان کی تفسیر اور فتاویٰ میں بھی ایسی تشریح و تاویل نظر آتی ہے جس سے تمدن جدید کے مطالبات کی زیادہ سے زیادہ تکمیل ہو سکے، تاہم انہوں نے جدید نسل کو دین سے مانوس کرنے اور نظام تعلیم کی اصلاح کے سلسلہ میں بھی مفید خدمت انجام دی۔

سرسید کے اس طرز فکر کے خلاف سب سے پہلے مشہور شاعر اکبر الہ آبادی نے آواز اٹھائی اور اپنے مشہور مزاحیہ انداز میں مغربی نظام اور فکر پر تنقید کی۔ سرسید کے خلوص کے پورے اعتراف کے ساتھ انہوں نے ان کی تقلید مغرب کی پر جوش دعوت اور کالج کی مغربی زندگی اور فضا پر صاف صاف تنقید کی، اور اس کی کمزوریوں اور خامیوں کو نمایاں کیا۔ نوجوانوں نے ان کے کلام کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کے خاطر خواہ اثرات مرتب ہوئے لیکن وہ تقلید مغرب کے اس تیز دھارے کو روک نہیں سکا۔ حضرت مولانا کی رائے میں اس کی وجہ یہ تھی کہ

جس ادب اور اصلاح کی بنیاد طنز و تعریض پر ہوتی ہے اس کی عمر اور اس کے اثرات محدود ہوتے ہیں اور وہ کوئی تعمیری انقلاب پیدا نہیں کر سکتا۔

یورپ کے خلاف آواز لگانے والوں میں سید جمال الدین افغانی کا نام بھی نمایاں ہے لیکن ان کی کوششیں زیادہ تر مغربی سامراج کو ختم کرنے، خاص طور پر مشرقی ممالک سے برطانیہ کا اقتدار ختم کرنے میں محدود رہیں، اور ان کی سرگرمیوں پر زیادہ تر سیاسی رنگ ہی غالب رہا۔

برصغیر میں اس سلسلہ میں سب سے نمایاں نام ڈاکٹر محمد اقبالؒ کا ہے جن کو حضرت مولانا نے جدید مشرق کا سب سے زیادہ بالغ نظر مفکر قرار دیا ہے۔ انہوں نے یورپ کے قلب و جگر میں رہ کر اس کے محاسن و معایب کا مطالعہ کیا، اپنی نگاہوں سے اس کے خیر اور شر کو دیکھا اور پرکھا، مغربی تہذیب کے عناصر ترکیبی اور کمزور پہلوؤں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور فساد کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔ پھر اپنے اشعار میں اس کے اجزاء کو بکھیر کر رکھ دیا اور اس کا ایسا تجزیہ کیا کہ لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں، لیکن ان کی یہ صدائے بازگشت برصغیر تک محدود رہی اور پھر شعر کی زبان کے بھی کچھ حدود ہوتے ہیں، نتیجہ ظاہر تھا کہ ممالک عربیہ خاص طور پر اور ممالک اسلامیہ عام طور پر اب بھی مغربی تہذیب کے طلسم میں جکڑے ہوئے تھے اور یہ ضرورت اسی طرح باقی تھی کہ کوئی اس طلسم کو پاش پاش کر سکے اور مسلمانوں کو عالمی سطح پر ان کی زبان اور نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے، حقائق سے آشنا کرائے اور ان کو ان کا کھویا ہوا مقام واپس دلانے کی کوشش کرے۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں مشہور مفکر و مصنف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنے فاضلانہ مضامین کے ذریعہ یہ کام شروع کیا، یہ مضامین ان کے مؤثر رسالہ ”ترجمان القرآن“ میں شائع ہونا شروع ہوئے، ان میں مولانا مودودی نے مدافعانہ لہجے کے بجائے اقدامی پوزیشن اختیار کی، اسلامی شریعت و قوانین کے ان مسائل پر بڑے مدلل مضامین لکھے جو تجدید پسندوں کا نشانہ بنے ہوئے تھے، ان کے مضامین و رسائل سے جدید تعلیم یافتہ اور ذہین طبقہ کے دلوں میں دین کی وقعت پیدا ہوئی اور اسلام پر اعتماد بحال ہوا۔ یہ مضامین اور رسائل

عربی میں بھی منتقل کیے گئے اور یہ کام سب سے بہتر طریقہ پر مولانا مسعود عالم ندویؒ (۱) نے انجام دیا، عالم عربی میں یہ رسائل اور کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔

کاش کہ یہ سلسلہ اسی انداز سے جاری رہتا لیکن افسوس ہے کہ مولانا کے قلم کا رخ ایسے موضوع کی طرف ہو گیا جس کے نتیجے میں ان کو علماء اہل حق کی تنقید شدید کا نشانہ بننا پڑا، اپنی مشہور کتاب ”قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں“ میں انہوں نے ثابت کیا کہ ان اصطلاحات کا صحیح مفہوم زمانہ اول کے لوگوں نے سمجھا تھا بعد میں رفتہ رفتہ ان کے اصل مفہیم بدلتے چلے گئے اور آج جو ان کی تشریح کی جاتی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو زمانہ اول میں کی جاتی تھی، یہ قرآن کی وہ بنیادی اصطلاحیں ہیں جن پر اسلام کا محور گردش کرتا ہے، ان کے بارے میں یہ تصور کہ صدیوں کی صدیاں گزر گئیں اور اس کا صحیح مفہوم جاننا نہ جاسکا بڑے خطرہ کی بات تھی اور رسول اللہ ﷺ کی اس پیش گوئی کے بظاہر خلاف جس میں آپ ﷺ نے صاف صاف فرمایا :

”يَحْمِلُونَ هَذَا الدِّينَ مِنْ كُلِّ خَلْفٍ عَدُوٌّ لَهُ يَنْفُونَ عَنْهُ تَحْرِيفَ الْغَالِيينَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِينَ وَتَاوِيلَ الْجَاهِلِينَ“ (۲)

ہر نسل کے ثقہ لوگ اس دین کے حامل ہوں گے جو اس دین میں غلو کرنے والوں کی تحریفات، اہل باطل کی تلبیسات اور جالوں کی تاویلات کا پردہ چاک کر دیں گے۔“

پھر مولانا مودودی نے خود ان اصطلاحات کا جو اسلامی تصور پیش کیا ہے اس میں سیاسی رنگ غالب ہے اور دعوت اسلامی کا مقصد ہی اس میں ”حکومت الہیہ“ کے قیام کو قرار دیا ہے، اور پھر عبادت و ذکر کے بارے میں انہوں نے جن خیالات اور نئی تحقیقات کا اظہار کیا ہے اس سے یہ اندیشہ ہونے لگا کہ جو نسل صرف اسی فکر و مطالعہ میں پروان چڑھے گی وہ اس مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو سکے گی جو صحبت و تربیت نبوی ﷺ کا پیدا کردہ ہے اور علی سبیل التوارث امت میں منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ برصغیر کے علماء نے خاص طور پر اس کو محسوس کیا اور یہ ضرورت سمجھی کہ اس فکر کے خلاف آواز اٹھائی جائے، وہی علماء جو شروع میں ان کی تصنیفات

(۱) حضرت مولانا کے رفیق، دارالعلوم ہندوستان کے علماء کے عربی رسالہ ”الفضیاء“ کے کامیاب مدیر اور نامور انشاء پرداز

(۲) مشکوٰۃ المصابیح ۱-۳۶، بحوالہ المدخل المجتبى

کے مطالعہ کا مشورہ دیتے تھے انہوں نے ضروری سمجھا کہ خالی الذہن اور غیر پختہ شعور رکھنے والے لوگوں کو ایسی کتابوں کے مطالعہ سے باز رکھنا ہی مناسب ہے جن میں فائدہ کے ساتھ ایک بڑا نقصان بھی مضمر ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

تہذیب حاضر کے بڑے وسیع اور عمیق مطالعہ کے بعد اسی وسعت و گہرائی کے ساتھ اس پر تنقید کرنے والوں میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہ کا نام نامی سر فہرست ہے۔ حضرت مولانا نے ایسے ماحول میں تربیت پائی جو خالص علمی و دینی ہونے کے ساتھ باہر کی دنیا سے بھی باخبر تھا۔ برادر بزرگ مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ نے ندوہ اور دیوبند کے بعد ایم، بی، بی، ایس کی تعلیم مکمل کی تھی اور براہ راست انگریزوں سے پڑھا تھا، ان کی تہذیب و معاشرت ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں کے سامنے سے گزری تھی اور اس کی اچھائیاں برائیاں انہوں نے پچشم خود ملاحظہ کیں تھیں۔ وہ اس طرح اس کے درمیان سے اپنا دامن بچا کر نکل آئے تھے کہ ان کی ظاہری وضع قطع پر بھی ادنیٰ فرق نہیں پڑا تھا۔ دوران تعلیم انہوں نے خالص اسلامی ثقافت اختیار کر کے اپنے انگریز استادوں کو بھی متاثر کیا تھا۔ ان کی ذات ”قدیم صالح“ اور ”جدید نافع“ کا بہترین سنگم تھی، وہ ایک طرف دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم اور دارالعلوم دیوبند کی شورلی کے رکن تھے تو دوسری طرف شہر کے ایک کامیاب معالج بھی تھے، مطب کی مشغولیت کی بنا پر وہ خود جس سطح پر کام کرنا چاہتے تھے اس کا موقع ان کو نہیں مل سکا، لیکن حضرت مولانا کی انہوں نے پوری ذہنی و فکری تربیت کی تا کہ وہ دنیا کے حالات کو سمجھ سکیں، تہذیب نو کا تجزیہ کر سکیں اور اسلامی مزاج کی روشنی میں علی وجہ البصیرۃ اس کا جواب دے سکیں۔

حضرت مولانا خود تحریر فرماتے ہیں :

”مغربی تہذیب و نظام سے نفرت اصل میں بڑے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی صاحب مرحوم، بی، ایس، سی۔ ایم، بی، بی، ایس، کی صحبتوں اور مجلسوں میں پیدا ہوئی جو اس سے براہ راست واقفیت رکھتے تھے، اور اعلیٰ

مغربی تعلیم کے باوجود اس کی سخت تنقید اور مذمت کرتے تھے۔ یوں بھی ان کی زندگی، اور ان کا سراپا قدیم اسلامی تہذیب و ثقافت کی فتح مندی اور مغربی ماحول کے اثرات کی شکست و ہزیمت کا اعلان کرتا تھا، اس نفرت کو جو زیادہ تر قلبی تھی مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادیؒ کے ”سچ“ اور ”صدق“ کے پرچوں نے مستحکم اور دماغی بنا دیا۔“

مزید جن کتابوں نے اس سلسلہ میں مواد فراہم کیا ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مغربی تہذیب کی تاریخ سمجھنے میں اور لادینیت و مادیت کے ارتقاء کی اس منزل کی توجیہ میں ڈریپر کی پرانی کتاب ”معرکہ مذہب و سائنس“ (مترجمہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم) اور لیکسی کی تاریخ اخلاق یورپ (مترجمہ مولانا عبد الماجد دریا بادیؒ) نے بڑی مدد کی اور اس سے بڑا مواد ملا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودیؒ کے مضامین ”ترجمان القرآن“ اور ان کی کتاب ”تنقیحات“ نے اور زیادہ وضاحت و تقویت پہنچائی۔

مغربی تہذیب کے مزاج اور اس کے حقیقی نقائص، اسلامی تہذیب سے اس کے بنیادی و اصولی تضاد اور دونوں کے اتحاد کے عدم امکان کے متعلق سب سے

زیادہ واضح اور پر مغز چیز محمد اسد صاحب کی کتاب Islam at the cross road معلوم ہوئی جس کا لفظ لفظ دل نشین ہوا۔“ (۱)

اس سلسلہ میں مولانا سید طلحہ حسنی صاحب کا نام بھی حضرت مولانا نے کئی جگہ لیا ہے جو مولانا کے حقیقی پھوپھا تھے، علوم جدید و قدیم میں ان کو درک تھا، اور بینیل کالج (لاہور) میں پروفیسر رہ چکے تھے۔ ان کی صحبتوں سے بھی حضرت مولانا نے فائدہ اٹھایا۔

حضرت مولانا کی نشو و نما بھی اس زمانے میں ہوئی تھی جب تحریک آزادی اور دینی جوش و خروش کا عہد شباب تھا اور لکھنؤ کو اس تحریک کے ایک مرکز کی حیثیت حاصل تھی، یہ سب واقعات مولانا کی نگاہوں کے سامنے سے گزرے تھے۔

مولانا کی نگاہ بصیرت

حضرت مولانا کی نگاہ بصیرت نے ان خطرات کو بہت دور تک محسوس فرمایا تھا اور ان کے فہم و فراست نے بہت سے ان حقائق کا ادراک کر لیا تھا جو عام طور پر نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ اس میں مولانا کی خاص ماحول میں تعلیم و تربیت کے علاوہ ان کی خداداد بصیرت و فراست کا بنیادی حصہ تھا۔

حضرت مولانا نے وسعتِ مطالعہ اور اپنی بصیرت سے محسوس فرمایا تھا کہ مسئلہ صرف ایک تہذیب یا ثقافت کا نہیں ہے بلکہ اس کے پس پشت پورا ایک فلسفہ ہے جو دین کے انکار پر مبنی ہے، مستقل عقائد ہیں جو سراسر الحاد و کفر تک لے جاتے ہیں، اگر کوئی آنکھ بند کر کے اس تہذیب کو اختیار کر رہا ہے تو اس کا ایمان خطرہ میں ہے، یہ ایسا الحاد و ارتداد ہے جو مغربی تہذیب کی جلوہ سامانیوں کے ساتھ پھیل رہا ہے، اس تہذیب کی ظاہری چمک دمک نے اس پر ایسا پردہ ڈال دیا ہے کہ آدمی اس کو محسوس نہیں کر پاتا اور اس کے شکنجے میں جکڑتا چلا جاتا ہے۔ ایک مضمون میں وہ تحریر فرماتے ہیں :

”کچھ عرصہ سے دنیائے اسلام کو ایک ایسے ارتداد سے سابقہ پیش آیا ہے جس نے اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک لہر پیدا کر دی ہے، یہ اپنی شدت و قوت اور وسعت و عمق میں اب تک کی تمام ارتدادی تحریکوں سے بازی لے گیا ہے، کوئی ملک نہیں ہے جو اس کی غارت گری سے بچا ہو بلکہ ملک تو ملک خاندانوں میں ایسے مشکل سے تھوڑے بہت ہوں گے جو اس کی دست برد سے محفوظ ہوں۔ یہ وہ ارتداد ہے جو شرق اسلامی پر یورپ کی سیاسی اور تہذیبی تاخت کے پیچھے پیچھے آیا ہے، یہ سب سے عظیم ارتداد ہے جو عہد رسالت سے لے کر آج تک کی اسلامی تاریخ میں رونما ہوا ہے۔“ (۱)

اس ارتداد کی اندیشہ ناک کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

”بلاشبہ یہ ارتداد ہے لیکن وہ مسلمانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں

کر سکا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس ارتداد کا مارا ہوا کلیسیا ہیکل نہیں جاتا اور نہ اپنے ارتداد اور تبدیلی مذہب کا اعلان کرتا ہے، نہ معاشرہ اس پر چونکتا ہے کہ احتساب و عتاب کی صورت پیش آئے اور فصل و انقطاع کا معاملہ درپیش ہو، وہ بدستور اسی سوسائٹی اور معاشرہ میں رہتا ہے، اپنے تمام حقوق حاصل کرتا ہے بلکہ معاشرہ پر حاوی ہونے تک کا اس کو موقع مل جاتا ہے۔ یہ عالم اسلامی کا نہایت اہم مسئلہ اور بڑا قابل فکر معاملہ ہے۔“ (۱)

یہ حضرت مولانا کی نگاہ بصیرت تھی کہ انہوں نے اس تہذیب کی بنیادوں کو دیکھا اور محسوس کر لیا کہ جو تخم زمین پر ڈالا گیا ہے اس کا درخت دیکھنے میں خواہ کیسا ہی سرسبز و شاداب نظر آئے لیکن اس کی زہر آلود ہوا اور مسموم فضا کے نیچے جو بھی آرام کر لے گا وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

اس حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے اور اس ایمان کش تہذیب کا صحیح تجزیہ کر کے اس ملحدانہ فلسفہ کا قلع قمع کرنے کو انہوں نے وقت کا سب سے بڑا جہاد قرار دیا۔ اسی مضمون میں آگے تحریر فرماتے ہیں :

”آج کا جہاد، وقت کا فریضہ اور عصر حاضر کی سب سے بڑی دینی ضرورت یہ ہے کہ لادینیت کی اس طوفانی موج کا مقابلہ کیا جائے جو عالم اسلام کے سر سے گزر رہی ہے، صرف یہی نہیں بلکہ آگے بڑھ کر اس کے قلب و مرکز پر حملہ کیا جائے۔ وقت کا تجدیدی کام یہ ہے کہ امت کے نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقے میں اسلام کے اساسیات و عقائد، اس کے نظام و حقائق اور رسالت محمدی ﷺ پر وہ اعتماد واپس لایا جائے جس کا رشتہ اس طبقے کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے۔ آج کی سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ اس فکری اضطراب اور ان نفسیاتی الجھنوں کا علاج بہم پہنچایا جائے جن میں آج کا تعلیم یافتہ نوجوان بری طرح گرفتار ہے اور اس کی عقلیت اور علمی ذہن کو اسلام پر پوری طرح مطمئن کر دیا جائے۔ آج کا سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ جاہلیت کے وہ بنیادی افکار جو

دل و دماغ میں گھر کر گئے ہیں ان سے علم و عقل کے میدانوں میں نبرد آزما کی جائے، یہاں تک کہ اسلام کے اصول و مبادی پورے ایمانی جذبات کے ساتھ ان کی جگہ لے لیں۔“ (۱)

مولانا کی نگاہ میں سب سے بڑا خطرہ

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی متعدد تصانیف اور رسائل میں اس تہذیب کو اسلام کے لیے بہت بڑا خطرہ قرار دیا ہے۔ اپنی مشہور تصنیف ”اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش“ میں تحریر فرماتے ہیں :

”انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں عالم اسلام کو ایک بہت ہی نازک، پیچیدہ اور اہم مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا، اس مسئلہ کے بارے میں اس کے صحیح رویہ اور نقطہ نظر ہی پر ایک مستقل اور آزاد دنیا کی حیثیت سے اس کی شخصیت اور وجود کا انحصار تھا۔

یہ تازہ دم، زندگی اور نشاط، حوصلہ و عزم اور ترقی و وسعت کی صلاحیت سے بھرپور مغربی تہذیب کا مسئلہ تھا، جس کا شمار تاریخ انسانی کی طاقت و ترین اور وسیع ترین تہذیبوں میں کیا جانا چاہیے اور جو حقیقت (اگر غائر نظر سے دیکھا جائے) ان اسباب و عوامل کا ایک قدرتی نتیجہ ہے، جو عرصہ سے تاریخ میں اپنا کام کر رہے تھے، اور مناسب وقت پر اس نئی شکل میں ظاہر ہونے کے منتظر تھے۔

عالم اسلام سب سے زیادہ اس خطرہ کی زد میں تھا، اس لیے کہ کارگاہ حیات سے قدیم مذاہب کی کنارہ کشی کے بعد اسلام دینی و اخلاقی دعوت کا تہا علمبردار، اور معاشرہ انسانی کا واحد نگران اور محتسب رہ گیا تھا، بہت سے وسیع، سیر حاصل اور زرخیز ممالک اسی رقبہ میں واقع تھے چنانچہ اس مادی اور میکاکی تہذیب کے چیلنج کا رخ بہ نسبت کسی دوسری قوم اور معاشرہ کے زیادہ تر عالم اسلام ہی کی طرف رہا۔“ (۲)

(۱) نیا طوفان اور اس کا مقابلہ صفحہ ۲۶

(۲) مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش صفحہ ۷

اس تہذیب کے اجزائے ترکیبی کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

”اس تہذیبی مجموعہ میں ناقص اجزاء بھی تھے اور مکمل بھی، مضرب بھی اور مفید بھی، صحیح بھی اور غلط بھی، اس میں علم کے ان بدھیات کے ساتھ جو ہر شہمہ سے بالاتر ہیں، ایسے غلط قیاسات، خیالات و افکار اور بزم خود ایسے فیصلے بھی شامل تھے جن میں بحث و مباحثہ اور غور و خوض کی پوری گنجائش موجود ہے، ان میں ایسے علمی نتائج بھی تھے، جو بڑے غور و خوض اور مطالعہ و تجربہ کا نچوڑ تھے اور ایسے بھی تھے جن کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت تھا، وہ اجزاء اور عناصر بھی تھے جو کسی خاص ملک اور قوم کے ساتھ مخصوص نہیں مثلاً تجربی علوم، اور وہ بھی جن میں مغربی تہذیب کی مقامی روح پوری طرح نمایاں تھی، اور مغربی ماحول اور معاشرہ کا ان پر گہرا اثر تھا، اور وہ ان تاریخی انقلابات اور حوادث کا نتیجہ تھے جن سے مغربی اقوام کو اپنے دائرہ عمل اور مرکز میں گزرتا پڑا، وہ بھی تھے جن کا دین و عقائد سے گہرا تعلق تھا، اور وہ اجزاء بھی تھے جن کو سرے سے مذہب سے کوئی سروکار نہ تھا۔“ (۱)

تین موقف

اس نئی پیچیدہ صورت حال سے نپٹنے کے لیے مولانا نے تین موقف ذکر فرمائے ہیں :

ایک خالص منفی رویہ ہے، دوسرا خالص مثبت اور تیسرا وہ معتدل موقف ہے جس کو پوری نزاکت اور توازن کے ساتھ کم ہی لوگ اختیار کر سکے ہیں۔ اور یہ حضرت مولانا کا خاص امتیاز ہے۔

عام طور پر علماء و دانشوروں نے یا تو پوری طرح یورپ کی شاگردی اختیار کر لی اور یا اس کی کسی بھی چیز کو ہاتھ لگانا بھی حرام اور ناجائز سمجھا، بقول اکبر الہ آبادی مرحوم کے

ادھر یہ ضد ہے کہ لیمن بھی چھو نہیں سکتے

ادھر یہ ہٹ ہے کہ ساتی صراحی سے لا

حضرت مولانا نے عالم اسلام کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ یہ دونوں طریقہ فکر کس

قدر نقصان دہ ہیں؟! پہلے موقف کے نتائج کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”اس موقف کا قدرتی نتیجہ عالم اسلام کی پسماندگی اور زندگی کے رواں دواں قافلہ سے پھڑکنے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا، اس سے عالم اسلام کا رشتہ باقی دنیا سے منقطع ہو جائے گا اور وہ ایک محدود حقیر جزیرہ بن کر رہ جائے گا جس کا گرد و پیش کی دنیا سے کوئی پیوند نہیں ہوگا، سمندر میں ایسے بے شمار جزیرے ہو سکتے ہیں لیکن خشکی میں اس طرح کے جزیروں کی گنجائش نہیں۔“ (۱)

پھر حضرت مولانا نے اسلامی نصوص کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ یہ رویہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے اور اسلام قطعاً اس کی اجازت نہیں دیتا۔ حضرت مولانا نے ان ملکوں کا تذکرہ بھی کیا ہے جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا اور کس درجہ ان کو دینی اور تمدنی نقصان اٹھانا پڑا۔

دوسرے موقف کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

دوسرا موقف شکست خوردگی، مکمل سپردگی اور ایک عقیدت مند اور سرگرم مقلد اور ایک ایسے ہونہار وسعادت مند شاگرد کا ہے، جو ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچا، اور وہ یہ ہے کہ عالم اسلام کا کوئی حصہ اس مادی، مشینی اور اپنا مخصوص مزاج و ذہن رکھنے والی تہذیب کو جوں کا توں قبول کر لے اور اس کے سارے بنیادی عقائد، فکری رجحانات، مادی افکار و خیالات اور سیاسی و اقتصادی نظام پر ایمان لے آئے (جو عالم اسلام کے ماحول سے بہت دور، نہایت مختلف حالات میں پیدا ہوئے اور ان ہی حالات میں ان کی تشکیل اور پرورش ہوئی) پھر اپنے ملک میں اس کی مکمل نقل کرنا چاہے اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانی کرنے اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے پر آمادہ ہوں۔“ (۲)

ظاہر ہے کہ اس موقف کو وہی اختیار کر سکتا تھا جو اس تہذیب کی گہرائی تک نہ پہنچا ہو یا اس کے ایمان کی انگیٹھی سرد ہو چکی ہو۔

(۱) مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش صفحہ: ۹

(۲) ایضاً صفحہ: ۴۷

متوازن اور صحیح طرز فکر

تیسرا موقف وہ متوازن اور صحیح موقف ہے جس کو اختیار کرنے کی مولانا نے عالم اسلام کو دعوت دی ہے۔ یہی وہ طرز فکر ہے جو عالم اسلام کو مغربیت اور اسلامیت کی اس کشمکش میں پورا تحفظ فراہم کر سکتا ہے اور اس کے لیے ترقی کی راہوں کو کھول سکتا ہے۔

اس موقف کو اختیار کرنے والے مرد کامل کے اوصاف بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا رقم طراز ہیں :

”جو مغربی تہذیب کا جرأت اور اعتماد اور یقین کے ساتھ سامنا کرے اور اس تہذیب جدید کے مختلف سانچوں، مختلف مکاتب فکر اور راستوں کے درمیان ایک نیا راستہ پیدا کرے، ایسا راستہ جس میں وہ تقلید، نقل، غلو اور انتہا پسندی سے بالاتر نظر آئے اور ظاہری اشکال، مظاہر اور سطحی نقطہ نظر سے بلند ہو، حقائق اور وسائل، قوت اور مغز کی طرف متوجہ ہو اور اس کے ظاہری خول میں نہ الجھے۔“ (۱)

آگے تحریر فرماتے ہیں :

”وہ عالی دماغ، حوصلہ مند انسان، جو مغربی تہذیب اور اس کے تمام نظریات، انکشافات اور قوتوں کے ساتھ خام مال (Raw Material) کا سا معاملہ کرے اور اس سے ایک نئی طاقت اور تہذیب کی عمارت تعمیر کرے، جو ایک طرف ایمان، اخلاق، تقویٰ، رحم دلی اور انصاف پر قائم ہو۔ دوسری طرف اس میں اس کی مخصوص ذہانت، قوت ایجاد اور جدت فکر جلوہ گر ہو، وہ مغربی تہذیب کو اس نظر سے نہ دیکھے کہ وہ تکمیل و ترقی کے آخری مراحل سے گزر چکی ہے اور اس پر آخری مہر لگ چکی ہے اور اب اسی میں کسی ترمیم و اضافہ کی گنجائش نہیں ہے اور اس کو جوں کا توں اس کے سارے عیوب کے ساتھ قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے بلکہ وہ اس پر علحدہ علحدہ اجزاء کی حیثیت سے نظر ڈالے، جس چیز کو چاہے رد کرے اور جس چیز کو چاہے اختیار کرے، اور پھر اس سے زندگی کا ایک ایسا ڈھانچہ تیار کرے جو اس کے مقاصد، اس کے عقیدہ، اس

کے مبادی اور اصول اخلاق کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔“ (۱)
حضرت مولانا نے جس مرد کامل کی تصویر کشی فرمائی ہے اور تہذیب مغرب کے سلسلہ میں جو فکر پیش کی ہے خود وہ اس کے پر جوش داعی اور ترجمان نظر آتے ہیں، اور یہ دعوت فکر و عمل ان کی تحریروں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

حضرت مولانا کی امتیازی خصوصیت

مغربی تہذیب کے بارے میں حضرت مولانا کے طرز فکر اور دعوت فکر و عمل کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس میں تین ایسی بنیادی خصوصیات نظر آتی ہیں جو معاصر داعیوں اور مفکروں کے یہاں اگر نایاب نہیں تو کیا ضرور ہیں۔

ان میں سب سے زیادہ اہم خصوصیت اس تہذیب کے نقد و اعتراف میں حضرت مولانا کی فکر کا توازن ہے جو شاید ہی اور کہیں نظر آئے۔ دوسری خصوصیت اس تہذیب کی تنقید اور اس کے نقصانات کو واضح کرنے میں حضرت مولانا کی گہرائی ہے۔ مولانا کی تیسری خصوصیت اس کام میں ان کی وسعت اور ہمہ گیری ہے۔ انہوں نے مختلف ملکوں کے حالات کا جائزہ لیا ہے اور وہاں کے تقاضوں، ضروریات اور لوگوں کی نفسیات سمجھ کر علاج تجویز فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا اس تہذیب اور اس کے پس منظر اور اس کے رجحانات سے بھرپور واقفیت رکھتے ہیں جو صرف مطالعہ پر ہی منحصر نہیں ہے بلکہ مشاہدہ پر مبنی ہے۔

ذیل میں حضرت مولانا کے ان تینوں امتیازات کو قدرے تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے :

مغربی تہذیب پر گہرائی کے ساتھ تنقید

حضرت مولانا کی یہ ایک بڑی خصوصیت ہے کہ انہوں نے اس تہذیب کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے، اس کی بنیادی کمزوریوں اور نقائص کی نشاندہی فرمائی ہے، اس کی دکھتی رگوں پر انگلی رکھ دی ہے اور ایسے بہت سے بنیادی حقائق پیش فرمادیئے ہیں جن کو سامنے رکھ کر ایک انصاف پسند انسان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور

صاف نظر آنے لگتا ہے کہ یہ تہذیب اپنے اندر نوع انسانیت کے لیے کیا کیا مضر اثرات رکھتی ہے؟

حضرت مولانا کی یہ خصوصیت سب سے زیادہ ان کی مشہور ترین تصنیف ”ماذا خسرو العالم بانحطاط المسلمین“ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر) میں نمایاں ہے۔ حضرت مولانا کا یہ وہ نیا اور اچھوتا انداز نگارش ہے جس میں مورخانہ تحقیق کی امانت اور لطافت و نزاکت کے ساتھ دعوت و فکر کی بھی جلوہ نمائی ہے، اور کتاب ایسے اسلوب میں لکھی گئی ہے کہ وہ عقل اور قلب دونوں کو یکساں مہمیز کرتی ہے اور غذا فراہم کرتی ہے، معاصر مفکرین و داعیوں نے کھل کر اس کتاب کی داد دی، سید قطب جیسے مفکر و داعی نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے :

اس موضوع پر تمام قدیم و جدید لٹریچر میں چند بہترین کتابیں جو میری نظر

سے گزری ہیں ان میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی جدید تصنیف ”ماذا خسرو

العالم بانحطاط المسلمین“ خاص مقام رکھتی ہے۔“ (۱)

اس کتاب میں صرف مسلمانوں کے عروج و زوال کی کہانی نہیں سنائی گئی ہے بلکہ اس کے اسباب کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے اور دنیا پر پڑنے والے اس کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مغربی تہذیب کا شجرہ نسب

اس کتاب کے پانچویں باب میں مولانا نے مغربی عہد کا تذکرہ کیا ہے، جس میں مغربی تہذیب کے تانے بانے بیان کیے ہیں اور اس کے اجزائے ترکیبی پر روشنی ڈالی ہے۔ اس تہذیب کے شجرہ نسب کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

”بیسویں صدی کی مغربی تہذیب (جیسا کہ بعض سطحی النظر سمجھتے ہیں)

کوئی ایسی نوعِ تہذیب نہیں ہے جس کی پیدائش پچھلی صدیوں میں ہوئی ہے،

دراصل اس کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے، اس کا نسب تعلق رومی اور یونانی

تہذیب سے ہے، ان دونوں تہذیبوں نے اپنے ترکہ میں جو سیاسی نظام،

اجتماعی فلسفہ اور عقلی و علمی سرمایہ چھوڑا تھا اس کے حصہ میں آیا، اس کے سارے رجحانات اور خصوصیات اس میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوئے۔“ (۱)
آگے تحریر فرماتے ہیں :

”اس بنا پر ضروری ہے کہ پہلے یونانی اور رومی تہذیب سے واقفیت پیدا کریں اور ان کے مزاج اور روح کو پہچان لیں تاکہ ہم بصیرت کے ساتھ بیسویں صدی کی مغربی تہذیب پر تنقید کر سکیں۔“ (۲)
یونانی تہذیب کی حضرت مولانا نے چار خصوصیات بتائی ہیں جن کا ذکر باب کے آغاز میں کیا جا چکا ہے۔ پھر تحریر فرماتے ہیں :

”ہم ان متعدد اجزاء اور پہلوؤں کو اگر ایک مفرد لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو اس کے لیے تنہا ”مادیت“ کا لفظ کافی ہے، پس یونانی تہذیب کا ماہہ الاتیاز ”مادیت“ ہے۔ یونانیوں کا علم، فلسفہ شاعری حتیٰ کہ دین، سب ان کی مادی روح کی غمازی کرتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی قدرت کا تصور مختلف دیوتاؤں کی شکل کے بغیر نہ کر سکے، انہوں نے ان صفات کے بت تراشے اور ان کے لیے معبد تعمیر کیے تاکہ محسوس طریقہ پر ان سے تعلق رکھیں، ان کے ہاں ایک روزی کا دیوتا تھا، ایک رحمت کا اور ایک قہر و عذاب کا، پھر ان کی طرف انہوں نے مادی جسم کی تمام خصوصیات اور تعلقات منسوب کیے اور ان کے گرد قصے کہانیوں کا ایک جال پھیلا دیا۔“ (۳)

مغربی علماء کی تحریروں سے اقتباسات دے کر حضرت مولانا نے ثابت کیا ہے کہ خود ان کو مادیت کے اس غلبہ کا اعتراف ہے، پھر حضرت مولانا اس کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

”لیکن یہ حقیقت قطعاً قابل استعجاب نہیں، مغرب کی مادہ پرست اور خوگر محسوسات فطرت و مزاج کے علاوہ یونانیوں کا فلسفہ الہیات اور اس کے عقائد

(۱) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر صفحہ: ۱۹۷

(۲) ایضاً صفحہ: ۱۹۸

(۳) ایضاً صفحہ: ۱۹۷

کی ساخت کچھ ایسی ہی واقع ہوئی تھی کہ خشوع و خضوع، انابت اور رجوع الی اللہ کی کیفیت ان میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی، ذات باری کے تمام صفات، ہر قسم کے اختیار فعل و تصرف اور خلق و امر کی نفی کرنے اور اس کو بالکل بے صفت اور معطل قرار دینے اور اس کائنات کی پیدائش و انتظام کو اپنے خود تراشیدہ اور مفروضہ عقل فعال کی طرف منسوب اور اس سے وابستہ کرنے کا طبعی اور منطقی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ زندگی میں خدا کی کوئی ضرورت اور اس سے کوئی تعلق اور دلچسپی باقی نہ رہ جائے، نہ اس سے کوئی امید ہو اور نہ اس کا کوئی خوف، نہ دل میں اس کی ہیبت ہو اور نہ دلچسپی، اور نہ ضرورت و مصیبت کے وقت اس سے دعا و التجا ہو، اس لیے کہ وہ اس فلسفہ کے مطابق ایک بالکل معزول و معطل ہستی ہے جس کو عالم میں تصرف کرنے کا نہ کوئی اختیار ہے نہ طاقت، وہ عقل اول پیدا کر کے عالم سے بالکل بے تعلق و کنارہ کش ہو گیا، اس لیے اس عقیدہ کے ماننے والوں کی زندگی عملاً ایسی گزرتی ہے، اور گزرنی چاہیے کہ گویا خدا نہیں ہے اور منکرین خدا کی زندگی سے سوائے اس تاریخی بیان کے کہ خدا نے عقل اول کو پیدا کیا ہے اور کسی حیثیت سے ممتاز نہیں، پس جب ہم یہ سنتے ہیں کہ یونانیوں میں خشوع اور خضوع کی کمی تھی اور ان کی عبادات اور مذہبی اعمال ایک قالب بے روح سے زیادہ نہ تھے اور وہ یہ کہ خدا کی بزرگوں سے زیادہ تعظیم نہیں کرتے تھے تو ہم کو ذرا بھی تعجب نہیں ہونا چاہئے، اس لیے کہ تاریخ میں آدمی سیکڑوں صداعوں اور موجودوں کا تذکرہ پڑھتا ہے، لیکن کبھی ان کی طرف سے اس کے دل میں خشوع اور خضوع اور ان سے بندگی کا ربط نہیں پیدا ہوتا، بندگی کا تعلق تو اس وقت پیدا ہوتا جب خدا کو اس کائنات میں متصرف اور کارفرما اور اپنے کو اس کا محتاج سمجھتے۔“ (۱)

اس فکر کا جو نتیجہ نکلتا تھا وہ نکل کر رہا، اخلاقی انحطاط اور انسانی پستی میں یہ تمدن ایک متعفن لاش کی طرح سڑ گئی، کسی قسم کے اخلاقی اصول و اقدار باقی نہیں رہے اور زندگی

لطف اندوزی، تہنوع اور بوالہوسی کا نام بن گئی۔

رومی اس تہذیب کے وارث ہوئے، علم و تمدن میں انہوں نے پوری طرح یونانیوں کی شاگردی اختیار کی، جس مادیت پر ایرانیوں کا خمیر تیار ہوا تھا اس مادیت پر رومیوں کا خمیر بھی اٹھا۔
حضرت مولانا فرماتے ہیں :

”اس طرح علم و ادب اور عادات و اخلاق کے ذریعہ یونانی قوم کا فلسفہ اور کلچر بلکہ یونانی نفسیات رومیوں میں منتقل ہو گئی اور ان کے رگ و پے میں پیوست ہو گئی، یوں بھی رومی اپنی مغربی فطرت و مزاج کی وجہ سے فطری خصوصیات میں کچھ زیادہ مختلف نہ تھے، زندگی کے بہت سے پہلوؤں میں دونوں کے درمیان بڑی حد تک مشابہت تھی، محسوسات پر رومی بھی یقین کرنے کے عادی تھے، زندگی کی قدر و قیمت میں یہاں بھی اتنا ہی غلو اور افراط تھا، دینی عقائد و حقائق کے بارے میں یہ بھی بہت ضعیف الایمان اور آزاد خیال تھے، مذہبی نظام اور مذہبی اعمال و رسوم کا کوئی خاص احترام اور وقار نہ تھا، قومیت اور وطنیت میں یہاں بھی شدت اور مبالغہ پایا جاتا تھا، مزید یہ کہ طاقت کا احترام عبادت اور تقدیس کے درجہ کو پہنچا ہوا تھا“ (۱)

حضرت مولانا نے ایرانی اور رومی تمدن کا نقشہ ان ہی کے فضلاء و مصنفین کے حوالوں سے ایسا پیش کیا ہے جس سے اس کے پورے اجزاء سامنے آ جاتے ہیں۔ حضرت مولانا کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حقائق و واقعات حوالوں کے ساتھ پیش کرتے چلے جاتے ہیں، اس کے نتائج اور اثرات مطالعہ کرنے والا خود محسوس کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ جو بات وہ اپنی زبان سے کہنا چاہتے ہیں ان مقدمات کا مطالعہ کرنے والا وہ بات خود اپنی زبان سے ادا کرتا ہے اور خود بخود اس کے ذہن میں ایک خاکہ ابھر آتا ہے۔

چوتھی صدی عیسوی کے آغاز میں عیسائیت نے سلطنت روم پر اپنا جال پھینکا اور قسطنطین تحت سلطنت پر بیٹھا جس نے عیسائیت قبول کر لی تھی لیکن خود اپنے دام میں صیاد آ گیا، بجائے اس کے کہ عیسائیت اس عظیم سلطنت کی رہنمائی کرتی وہ خود اس کا لقمہ تر بن گئی، سینٹ پال کی

تحریف و تلبیس کے بعد جو بچا تھا وہ قسطنطین کی مادیت کی نذر ہو گیا، کچھ ہی عرصہ میں اس مادیت سے عاجز ہو کر کچھ مذہب کے نام لیواؤں نے رہبانیت کی دعوت دی اور پھر ایک طبقہ پر اس کا ایسا جنون سوار ہوا کہ عورت کی شکل دیکھنا بھی گناہ تھا، مائیں متا کو ترس گئیں، تو الدو تناسل کا تناسب خطرناک حد تک گر گیا۔ اس کے بالکل برخلاف دوسرا طبقہ لذت اندوزی اور عیش کوئی کی آخری سرحدیں چھو رہا تھا۔ بالآخر اس رہبانی جنون پر لذت پرستی ہی غالب آئی اور کلیسا ایسے ہاتھوں میں چلا گیا جو خالص دولت پرست اور نفس پرست لوگ تھے، دولت اور اقتدار کے لیے وہ ہر کچھ کرنے کو تیار تھے، عوام کو انہوں نے اپنی عزت و وقار باقی رکھنے کے لیے تو ہمت میں جکڑ دیا، حصول علم کو گناہ قرار دے دیا اور ایک عرصہ تک پورا یورپ تاریکی میں ڈوبا رہا۔

دین و دنیا کی تفریق

طلوع اسلام کے بعد جب اسلامی تہذیب کا غلغلہ بلند ہوا تو اندلس کے راستہ سے اس کی روشنی یورپ میں بھی داخل ہوئی، شروع میں علم کا شوق جن افراد میں پایا جاتا تھا وہ خفیہ طور پر اندلس میں علم حاصل کرتے تھے اور یورپ کے کلیسا کی طرف سے ان کے ساتھ سخت معاندانہ رویہ اختیار کیا جاتا تھا آہستہ آہستہ یہ رجحان بڑھتا رہا یہاں تک کہ وہ تیرہویں صدی میں عام ہو گیا، کلیسا کی علم دشمنی کی وجہ سے مذہب و عقلیت کی کشمکش شروع ہوئی، عرصہ تک یہ معرکہ گرم رہا بالآخر کلیسا کو شکست ہوئی اور خالص مادی تمدن کا فروغ شروع ہوا، یورپ ایک طویل نیند کے بعد بیدار ہوا تھا اس لیے اس نے پوری تلاشی کرنے کی کوشش کی، لیکن چونکہ کلیسا اور مذہب سے طویل کشمکش اور بالاخر اس پر فتح حاصل کرنے کے بعد یورپ نے ترقی شروع کی تھی اس لیے اس تمدن اور تہذیب کی بنیاد ہی مذہب دشمنی پر پڑی۔

یورپ کی کوتاہ نظری

حضرت مولانا نے قدرے تفصیل سے شواہد کے ساتھ یہ حقائق پیش فرمائے ہیں، پھر تحریر فرماتے ہیں :

”ان روشن خیالوں اور تجدد پسندوں میں اتنا صبر و سکون، مطالعہ اور غور کی قوت اور عقل و اجتہاد کی قابلیت نہ تھی کہ وہ اصل دین اور اس کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والوں کے درمیان امتیاز کر سکیں اور یہ سمجھ سکیں کہ ان واقعات میں دین کہاں تک ذمہ دار ہے اور کہاں تک ارباب کلیسا کا جمود؟! چہالت، استبداد اور غلط نمائندگی اس کی ذمہ دار ہے اور اگر دوسری شکل ہے تو دین کو اس کی سزا دینا اور اس سے بے تعلقی اختیار کر لینا کہاں تک حق بجانب ہے؟! لیکن غصہ اور اہل مذہب کی عداوت اور عجلت پسندی نے اس بارہ میں ان کو غور کرنے کا موقع نہ دیا اور جیسے کہ دنیا میں عموماً بغاوت اور احتجاج کے موقع پر ہوتا ہے، انہوں نے دین کے ساتھ کوئی رواداری اور مفاہمت پسند نہیں کی۔

ان میں اتنی طلب صادق اور اپنی قوم کی خیر خواہی، فراخ حوصلگی بھی نہ تھی کہ وہ دین اسلام کا مطالعہ کرتے جو ان کی بہت سی معاصر قوموں کا دین تھا اور جو نہایت آسانی کے ساتھ اس مختصہ اور مذہب و عقلمیت کی اس غیر ضروری کشمکش سے نجات دیتا جو معقول و مستحسن امور کا مطالبہ کرتا، غیر معقول اور ناپسندیدہ چیزوں سے روکتا، دنیا کی بے ضرر اور پاک لذتوں اور فوائد کی ان کو اجازت دیتا، مضر اور قابل نفرت اشیاء کو ممنوع قرار دیتا اور ان بے جا زنجیروں اور بیڑیوں کو کاٹ دیتا جو تحریف شدہ مذاہب اور تشدد پسند اہل مذہب اور اہل حکومت نے ان کے جسم میں ڈال رکھی تھیں۔

يَا مُرْهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَهُم عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلِّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۱)
(محمد رسول اللہ ﷺ) ان کو نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، پسندیدہ چیزیں حلال کرتے ہیں، گندی چیزیں حرام ٹھہراتے ہیں، اس بوجھ سے نجات دلاتے ہیں جس کے تلے وہ دبے ہوئے ہیں، ان پھندوں سے نکالتے ہیں جو ان پر پڑے ہوئے ہیں)

لیکن قومی عصبیت اور ان دیواروں کی وجہ سے جو صلیبی جنگوں نے عیسوی مغرب اور اسلامی مشرق کے درمیان اور ارباب کلیسا کی افتر پردازیوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف کھڑی کر دی تھیں نیز مطالعہ و تحقیق کی محنت برداشت نہ کرنے اور موت کے بعد کی زندگی اور نجات اخروی سے آزادو بے فکر ہونے کی وجہ سے انہوں نے اسلام کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔

اس میں کچھ دخل مسلمانوں کی تبلیغی کوتاہیوں کو بھی ہے کہ انہوں نے صدیوں یورپ جیسے اہم براعظم میں اسلام کی نشر و اشاعت اور اس کے تعارف کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، حالانکہ اسلامی حکومت کے عروج اور یورپ کی سلطنتوں سے معاصرانہ اور مساویانہ تعلقات ہونے کی وجہ سے ان کو اس کے مواقع حاصل تھے۔“ (۱)

مکمل مادیت کی طرف

”غرض اہل یورپ ایسے نازک موقع پر اسلام کی رہنمائی اور اس کی مسیحائی

سے محروم رہے۔

بہر حال جس کا خطرہ تھا وہ پیش آ گیا اور یورپ کا رخ ایک مکمل اور وسیع مادیت کی طرف ہو گیا، خیالات، نقطہ نظر، نفسیات و ذہنیت، اخلاق و اجتماع، علم و ادب، حکومت و سیاست غرض زندگی کے تمام شعبوں میں مادیت غالب آ گئی، اگرچہ یہ تدریجی طور پر ہوا اور ابتدا میں اس کی رفتار سست تھی لیکن قوت و عزم کے ساتھ یورپ نے مادیت کی طرف حرکت کرنی شروع کی۔“ (۲)

آگے تحریر فرماتے ہیں :

اسی زمانہ میں یورپ کے ہر گوشہ میں بہت بڑی تعداد میں ایسے مصنف، ادیب، معلم اجتماعی اور سیاسی پیدا ہوئے جنہوں نے مادیت کا صورت پھونکا اور اہل ملک کے دل و دماغ میں مادہ پرستی کے بیج بودیئے، علمائے اخلاق، اخلاق کی مادی تشریح کرتے تھے، کبھی فلسفہ کی افادیت کی اشاعت کرتے اور کبھی لذتیت کی، میکاؤلی (Machiavelli) (۱۴۶۹-۱۵۲۷ء) جیسے اہل سیاست نے دین و

سیاست کی تفریق کی دعوت پہلے ہی دے دی تھی، اور اخلاق کی دو قسمیں قرار دی تھیں، پبلک اور پرائیویٹ۔ اور طے کر دیا تھا کہ اگر مذہب کی ضرورت ہی ہے تو وہ محض انسان کا ایک پرائیویٹ معاملہ ہے جس کو امور سیاست میں دخل نہیں دینا چاہیے، حکومت ہر چیز پر مقدم اور ہر شے سے پیش قیمت ہے۔ مذہب عیسوی کا تعلق دوسری زندگی سے ہے، ہماری دنیاوی زندگی سے اس کو کوئی سروکار نہیں، مذہبی اور نیکوکار انسانوں کا وجود حکومت کے لیے کچھ مفید نہیں، اس لیے وہ دین کے احکام کے پابند ہوتے ہیں، اور ضرورت کے وقت اخلاقی اصول کو نظر انداز نہیں کر سکتے، بادشاہوں اور حکام کو لوٹریوں کے صفات اختیار کرنے چاہئیں اور اگر حکومت کا فائدہ ہوتا ہو اور کوئی سیاسی مصلحت مقتضی ہو تو عہد شکنی، دروغ گوئی، فریب دہی، خیانت اور نفاق میں پس و پیش نہیں کرنا چاہیے، یہ دعوت و تبلیغ پورے طور پر مؤثر اور کامیاب ہوئی اور وطنیت و قومیت (جو مذہب قدیم کی جگہ لے رہی تھی) نے بھی اس کی پوری امداد کی۔

مصنفین اہل قلم اور اہل دماغ نے اپنی جادو بیانی، سحر طرازی، اور خطابت و شاعری سے قدیم اخلاقی اور اجتماعی نظامات کے خلاف سارے ملک میں ایک بغاوت برپا کر دی، انھوں نے معصیت کو خوش نما اور دل فریب بنا کر پیش کیا۔ طبیعتوں کو ہر قید و بندش، فرد کو ہر ذمہ داری و جواب دہی سے آزاد ہونے کی اور مطلق آزادی و بے قیدی کی کھلی تبلیغ کی، زندگی سے پورے پورے تھج، مطالبات نفس کی پوری تکمیل اور لذت پرستی کی علانیہ دعوت دی اور اس زندگی کی قیمت میں بڑے غلو اور مبالغہ سے کام لیا، نقد لذت اور ظاہر و محسوس مادی نفع کے سوا ہر چیز کا انکار و تحقیر کی۔“ (۱)

یونانی و رومی تہذیب کا نیا ایڈیشن

”اس طرح سے انیسویں اور بیسویں صدی کی مغربی زندگی بت پرست

یونان اور روماں کی جاہلی زندگی کا مرقع بن گئی، یہ گویا اس کا نیا ایڈیشن تھا جو انیسویں صدی میں نئے اہتمام کے ساتھ تیار کیا گیا۔ یونان اور روما کے جن نقوش کو مشرقی عیسویت نے مدھم کر دیا تھا انیسویں صدی کے نقاشوں نے ان کو پھر اجاگر کر دیا۔ اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے، آج کی مغربی قومیں انہیں یونانی، رومی اور مغربی اقوام کی جائز وارث اور خلف الرشید ہیں، موجودہ مغربی تہذیب اور قدیم یونانی اور رومی تہذیب میں قریبی مماثلت پائی جاتی ہے۔ یورپ کی موجودہ مذہبی زندگی بھی روحانیت اور باطنی کیفیت سے اسی طرح عاری ہے جیسے یونانیوں کی مذہبیت تھی، مذہبی کمزوری، خشوع و خضوع اور مذہبی سنجیدگی کی کمی، زندگی میں لہو و لعب کی کثرت کا بھی وہی حال ہے جو یونان میں تھا اور یہ نتیجہ ہے علمائے طبعیات و حکمت کے ان نظریات اور تحقیقات کا جنہوں نے یورپ میں پوری مقبولیت حاصل کر لی اور دین و مذہب کی پوری پوری جگہ لے لی ہے۔ اسی طرح زندگی کی ہوس، لذت طلبی اور ذوقی اور دنیا میں شوق گل چینی کی بھی بعینہ وہی کیفیت ہے جو سقراط نے اپنے زمانے کے جمہوری نوجوان کی بیان کی ہے۔ نیز مذہبی شک و متذبذب، دینی نظام اور مذہبی فرائض و رسوم کے بے وقعتی میں بھی یورپ، یونان و روما سے پیچھے نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کا موجودہ مذہب جس کی دلوں اور روح پر حکومت ہے وہ عیسائیت نہیں بلکہ مادہ پرستی ہے، مغربی نفسیات اور مغربی زندگی سے اس کی قدم قدم پر تصدیق ہوتی ہے۔“ (۱)

تنقید کا وسیع دائرہ

حضرت مولانا نے تاریخی حقائق اور مغربی مفکرین کے اعترافات کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ مغربی تہذیب کا بنیادی روگ مادہ پرستی ہے جس نے اس کو مذہب و اخلاق سے صرف دور ہی نہیں بلکہ بیزار کر دیا ہے۔ یہ چیز اس کو یونانی و رومی تہذیب سے وراثت میں ملی،

پھر کلیسا سے کشمکش نے اس کو دو آتشہ کر دیا۔ حضرت مولانا نے اس سلسلے میں اذعانِ اسلوب نہیں اختیار کیا، بلکہ دلائل کی روشنی میں منطقی انداز بحث اختیار کیا ہے اور اس کو انسانیت کے لیے نقصان دہ رجحان قرار دیا۔

زر پرستی و خدا فراموشی

مادہ پرستی کے بنیادی نقص کا تذکرہ کرنے کے بعد حضرت مولانا نے اس کے اجزاء پر بحث کرتے ہوئے سب سے پہلے زر پرستی کا عنوان قائم کر کے مغربی مصنفین کے اعترافات نقل فرمائے ہیں جس کی انتہا ایک ممتاز امریکی اخبار نویس کا یہ اقتباس ہے :

”انگریز ہفتہ میں چھ روز تو پرستش بینک آف انگلینڈ میں کرتا رہتا ہے

صرف ساتویں روز کلیسائے انگلستان کا رخ کرتا ہے۔“ (۱)

ان کی خدا فراموشی اور خود فراموشی کی مثال ایک ہندوستانی مغرب زدہ کی زبانی نقل فرماتے ہیں جس کا عنوان ہی ”لندن کی ایک رات“ ہے، یہ ۱۹۰۴ء کا قصہ ہے جب شہر پر حملے ہو رہے تھے۔ وہ لکھتا ہے :

”اس رات ہم سب دوست احباب کئی دن اور کئی رات کے متواتر حملوں سے تنگ آ کر ایک نہایت پر تکلف ملی جلی ہندوستانی انگریزی دعوت کے انتظام میں مصروف تھے، مالک مکان نے اپنا باورچی خانہ اور اس کا سب سامان ہمارے حوالہ کر دیا تھا اور اوپر کا بڑا کمرہ بھی ناچ کے لیے خالی کر دیا تھا، کوئی بچیس عورتیں اور مرد سب نے مل کر اپنے ہاتھ سے کھانا پکایا، کھاپی کر ہم لوگ ناچ رہے تھے کہ یکا یک خطرہ کا سائرن بجا۔ پہلے تو ایک دم سے خاموش ہو گئے مگر ناچ بند کیے بغیر ایک بولا: کیا صلاح ہے؟ ایک لڑکی نے جواب دیا ناچتے رہیں گے، چنانچہ ہم سب ناچتے رہے اور گانوں اور تہقہوں سے سارا مکان تو کیا سارا محلہ گونجنے لگا۔“ (۲)

(۱) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر صفحہ ۲۳۲

(۲) ایضاً صفحہ ۲۳۳

مغرب کے مصنفین کے یہاں اس کا نام استقلالِ نفس اور قوتِ قلب ہے، اس پر ان کو فخر ہے جب کہ اسلامی نقطہ نظر سے یہی قساوتِ قلبی، غفلت، مدھوشی و خدا فراموشی ہے۔ یہ مغربی فکر قدیم یونانی و رومی طرز فکر کا نیا ایڈیشن ہے۔ تاریخ کی روایت ہے کہ پامپی آئی کا کوہِ آتش فشاں جب پھٹا ہے تو وہ دن کا وقت تھا اور لوگ ایٹمی تھیز میں بیٹھے ہوئے ظالمانہ لہو و لعب میں مشغول تھے۔

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ مادیت کی روح ان میں ایسی سرایت کر چکی ہے کہ ان کے ہر نظام میں وہی جاری ساری نظر آئے گی حتیٰ کہ اس روحانی تحریک جس سے یورپ کو بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے کی روح بھی مادیت ہی ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ عالم روحانیت کے عجائبات کی سیر کی جائے، اس کے اسرار معلوم کیے جائیں اور تفریح و تسکینِ نفس کا سامان بہم پہنچایا جائے، وہ جانیں بھی دیتے ہیں تو خالص مادی اغراض کے لیے۔

حضرت مولانا کے خیال میں یہ ایسا ”اقتصادی وحدۃ الوجود“ ہے کہ کسی لمحہ وہ اس سے علاحدہ نہیں ہو سکتے، ان کے یہاں سے ہر طرف سے ”لا موجود الا البطن والمعدة“ کی صدا اُس بلند ہو رہی ہیں پھر ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے جس میں اس نے ثابت کیا ہے کہ دراصل انسان ایک ترقی یافتہ جانور ہے، سارے یورپ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے، اسی ذہنیت کے نتیجے میں انگلستان میں ایک نئی نسل پیدا ہو رہی ہے جو انسانوں کی خانگی زندگی کے مفہوم ہی سے نا آشنا ہے، وہ صرف حیوانات کے گلہ کی زندگی ہی سے واقف ہے۔

قومیت و وطنیت اور اس کے نقصانات

دینی انحطاط اور اصول و اخلاق کے زوال کے نتیجے میں قومیت و وطنیت کے جذبہ کو فروغ ہوا۔

حضرت مولانا کی نظر میں اس کا پہلا اثر یہ پڑا کہ پورا یورپ مشرق کے مقابلہ میں ایک حریف کمپ بن گیا اور اس میں ایسا تکبر پیدا ہو گیا کہ دوسری قومیں اس کی نظر میں حقیر بن گئیں۔ انہوں نے طے کر لیا کہ حکومت ان ہی کا حق ہے، زندگی اور برتری اور کسی کا حق

نہیں۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں :

”قوم پرستی کا تخم ایک ہی طرح کے برگ و بار لاتا ہے، یہ ممکن نہیں کہ کوئی قوم، قوم پرستی پر ایمان رکھتی ہو اور دست درازی نہ کرتی ہو یا نہ کرنا چاہتا ہو اور اپنے سوا دوسروں کی تحقیر و تنقیص سے پاک ہو۔“ (۱)

ابھی تازہ واقعہ یہ ہے کہ امام حرم کی شیخ عبدالرحمن السدیس کو صرف اس لیے ایک یورپی ملک نے ویزا دینے سے انکار کر دیا کہ انہوں نے یہودیوں کی مذمت میں خطبہ میں چند الفاظ کہہ دیے تھے، اس کا کہنا یہ تھا کہ یہودی سامی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور سامیوں پر تنقید ممنوع ہے، سامیت کا اطلاق صرف یہودیوں پر کیا جاتا ہے، اس لیے کہ ہٹلر نے یہ تعبیر استعمال کی تھی۔

نفرت اور خوف کو حضرت مولانا نے قوم پرستی کے ضروری عناصر میں شمار کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

”قوم پرستی کا جوش اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا اور اگر پیدا ہو جائے تو باقی نہیں رہتا جب تک کہ قوم کے لیے کوئی چیز نفرت کرنے کے لیے اور کچھ ڈرنے کے لیے نہ ہو چنانچہ قومی رہنما نفرت اور خوف کے ذریعہ سے اس کے جذبات برا بیچتے کرتے رہتے ہیں اور اس کی دکھتی رگ کو دبا کر اس میں ہیجان و اشتعال پیدا کرتے رہتے ہیں۔ وہ نفرت اور خوف کی آگ بجھنے نہیں دیتے بلکہ رائی کا پہاڑ بنا کر چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بڑھا کر اور کسی نہ کسی حقیقی یا فرضی حریف کو سامنے لا کر قوم کے جذبہ نفرت و خوف کو زندہ اور متحرک رکھتے ہیں اور اسی میں اپنی حکومت یا قیادت کی زندگی اور اپنی بقا سمجھتے ہیں۔“ (۲)

یہ حضرت مولانا کی ساٹھ سال پہلے کی تحریر ہے اس کے بعد یورپ و امریکہ کے سیاسی و

(۱) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر صفحہ: ۲۲۳

(۲) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر صفحہ: ۲۳۵ یورپ کے اس نظریہ نظر سے متاثر ہو کر مختلف قوموں نے اس کو اپنا لیا ہے، ہندوستان میں اس کی مثال شدت پسند ہندو تنظیموں سے دی جاسکتی ہے جو مستقل قومی طور پر مسلمانوں سے نفرت کا بیج بوٹی رہتی ہیں اور یہ باور کراتی رہتی ہیں کہ اگر مسلمانوں کو یوں ہی آزاد رہنے دیا گیا تو وہ ہندوؤں کے لیے بڑا خطرہ بن سکتے ہیں۔

انقلابی اقدامات اور دوسری قوموں کے خلاف جارحانہ کاروائیوں سے یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ حضرت مولانا نے نصف صدی پہلے جن خطرات کا خدشہ ظاہر فرمایا تھا وہ حقائق کی شکل میں سامنے آرہے ہیں۔

اسی موضوع کو جب حضرت مولانا مزید پھیلا کر بیان فرماتے ہیں تو آج کے یورپ و امریکہ کی تصویر ابھر کر سامنے آجاتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ موجودہ امریکہ و یورپ کے سیاسی نظریات پر تبصرہ فرما رہے ہیں۔

قوم پرست مغربی حکومتوں کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

”قوم پرست حکومتوں کا معیار عزت و عظمت یہ ہے کہ زمین کے بڑے سے بڑے رقبہ پر ان کا تسلط و اقتدار ہو، ملک کے حدود وسیع اور ذرائع آمدنی وافر ہوں، اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلط کرنے اور ہمسایہ قوموں یا حریف سلطنتوں کو خوف زدہ کرنے کا ان کے پاس پورا سامان ہو۔“ (۱)

مغربی حکومتوں کے خالص مادی طرز فکر پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

”حکومتیں دراصل ایک ترقی یافتہ منظم اور محفوظ تجارتی ادارے ہیں، یہ اصولی طور پر نفع پہنچانے کے لیے نہیں نفع اٹھانے کے لیے قائم ہوتی ہیں، وہ سرے سے کوئی اخلاقی پیغام اور اصلاحی مقصد نہیں رکھتیں، وہ بے تکلف اخلاق و شریعت کے اصول نظر انداز کر دیتی اور اخلاقی تعلیمات و مصالح کو پس پشت ڈال دیتی ہیں، ہر مسئلہ میں ان کا نقطہ نظر معاشی و اقتصادی ہوتا ہے، ہر طرح کی بد اخلاقی و بے حیائی اگر ان کی نظر میں نظم اور ضبط کے دائرہ میں ہو تو درست اور روا ہے۔“ (۲)

اس طرز سیاست کے نتائج کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

”اس طرز سیاست کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اہل ملک کے اخلاق روز بروز پست ہوتے چلے جائیں اور ایک خطرناک اخلاقی انحطاط اور اخلاقی امراض رونما

(۱) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر صفحہ: ۲۳۹

(۲) ایضاً صفحہ: ۲۵۰-۱۱۵۱ اختصار کے ساتھ

ہوں اور پوری قوم میں اور اس کے ہر طبقہ میں تاجرانہ ذہنیت اور نفع اندوزی اور موقع پرستی کی ذہنیت پیدا ہو جائے۔“ (۱)

”جس طرح یہ مادہ پرستی حکومتوں کی روح میں داخل ہو چکی ہے اسی طرح عوام بھی اس کا شکار ہیں، ان میں ایک زبردست تجارتی مقابلہ جاری ہے جس میں اخلاقی قدروں کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہر شخص اپنے سامنے ایک بلند معیار زندگی رکھتا ہے اور وہاں تک پہنچنا اپنا سب سے بڑا فرض سمجھتا ہے، ہر بلند معیار کے بعد دوسرا اس سے بلند معیار سامنے ہوتا ہے اور ہر شخص اس ریس میں ہے کہ کس طرح اس کو حاصل کر لے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ زندگی میں تلخی اور کوفت بہت بڑھ گئی ہے اور اطمینان دلوں سے رخصت ہو گیا ہے۔“ (۲)

قوت و اخلاق کا عدم توازن

اخلاق کے اس انحطاط کے بعد حضرت مولانا نے دکھایا ہے کہ یورپ کی سائنٹفک ترقیاں اور اکتشافات عالم انسانیت کے لیے بجائے راحت رساں ہونے کے ہلاکت و بربادی کا ذریعہ ہیں، اس کی وجہ صرف طاقت اور اخلاق کا عدم توازن ہے۔ فرماتے ہیں :

”بد قسمتی سے یورپ میں قوت و اخلاق اور علم و دین کا توازن صدیوں سے بگڑا ہوا ہے، نفاۃ جدیدہ کے بعد سے مادی قوت اور ظاہری علم بڑی سرعت سے ترقی کرتے رہے اور دین و اخلاق میں تنزل و انحطاط واقع ہوتا گیا، کچھ مدت کے بعد ان دونوں میں کوئی تناسب باقی نہیں رہا اور ایک ایسی نسل پیدا ہو گئی جس کے ترازو کا ایک پہلو آسمان سے باتیں کرتا ہے اور دوسرا تحت الثریٰ میں ہے۔ پروفیسر جوڈ نے خوب کہا ہے کہ ”علوم طبعی نے ہم کو وہ قوت بخشی جو دیوتاؤں کے شایان شان تھی لیکن ہم ان کو بچوں اور وحشیوں کے دماغ سے استعمال کر رہے ہیں۔“ (۱)

اس کے بعد حضرت مولانا نے مغربی مصنفین کے اعتراضات کا تذکرہ کیا ہے اور اس

(۱) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر صفحہ: ۲۵۲

(۳) ایضاً صفحہ: ۲۶۳

(۲) ایضاً صفحہ: ۲۵۵ باختصار

جدید قوت کی ہلاکت آفرینی کے واقعات و شواہد قلمبند فرمائے ہیں۔

اپنی ایک تقریر میں حقائق کی روشنی میں بڑے جوش کے ساتھ مغرب میں بسنے والوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں :

”ہمیں ماننا پڑے گا کہ ہماری جدید تہذیب اور موجودہ فکری قیادت معاشرۂ انسانی کی ذمہ داریاں سنبھالنے والے افراد تیار کرنے اور انسان کی سیرت سازی میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ وہ سورج کی شعاعوں کو گرفتار کر سکتی ہے، وہ خلا میں سفر کرنے کے لیے محفوظ و سرلیج السیر آلات تیار کر سکتی ہے، وہ انسان کو چاند اور سیاروں پر پہنچا سکتی ہے، وہ ذراتی طاقت سے بڑے سے بڑا کام لے سکتی ہے، وہ ملک سے غریبی دور کر سکتی ہے، وہ علم و ہنر کو آخری نقطہ عروج پر پہنچا سکتی ہے، وہ پوری کی پوری قوم اور ایک ملک کی آبادی کو خواندہ و تعلیم یافتہ بنا سکتی ہے، اس کی ان کامیابیوں اور فتوحات سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں لیکن وہ صالح اور صاحب یقین افراد پیدا کرنے سے بالکل عاجز ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی ناکامی اور بد قسمتی ہے اور اسی وجہ سے صدیوں کی محنتیں ضائع اور برباد ہو رہی ہیں اور ساری دنیا مایوسی اور انتشار کا شکار ہے اور اب اس کا سائنس اور علم پر سے بھی اعتماد اٹھ رہا ہے، اندیشہ ہے کہ دنیا میں ایک شدید رد عمل کی تحریک اور علم و تمدن کے خلاف بغاوت کے دور کا آغاز نہ ہو جائے۔“ (۱)

حضرت مولانا نے یہ بھی دکھایا ہے کہ یورپ آج قوت و اخلاق کے عدم توازن کی وجہ سے بے بسی کی حد کو پہنچ رہا ہے اور اس کے مفکرین کو یہ اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ ہمارے پاس وسائل ہیں لیکن مقاصد نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں :

”یورپ کی آج سب سے بڑی کمزوری و بے بسی یہ ہے کہ اس کے پاس وسائل اور ذرائع کا خزانہ موجود ہے لیکن نیک خواہشات اور نیک ارادوں کا فقدان ہے، وہ ایک طرف وسائل اور ذرائع میں قارون ہے، دوسری طرف نیک مقاصد میں محض مفلس اور فلاح! اس نے کائنات کے راز منکشف کیے اور

طبعی طاقتوں کو اپنا غلام بنایا، اس نے سمندروں اور فضاؤں پر فرمانروائی حاصل کی لیکن وہ اپنی خواہشات اور نفس پر قابو نہ حاصل کر سکا، اس نے کائنات کے عقدے حل کیے لیکن اپنی زندگی کی پہیلی نہ بوجھ سکا، اس نے منتشر اجزاء اور طبعی طاقتوں میں نظم و ترتیب قائم کی لیکن اپنی زندگی کا انتشار دور نہ کر سکا۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا“ (۱)

دجل و فریب

چونکہ اس تہذیب کی بنیاد ہی مادیت پر ہے اس لیے حصول لذت و نفع کے لیے اس کے سارے اصول ڈھول کا پول ہیں، بھاری بھر کم الفاظ اپنے اندر کوئی حقیقت نہیں رکھتے، نفع کے حصول کے لیے اس کے نزدیک ہر طرح کا دجل و فریب، مکاری و ملمع سازی جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے۔

حضرت مولانا نے اپنی معرکہ الآراء کتاب ”معرکہ ایمان و مادیت“ کے آغاز ہی میں مغربی تہذیب کے اس دجل و فریب کا پردہ چاک کیا ہے۔

یہ پوری کتاب حضرت مولانا نے سورہ کہف کے سایہ میں لکھی ہے اور اس میں اس سورہ شریفہ سے متعلق بہت سے وہ حقائق بھی آگئے ہیں جو عام طور پر تفسیروں میں بھی نہیں ملتے، احادیث میں اس سورہ شریفہ کے بارہ میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن اس کی تلاوت کا معمول بنائے وہ فتنہ دجال سے محفوظ رہے گا۔ حضرت مولانا نے اسی مناسبت سے اس کی تمہید میں دجال کی شخصیت کی کلید بیان کی ہے اور دجل اور دجالیت کو اس کا محور قرار دیا ہے، مغربی تہذیب کو حضرت مولانا نے اسی کا ہر اول دستہ قرار دیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں :

”عہد حاضر کی مادی تہذیب کا بھی سب سے بڑا حربہ یہی ملمع سازی اور

فریب کاری ہے، اور اس کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس نے کسی چیز کو اس کے اثر سے آزاد نہیں چھوڑا، حقائق کچھ اور ہوتے ہیں نام ان کے برعکس رکھے جاتے ہیں، اصطلاحات اور شکوہ الفاظ کا بکثرت رواج ہے، ظاہر و باطن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں، آغاز و انجام، تمہید و اختتام، علمی نظریات اور عملی تجربات میں نیک نیتی کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی جاتی ہے۔“ (۱) ”مثلاً حریت، اشتراکیت، جمہوریت، معیار زندگی کی بلندی، معاشی خوشحالی، فلاحی ریاست، انسانی حقوق، یہاں تک کہ تمدن و تہذیب، فنون لطیفہ اور قانون و دستور جیسے الفاظ صرف نعروں کے طور پر استعمال کیے جا رہے ہیں۔“ (۲)

اخلاق کی بھی اس نے دو قسمیں کر رکھی ہیں، دکھانے کے لیے اور ہیں اور برتنے کے لیے اور، حضرت مولانا اس پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں :

”یورپ کے اخلاق میں توازن نہیں، ان کی مثال وہی ہے کہ گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز، افراد کے چھوٹے چھوٹے معاملوں میں وہ بڑی ایمانداری سے کام لیتے ہیں، لیکن جب اپنی قوم کی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے تو ایسے ایماندار افراد قوموں کو نگل جاتے ہیں، انفرادی زندگی میں ان کا حال یہ ہے کہ اگر نونج کر بارہ منٹ پر آنے کا وعدہ کریں تو ٹھیک اسی وقت پہنچیں، لیکن قومی معاملات میں دوسری قوموں کو دھوکہ دینے میں انہیں ذرا سائل نہیں۔“ (۱)

(۱) معرکہ ایمان و مادیت صفحہ ۱۴-۱۵

(۲) حاشیہ معرکہ ایمان و مادیت صفحہ ۱۵: آج کے یورپ و امریکہ میں ان پر شکوہ الفاظ کی حقیقت جاننے کے لیے صرف ایک حریت ہی کو لے لیجئے۔ حقیقت میں اس سے صرف ایک طبقہ کی آزادی رائے اور اس کے نظام کی عالمی سطح پر ترویج و اشاعت مراد ہے، اگر کسی یورپین ملک میں کوئی مسلمان طالبہ کالج میں پردہ کے ساتھ جانا چاہے تو اس پر پابندی ہے۔ اکثر ملکوں میں اس کا راف پہننا بھی جرم ہے، حقیقت میں یہ لفظ کی آزادی ہے لیکن ضمیر، اخلاق اور کردار غلام ہیں اور اس سے بدرغلامی کی کوئی شکل ممکن نہیں، اس وقت امریکہ کا ماسٹر پلان یہی ہے کہ دنیا کو ان یہودیوں کا غلام بنا دیا جائے جن کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے کہ ضربت علیہم الذلۃ و المسکنة و بآء و ابغضب من اللہ (البقرة: ۶۱)

(۱) پیام انسانیت صفحہ ۴۴، فریب کی یہ بھی کوئی انتہا ہے کہ ہیر و شیماء اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے کی مصلحت یہ بیان کی گئی کہ ”پانچ لاکھ لوگوں کی جانیں اس لئے لی گئیں تاکہ ایک کروڑ کی جانیں بچائی جاسکیں۔“

غلو اور انتہا پسندی

اسلام کے توازن و اعتدال کے بالکل برخلاف اس تہذیب کی ایک بنیادی کمزوری اس کی انتہا پسندی اور غلو ہے۔

حضرت مولانا اس کمزوری کو بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :

”اسراف، مبالغہ آرائی اور انتہا پسندی اس تہذیب کی علامت اور شعار بن گئی ہے جس سے وہ اور اس کے پیروکار پہچانے جاتے ہیں۔ کمانے میں اسراف، لہو و لعب اور تفریح طبع میں اسراف، خرچ کرنے میں اسراف، سیاسی و معاشی نظریات میں اسراف، جمہوریت ہو تو اس میں غلو، آمریت ہو تو اس میں مبالغہ، اشتراکیت ہو تو اس میں انتہا پسندی، اپنے خود ساختہ قوانین اور مقرر کردہ اصول اور قدریں ہوں تو اس کی ضرورت سے زائد نقد لیں، یہاں تک کہ بال برابر اس سے ہٹنا روا نہیں ہوتا اور اس سے انحراف کرنے والا ایسا مجرم سمجھا جاتا ہے جس کے بعد وہ کسی عزت و شرافت کا مستحق اور کسی احترام کے قابل نہیں رہتا۔ یا پھر ایسی احقانہ اور مجنونانہ بغاوت جو عقل، ذوق سلیم اور فطرت انسانی سب کے لیے ناقابل قبول ہے اور جس کے بعد آدمی متمدن انسانوں کی صف سے نکل کر درندوں اور مویشیوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔“ (۱)

خالق کائنات سے بغاوت

گذشتہ سطور میں یہ بات گزر چکی ہے کہ اس تہذیب کی بنیاد ہی مذہب دشمنی پر پڑی ہے، عقیدہ آخرت سے عملی انکار اس کے خمیر میں داخل ہے اور مادیت اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی ہے اور ہر وہ چیز جو اس کی عقل میں نہ سما سکے اس سے انکار اس تہذیب کا

(۲) معرکہ ایمان و مادیت صفحہ ۶۹-۷۰۔ یہ ایک نفسیاتی بات ہے کہ ایک انتہا پسندی کے نتیجہ میں دوسری انتہا پسندی وجود میں آتی ہے، لذتیت، ہوس رانی اور خواہشات کی تکمیل میں انتہا کو پہنچے تو اس کے رد عمل میں ایک بڑا طبقہ دوسری طرف انتہا پسندی کا شکار ہوا اور اس نے تعذیب نفس کے لیے عجیب عجیب طریقے اختیار کیے۔ فرانس کی ظالمانہ و جاہلانہ شہنشاہیت اور رہبانیت کے خلاف بغاوت ہوئی تو اس کے نتیجہ میں کمیونزم وجود میں آیا، جمہوریت و اشتراکیت کی انتہا پسندانہ فکر بھی اسی کا نتیجہ ہے۔

امتياز ہے۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں :

”اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی مادی طاقت، طبعی قوتوں کی تسخیر، کائنات پر اقتدار، کفر اور مادہ پرستی کے ساتھ بالکل گھل مل گیا ہے اور یہ مغربی تہذیب کی مخصوص علامت اس کی امتیازی خصوصیت اور نمایاں پہچان بن گئی ہے، ہم کو کسی ایسی تہذیب اور تمدن کا علم نہیں جو اس درجہ مادی قوت رکھنے کے ساتھ مذہب و اخلاق سے اس درجہ برسرِ جنگ ہو، خالق کائنات اور اس کی بنائی ہوئی شریعت اور دستور و قانون کا اس طرح باغی و منکر اور مادیت کی پرستش، نفس کی غلامی اور ربوبیت کے دعویٰ میں اس طرح مبتلا ہو جس طرح یہ مغربی تہذیب!“ (۱)

یہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی خصوصیت ہے کہ انہوں نے تفصیل سے مغربی تہذیب کی خامیاں گنائی ہیں، اور اس پر بڑا مبصرانہ اور حقیقت پسندانہ تبصرہ فرمایا ہے، اور پھر جس طرح اس تہذیب نے اسلامی تہذیب و نظام پر حملے کیے ہیں اور اس کے لیے جو ذرائع اور وسائل اختیار کیے ہیں ان کو تفصیل سے بیان فرماتے ہوئے اس کے خطرات سے بچنے کی تدابیر بھی بیان فرمائی ہیں۔

اسلام پر مغرب کی یلغار

شروع ہی سے مغرب نے اسلام کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھا، اس کو پورا اندازہ تھا کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو دنیا کی قیادت کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے پاس ہر طرح کے مسائل کا حل موجود ہے، اگر اس کو ذرا بھی موقع دیا گیا تو طاقت و اقتدار یورپ کے ہاتھوں سے نکل جائے گا، اس لیے یورپ نے مسلمانوں کی طاقت کمزور کرنے اور اسلام سے ان کے رشتہ کو منقطع کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا، استعمار کے ذریعہ، تفریب اور تیشیر کے ذریعہ مستشرقین کی جماعت تیار کر کے ہر طرح انھوں نے مسلمانوں کو مجروح کرنے کی کوشش کی اور اس میں بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔

حضرت مولانا نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں جگہ جگہ ان منافذ کی نشاندہی کی ہے جہاں سے مسلمانوں کے عقیدہ یا عمل پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔

جو ممالک مغربی استعمار کا شکار ہوئے وہاں اس کی پوری کوشش کی گئی کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہنوں کو مغربی سانچے میں ڈھال دیا جائے، وہاں چونکہ مکمل کنٹرول یورپ ہی کا تھا اس لیے یہ کام بڑی آسانی سے انجام پایا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب یہ ممالک آزاد ہوئے تو ان کی زمام اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آئی جو ذہنی طور پر مغرب کے غلام تھے، تونس اور الجزائر اس کی کھلی مثالیں ہیں۔

جو اسلامی ممالک استعمار کا شکار ہونے سے بچ گئے وہ مغربی تہذیب اور فکر سے اپنے آپ کو آزاد نہیں رکھ سکے، یورپ کے مصنفین و مفکرین نے ایسا علمی و فکری مواد تیار کیا کہ اس کے مطالعہ کے بعد خود بخود دین سے اعتماد ختم ہو جاتا ہے اور اس کے لیے کسی بڑے آپریشن کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ حضرت مولانا نے اپنی تصنیفات میں اس موضوع کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔ استشر اق کے موضوع پر مولانا نے مدلل اور بسیط مقالہ تحریر فرمایا تھا جو ”اسلامیات اور مغربی مستشرقین“ کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد تصنیفات اور مضامین میں استشر اق کے سلسلہ میں حضرت مولانا نے واقعیت سے بھرپور اور متوازن گفتگو فرمائی ہے جن میں ”مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش“ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

استشر اق

استشر اق کی اپنی تاریخ ہے، یہ تحریک اسلام کے خلاف کلیسا کی سرپرستی میں شروع ہوئی تھی جس کا مقصد ہی تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کو دین سے برگشتہ کرنا تھا، اس کے لیے بڑی تعداد میں یورپ نے فضلاء تیار کیے جنہوں نے اسلامی علوم میں مہارت پیدا کی، ان موضوعات پر فاضلانہ کتابیں تصنیف کیں، لیکن ان میں اسلامی عقائد و نظریات کے خلاف ایسا مواد داخل کر دیا کہ عام ذہن کا آدمی اس کے مطالعہ کے بعد متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا، وہ ان فضلاء کی خدمات کی داد دینے پر مجبور ہوگا اور کتاب میں بین السطور اسلام کے خلاف جو

زہرافشانیاں کی گئی ہیں ان کے ادراک سے اس کا ذہن قاصر رہے گا۔ حضرت مولانا نے بڑی حقیقت پسندی اور توازن کے ساتھ اس کا جائزہ لیا ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں المعبد العالی للدعوة والفکر الاسلامی (۱) کے طلباء کو خطاب کرتے ہوئے استشراف کی مختصر تاریخ بیان فرمائی اور اس کے وجود میں آنے کے اسباب کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا :

”مغربی طاقتوں نے اپنی ذہانت سے بالکل صحیح سمجھا کہ محض فوجی برتری و اقتدار اور محض سیاسی تنظیم و استحکام اور نئے اور مؤثر اسلحہ و طریق جنگ کافی نہیں، کسی ملک کو مستقل طور پر غلام رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہاں کا تعلیم یافتہ اور مشفق طبقہ (Intellectual Class) قوت حاکمہ سے ذہنی طور پر مرعوب ہو، اس کے لیے انہوں نے مستشرقین (Orientalist) کو تیار کیا، بہت کم لوگوں نے اس راز کو سمجھا ہے کہ مستشرقین محض اپنے علمی ذوق کی بنا پر تحقیقی کام نہیں کرتے، استشراف کے پیچھے سیاسی و استعماری مقاصد کام کرتے ہیں۔“ (۲)

مستشرقین کے طریقہ کار کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

”مستشرقین کے علم و فضل کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کی وضاحت میں بھی کوئی باک نہیں کہ مستشرقین کے ایک بڑے طبقہ کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اسلامی شریعت مسلمانوں کی تاریخ اور تہذیب و تمدن میں کمزوریوں اور غلطیوں کی تلاش و جستجو میں وقت صرف کریں اور سیاسی و مذہبی اعتراض کی خاطر رائی کا پر بت بنائیں۔“ (۳)

آگے تحریر فرماتے ہیں :

”افسوس کی بات ہے کہ ہم بہت سے مستشرقین کو یہی کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی ساری کدو کاوش تاریخ اسلام، اسلامی معاشرہ، تہذیب و

(۱) دارالعلوم ندوۃ العلماء میں یہ شعبہ عرصہ سے طلبہ کی فکری تربیت کے لیے قائم ہے۔

(۲) یورپ، امریکہ اور اسرائیل صفحہ: ۱۵-۱۶

(۳) اسلامیات اور مغربی مستشرقین صفحہ: ۱۳

تمدن، اور ادب و ثقافت میں جھول اور کمزوریوں کی تلاش و نشاندہی میں صرف کرتے ہیں پھر ہولناک اور ڈرامائی انداز میں ان کو پیش کرتے ہیں، ان کی ذہانت و طباعی کا پورا مظاہرہ چہرہ اسلام کو بدنام دکھانے میں ہوتا ہے اور اسی طرح اسلامی ممالک کے زعماء و قائدین کے دماغ میں اسلام اور اسلامی قانون و تہذیب کے سرچشموں کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں اور اسلام کے مستقبل سے ناامیدی، حال سے بیزاری اور ماضی سے بدگمانی اس طرح پیدا کر دیتے ہیں کہ ان کا سارا جوش و خروش دین کو عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے (Modornization) اور اسلامی خانوں میں اصلاح و ترمیم کی مہم چلانے میں منحصر ہو کر رہ جاتا ہے۔“ (۱)

اس کے بعد مستشرقین کی نازک حکمت عملی کا تذکرہ فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

”مستشرقین نے سیرت نبوی اور تاریخ عرب کے موضوع پر جو کتابیں لکھی ہیں ان میں عہد جاہلیت اور زمانہ ماقبل اسلام کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ گویا انقلاب کا سب سامان تیار تھا، پیغمبر اسلام ﷺ نے صرف وقت شناسی سے کام لیا اور سہرا ان کے سر بندھ گیا۔“ (۲)

اپنے خطاب میں ایک جگہ مستشرقین کی حکمت عملی کو اور واضح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

”انہوں نے اپنی پوری ذہانت ایسی کتابوں کے لکھنے میں صرف کر دی جن میں صاف صاف اسلام پر حملہ نہ کیا جائے، ان کی ذہانت کی اور سمجھنے کی بات تھی کہ اسلام پر حملہ اگر ہوگا تو ایک مقابل طاقت پیدا ہو جائے گی، اس میں ایسا ہو کہ لوگ پڑھ کر دلائل کی روشنی میں (جو چالاکی کے ساتھ کتاب میں شامل کیے گئے ہیں) کتاب الہی کے بارے میں، حدیث کے بارے میں، علم و فقہ کے بارے میں، علم کلام کے بارے میں پھر آخری درجہ میں اپنی تہذیب و معاشرت کے بارے میں احساس کمتری کا شکار ہوں، جو شخص یہ کتابیں پڑھے گا

(۱) اسلامیات اور مغربی مستشرقین صفحہ ۱۳۰

(۲) ایضاً صفحہ ۱۵۰

وہ سمجھ لے گا کہ ہم تو بہت نیچی سطح پر زندگی گزار رہے تھے، ہمارے علماء نے، ہمارے مربیوں نے اور ہمارے مصنفین نے ان کمزوریوں کا اظہار نہیں کیا۔“ (۱) اس کے خطرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”اس میں بہت سے مستشرقین اپنی کتابوں اور مضامین میں زہر کی خاص مقدار بہت احتیاط سے ملا تے ہیں، جو تناسب سے بڑھنے نہ پائے اور قارئین کے لیے وحشت کا باعث نہ بنے اور ان کو بیدار اور محتاط نہ بنادے نیز ”محقق علام“ کی انصاف پسندی اور خلوص نیت مشتبہ نہ کر دے، اس طرح کے مستشرقین کی تصنیفات ان مخالف مصنفین کے مقابلہ میں زیادہ ضرر رساں اور خطرناک ہوتی ہیں جو کھل کر دشمنی کا اظہار کرتے ہیں اور جن کی کتابوں میں دجل و فریب و افترا پر دازیاں عربیاں طریقے پر نظر آتی ہیں، کیونکہ مذکورۃ الصدور کتابوں کا مطالعہ کرنے والا متوسط درجہ کا کتاب خواں ان کو پڑھنے کے بعد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ (۲)

اس کے بعد حضرت مولانا نے عالم اسلام کی یونیورسٹیوں اور دانش گاہوں کی علمی کمزوری اور پست ہمتی کا ذکر فرمایا ہے کہ انہوں نے خالص اسلامی موضوعات میں بھی مغربی مصنفین پر اعتماد کر لیا اور ان کی کتابوں کو مآخذ و مرجع قرار دیا اور وہاں تصنیف و تالیف اور ریسرچ کا کام کرنے والے مستشرقین ہی کی کتابوں پر بھروسہ کرنے لگے۔

تعلیم یافتہ طبقہ کے اس مرض کی نشاندہی کے بعد حضرت مولانا نے عالم اسلام کو بحث و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے میدان میں خود کفیل ہونے اور مستشرقین کی علمی تحقیقات کا محاسبہ و جائزہ لینے کی دعوت دی ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں :

”مستشرقین کے منفی اثرات کے ازالہ اور اس عظیم نقص کی اصلاح کے لیے علمائے اسلام، محققین و مفکرین اور مسلمان ریسرچ اسکالرز کی ذمہ داری

(۱) یورپ امریکہ اور اسرائیل صفحہ: ۱۶

(۲) اسلامیات اور مغربی مستشرقین صفحہ: ۱۶

ہے کہ وہ علمی موضوعات پر محققانہ اور ”اورینٹل“ بحثیں تیار کریں، اور عالم اسلام کو صحیح اور قابل اعتماد (معلومات اور اسلام کے صحیح تصورات اور حقائق سے) ان خوبیوں اور امتیازات کا لحاظ کرتے ہوئے جو مستشرقین کی خصوصیات سمجھی جاتی ہیں) روشناس کریں بلکہ علمی اسلوب و اصول بحث، مجتہدانہ تحقیق و وقت نظر، وسعت مطالعہ، مآخذ و مراجع کی صحت و استناد اور پرزور استدلال و استنتاج میں ان پر بھی فوقیت لے جائیں، اور ان غلطیوں اور علمی کمزوریوں سے بھی محفوظ ہوں جن کے عام طور پر مستشرقین شکار ہوتے ہیں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان علماء و محققین مستشرقین کی تصنیفات و علمی تحقیقات کا جائزہ لیں اور حقائق و واقعات کی روشنی میں ان کا علمی محاسبہ کریں، ان کی دسیسہ کاریوں اور عربی عبارتوں کے مفہوم سمجھنے یا ان کی تحلیل و تشریح میں ان کی غلطیوں کی نشاندہی کریں جس سے قارئین کو یہ معلوم ہو کہ جن مراجع و مآخذ پر وہ اعتماد کرتے ہیں، وہ ناقابل اعتماد ہیں۔ انہوں نے ان سے جو اہم نتائج نکالے ہیں اور ان پر اپنے دعوے کی پوری عمارتیں قائم کر لی ہیں۔ ان کی بنیاد ہی کمزور و مشکوک یا سرے سے معدوم ہے، اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دکھائیں کہ ان کی ان معصومانہ علمی کاوشوں میں سیاسی و مذہبی اغراض و مقاصد کہاں تک کام کر رہے ہیں۔

لیکن صرف یہ ناقدانہ اور سلبی کام کافی نہیں ہے، مثبت اور تعمیری کام بھی ناگزیر ہے، اس کی فوری ضرورت ہے کہ اسلامی موضوعات پر عمیق و فکر انگیز معلومات اور محققانہ علمی کام کا سلسلہ جاری رہے جو تحلیل و تجزیہ، مآخذ و مراجع کے دیانت دارانہ حوالہ اور مفید و متنوع تفصیلی انڈکس سے (جو مستشرقین کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے) معمور ہو، اس سلسلہ میں ایسے مواد اور کتابوں سے بھی استفادہ کیا جائے جن کی طرف بادی النظر میں ذہن نہیں جاتا اور جن کا موضوع سے براہ راست تعلق نہیں ہوتا اور نہ روایتی طور پر وہ تاریخی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔“ (۱)

ان دونوں کاموں کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

”جب تک یہ دونوں کام نہ انجام دیئے جائیں گے اس وقت تک عالم اسلام کا وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو ذہین اور حوصلہ مند نوجوانوں پر مشتمل ہے اور جو یورپ و امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پا رہا ہے، یا خود اپنے ملک میں اسلام کا مطالعہ پور پین زبانوں میں کرنے کا عادی ہے، مستشرقین کے مسموم افکار اور ان کی دشمنی غلامی سے آزاد نہیں ہو سکتا۔“ (۱)

مغربی تہذیب کے خلاف مختلف ملکوں میں حضرت مولانا کی کوششیں

مغربی تہذیب کے بنیادی، اصولی اور عمومی جائزہ اور محاسبہ کے علاوہ حضرت مولانا نے دنیا کے مختلف ملکوں میں اس تہذیب کے فروغ و ارتقاء اور وہاں پڑنے والے اس کے نقصانات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ (۲) اور اس کی روشنی میں وہاں بسنے والے مسلمانوں کو خاص طور پر ضروری ہدایات اور مشورے دیے ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا نے ہر طبقہ کے لوگوں کو خطاب کیا ہے، حکام و سلاطین کو بھی مشورے دیے ہیں، تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی سمجھوڑا ہے اور عام لوگوں کی بھی رہنمائی فرمائی ہے۔

اہل سلطنت و حکومت کی حضرت مولانا نے جس اسلوب میں رہنمائی فرمائی ہے وہ حضرت مولانا کی دعوت و فکر کا ایک مستقل باب ہے، اسی لیے اس کو علاحدہ تفصیل سے ذکر کیا جائے گا۔

یہاں صرف تعلیم یافتہ طبقہ اور عوام کی مولانا نے جس انداز سے رہنمائی فرمائی اور ان کے سامنے مغربی تہذیب کے نقصانات واضح فرمائے۔ ان کو قدرے تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے :

(۱) اسلامیات اور مغربی مستشرقین صفحہ: ۲۰

(۲) اس موضوع پر حضرت مولانا کی سب سے مفید، اہم اور پر مغز تصنیف ”الصراع بین الفکر الاسلامیہ والفکر الغربیہ“ (مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش) ہے جس میں حضرت مولانا نے مختلف ملکوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے، اور قیمتی مشورے دیے ہیں۔ حضرت مولانا کی فکری کتابوں میں ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین کے بعد اس کتاب کو خاص مقام حاصل ہے، مولانا کی فکر کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

سعودی عرب

۔ نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا

محمد عربیؐ سے ہے عالم عربی

عالم عربی کی اصل پہچان حضرت محمد عربیؐ روحی فداۃ سے ہے، حضور ﷺ سے وابستگی ہی اس کا اصل امتیاز ہے، وہیں سے دنیا کو روشنی ملی، دین و ایمان ملا، انسانیت کو رہنمائی ملی، تہذیب کی شمعیں روشن ہوئیں، انسان کو انسانیت کا مزہ آیا۔ اگر اس کا یہی امتیاز باقی نہ رہے تو دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح وہ بھی ایک ملک ہے جہاں عربی بولی جاتی ہے اور سمجھی جاتی ہے اور اس کے سوا اس کی کوئی خصوصیت نہیں۔

یورپ نے یہ حقیقت سمجھ لی اور یہ کوشش کی کہ مرکز اسلام اور مہبط وحی کو اپنی اصل سے کاٹ دیا جائے اور اس کے لیے اس نے مصر کا انتخاب کیا جو دنیا کے اسلام کی قدیم ترین یونیورسٹی ”الازھر“ کی وجہ سے عالم عربی پر چھایا ہوا تھا، عرب ملکوں میں جو لٹریچر مصر سے آتا اس کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی تھی۔ مصر کو ”کناتہ الاسلام“ کہا جاتا ہے۔ اس نے تاریخ کے مختلف ادوار میں اسلام اور عالم اسلام کی حفاظت کی، فوجی، اور علمی اور تمدنی میدان میں مصر اسلام کا قلعہ تھا اسی لیے یورپ کے ایک قائد نے مصر کو مشرق پر برتری حاصل کرنے کے لیے مدخل قرار دیا اور اس کی تسخیر کے لیے متعدد کوششیں کیں لیکن مصر نے ان کو ناکام بنا دیا صلاح الدین ایوبی نے مصر کے حاکم کی حیثیت سے بیت المقدس فتح کیا، لوٹس تاسع کو مصر میں شکست ہوئی، اور گرفتار ہوا، آخر میں نپولین بھی تین سال سے زائد قیام نہ کر سکا۔

مصر میں فرانسیسی استعمار کے دوران اس کی پوری کوشش کی گئی کہ نئی نسل کے ذہنوں کو مغربی بنادیا جائے۔ محمد علی پاشا جو اگرچہ مختصر مدت رہا، نے فرانسیسی فوجوں کو ملک سے نکلنے پر مجبور کیا۔ مگر مغرب سے ثقافتی روابط قائم رکھے، مصری نوجوان مغربی ملکوں میں تعلیم کے لیے بھیجے جاتے، جو مغربی افکار و نظریات کے ساتھ واپس آتے۔ اسی جماعت میں رفاعہ بک طہطاوی جنہوں نے مغربی طرز کے ادارے قائم کئے اور مغربی ادب کو عربی میں منتقل کیا، مغربی زبانوں کے لیے مدرسہ ”الاسن“ قائم کیا۔ مصر کی حیثیت یورپ کے ایک شاگرد، مقلد

یا خوشا چیں کی ہو کر رہ گئی تھی، اس کا نتیجہ یہی نکلا کہ آہستہ آہستہ مصر مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھلتا گیا اور تعلیم و ثقافت میں برتری کی وجہ سے مصر دوسرے عرب ملکوں کے لیے نمونہ بن گیا۔ حجاز مقدس بھی اس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکا۔

حضرت مولانا نے اپنے پہلے ہی سفر حج میں یہ تبدیلی محسوس فرمائی تھی اور یہ اندازہ کر لیا تھا کہ اب سعودی عرب بھی مصر و شام کے راستے پر ہے۔ حضرت مولانا کی نظر میں اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ جس دعوت و تحریک کے نام پر مملکت کا وجود عمل میں آیا اس کو وہاں فراموش کر دیا گیا۔ مولانا نے امیر سعود کے نام ایک طویل اور مدلل مکتوب اسی سفر میں تحریر فرمایا تھا۔ جس کی تفصیل انشاء اللہ دوسرے باب میں پیش کی جائے گی۔

مغربی تہذیب کے اثرات وہاں تیزی کے ساتھ بڑھ رہے تھے۔ حضرت مولانا نے دوسرے سفر میں اس کو جس طرح محسوس کیا برادر معظم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے نام اپنے ایک مکتوب میں اس کا نقشہ ان الفاظ میں بھی ہے :

”۱۹۴۷ء میں ہم پہلی بار آئے تھے، اب ۱۹۵۰ء ہے، ان تین برسوں میں کھلا ہوا تغیر محسوس ہوتا ہے، بازار سے لے کر لوگوں کے دماغوں تک، مغربی تمدن، تجارت و معاشیات اور افکار و خیالات کے بچے اور زیادہ گڑ چکے ہیں، جدہ اترتے ہی اس کا احساس ہوتا ہے اور جس قدر حالات سے واقفیت ہوتی ہے اتنا ہی اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے، کوئی نہیں جانتا کہ خوبصورت عربی لباس میں کتنے دل اور دماغ مغربی بن چکے ہیں اور قرآنی زبان کتنے مغربی خیالات اور خالص مادی نفسیات کا ذریعہ اظہار بنتی ہے، معاش کا انہماک، دولت آفرینی، عزت طلبی بحرانی حد تک پہنچ گئی ہے، زندگی کا تصور اس کے بغیر ممکن نہیں کہ امریکہ کے سایہ میں پناہ لی جائے اور ترقی کی جائے۔“ (۱)

یہ تجزیہ، تجزیہ نگار کی بصیرت و طباعی، حقیقت رسی اور دردمندی و دلسوزی کا بڑا مظہر ہے۔ حضرت مولانا نے صرف تجزیہ پر بس نہیں کیا بلکہ اپنے دعوتی و فکری ذہن و مزاج کے ساتھ اس کے علاج کی تدبیر بھی فرمائی، وہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں صحیح دینی فکر منتقل

کرنے کی پوری کوشش کی، ملاقاتوں کے ذریعہ، تحریر و تقریر کے ذریعہ، اجتماعات کے ذریعہ۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ طاقتور تقریریں ”بین العالم و جزیرۃ العرب“ کے عنوان سے ریڈیو پر کی گئی، پہلی تقریر کا عنوان تھا ”من العالم الی جزیرۃ العرب“ (دنیا کی گفتگو جزیرۃ العرب سے) اس میں حضرت مولانا نے دنیا کی زبانی جزیرۃ العرب کے سامنے حقائق بیان کیے ہیں، اور اس کی خوش فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

دنیا جزیرۃ العرب کو خطاب کر کے کہتی ہے :

”اے جزیرۃ العرب! جب تمہاری نظر ہماری طرف پڑتی ہے تو شرم سے جھک جاتی ہے اور جب تم خود اپنا مشاہدہ کرتے ہو تو حقارت آمیز نگاہ کے ساتھ، تمہاری نظر نئی ایجادات و اکتشافات پر ہے، قوتوں کی تسخیر پر ہے، اور اس اخیر دور میں انسان نے جس طرح ایٹمی طاقت کو اپنے قبضہ میں کر لیا ہے اس سے تمہاری نگاہ خیرہ ہوئی جاتی ہے، قدرے ہمت کر کے شرمندگی اور اعتراف کے ساتھ تم یہ کہتے ہو کہ جب سے دنیا میری رہنمائی و سرپرستی سے الگ ہوئی علم و تمدن میں وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

ذرا ہوش کے ناخن لو اور غور کرو! یہ ہوا میں اڑنے والا اور سمندر کی موجوں سے کھیلنے والا انسان اپنے اخلاق اور معاشرتی حس میں، تعصب و تنگ نظری میں ایک چھوٹے سے بچہ کی طرح ہے جو ظاہری شکلوں اور صورتوں کو حقیقتوں پر ترجیح دیتا ہے، کھیل اور تفریح کا دلدادہ ہوتا ہے۔

اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ صورت کے پیچھے حقیقت کیا ہے تو ڈھول کا پول سامنے آجائے اور تمہیں یقین ہو جائے کہ آج بھی انسانیت وہیں ہے جہاں تم نے اس کو چھوڑا تھا، بلاشبہ پرندہ کی طرح اس کو فضا میں اڑنا بھی آگیا اور مچھلی کی طرح پانی میں تیرنا بھی، لیکن انسانوں کی طرح زمین پر چلنے کا اب بھی اس کو سلیقہ نہیں۔

اے جزیرۃ العرب! تمہیں ہماری آباد دانش گاہوں، کتابوں سے پٹے ہوئے

کتب خانوں، اشاعتی اداروں، تصنیف و تالیف کے مراکز پر حیرت ہے اور اس باغ و بہار ادب کو داد و تحسین کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہو جو ہر دن نئے نئے گل کھلاتا ہے!! فوراً فیصلہ مت کرو، ان تمام چیزوں کے پیچھے جو اصل قوت محرکہ ہے وہ صرف بینک بینکس بڑھانا ہے، کتنے قلمکار ہیں جو لوگوں کے اخلاق و کردار کی تجارت کر رہے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ معاشرہ میں عریانیت اور فحاشی پھیل جائے، اس بات سے تمہیں ذرا تعجب نہ ہونا چاہئے کہ بڑے بڑے دانشور اور ادباء اخلاقی قوت برداشت اور عفت میں ان بدوؤں سے بھی گئے گزر رہے ہیں جن کو قساوت و جہالت کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔

اے جزیرۃ العرب! میں دیکھتی ہوں کہ ان بھاری بھرکم اصطلاحات پر تمہارے کان کھڑے ہو جاتے ہیں، معاشرتی انصاف، مساوات، آزادی اور جمہوریت یہ وہ الفاظ ہیں کہ ان کو بولتے بولتے سیاسی لیڈروں کی زبانیں نہیں تھکتیں، صحافیوں کے قلم کی نوک پر یہ الفاظ رہتے ہیں لیکن کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ یہ الفاظ اپنے اندر کچھ حقیقی مفہوم رکھتے ہیں اور دنیا پر اس کا کچھ اثر پڑتا ہے جیسے پہلے کوئی بات کہی جاتی تھی تو اپنے اندر حقیقت رکھتی تھی اور آدمی ناپ تول کر زبان کھولتا تھا؟؟ یہ سب خواب و خیال کی باتیں ہو کر رہ گئیں، زمانہ ”ترقی“ کر گیا، کتنی باتیں کہی جاتی ہیں جو بالکل بے حقیقت ہوتی ہیں، اب اگر کوئی ان ظاہری باتوں پر اعتماد کرتا ہے اور ان کو سچ سمجھتا ہے تو اس کا خدا ہی خیر کرے۔

ظاہری راحت و آرام، مسرت و اطمینان کو دیکھ تمہیں رشک آرہا ہے، میرے پھولے ہوئے جسم کو دیکھ کر تمہیں صحت کا گمان ہوتا ہے! درحقیقت یہ ورم ہے جو بیماری کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، ایک ناواقف انسان اس کو تندرستی سمجھتا ہے جب کہ میں سخت بیماری میں مبتلا ہوں، میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے، میں طرح طرح کے امراض کا شکار ہوں، میں اپنا دکھ کس طرح بیان کروں، میرے ارد گرد ایسے ڈاکٹر ہیں جو مرض کا مداوا مرض سے کر رہے ہیں، آپریشن کے نام پر انہوں نے

میرے جسم پر گھرے گھرے گھاؤ کر دیے ہیں، خدا ہی ان کو ہلاک کرے، میری ہلاکت میں تو انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

اقتصادی مشکلات کا علاج ان کو ضبط ولادت میں نظر آتا ہے، مال میں بے جا تصرفات پر روک لگانے کے لیے انہوں نے شخصی ملکیت ہی کو حرام قرار دے دیا، افراد کی ظلم و زیادتی کو ختم کرنے کے نام پر انہوں نے جماعتوں کی ساری زیادتیاں روا کر دیں، شخصی اختکار کی جگہ کمپنی کے اختکار کو دے دی گئی، ظالمانہ کمپیونلزم کا علاج کمپیونزم سے کیا گیا جو سرے سے کمر ہی توڑ دیتا ہے، کمپیونزم کی خرابیاں دور کرنے کے لیے اندھی بہری جمہوریت کو فروغ دیا گیا، حاصل یہ ہے کہ جس مرض پر انہوں نے ہاتھ رکھا دوسرا مرض پیدا کر دیا، ظلم و اسراف کا علاج بھی کیا تو ظلم و اسراف ہی سے، ایک جہالت ختم کی اس کی جگہ دوسری جہالت پیدا کر دی، میرے اندر انہوں نے امراض ہی امراض بھر دیے اور مجھے زار و نزار کر دیا۔“ (۱)

پھر یہ دنیا بڑے درد اور بے چارگی کے ساتھ جزیرۃ العرب سے کہتی ہے :

”اے جزیرۃ العرب! میں اپنی ساری بیماریوں کے ساتھ تمہارے سامنے حاضر ہوں، میں نے ایک ایک چیز کھول کر بیان کر دی، تم نے پہلے بھی میری مدد کی تھی اور سرخ موت سے مجھے بچایا تھا، آج پھر میں مدد کی طلبگار ہوں، اور آج بھی مجھے اسی طرح مدد کی ضرورت ہے جس طرح اس دن تم نے میری دنیا پار لگائی تھی جب تمہارے رسول دنیا میں تشریف لائے تھے، اور روشنی کی کرن آپ ﷺ نے مجھ پر ڈالی تھی۔

اے جزیرۃ العرب! میں تم پر قربان، میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب مجھ سے لے لو، میری ساری کمائی تمہاری نذر، مجھے تو بس ایمان کی بھیک دے دو، یہ مجھے بازاروں میں نہیں ملتا، بڑے سے بڑے کارخانے انوکھے سے انوکھا مال تیار کرنے کے باوجود اس کو تیار نہیں کر سکتے، یہ مجھے اپنے وسیع کتب خانوں سے

بھی نہیں مل سکتا، میرے بڑے بڑے فلاسفر، تھنکر، لیڈر اور رائٹر بھی اس کو فراہم کرنے سے عاجز ہیں، یہ ایمان تو ساری دنیا کو صرف اس نبی امی کے ذریعہ ملا جو تمہاری گود میں ہے، مرنے کے بعد اس کو دوبارہ زندگی ملی، وہ اندھی ہو چکی تھی، یہ صرف اس نبی امی کا فیض ہے کہ اس کی آنکھوں میں روشنی اور چمک پیدا ہوئی، اس کی چول اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی وہ اپنی جگہ پر آ گئی، دنیا میں اگر کسی کو ایمان کا شمع بھی ملا تو اس نبی ﷺ کے صدقہ میں ملا اور قیامت تک اگر کسی کو ملے گا تو آپ ﷺ کے واسطہ سے ہی ملے گا، اسی کے لیے میں بھی تمہارے سامنے کا سہ گدائی لیے کھڑی ہوں، تم مجھے ناکام و نامراد نہ کرنا۔“ (۱)

پھر وہ بڑی عاجزی کے ساتھ فریاد کرتی ہے۔

”فیضان محمدی ﷺ کے کچھ قطرے ہی مجھے دے دو، اس کے ذریعہ سے میں اپنی مشکلات حل کر لوں اور الجھی ہوئی اپنی گتھیاں سلجھا لوں، میرے مردہ دل میں کچھ جان پڑ جائے اور اس کے ذریعہ سے ہی مادیت کی اس آگ کو بجھا سکوں جس نے پورے تمدن کو بلکہ پوری انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ تم نے بے شک پٹرول دے کر مجھے مالا مال کیا ہے، اس سے میری مشینیں اور گاڑیاں چلتی ہیں، مجھے اس کا اعتراف ہے مگر مجھے تو کچھ اور ہی چیز مطلوب ہے جو اس سے بہت قیمتی ہے، مجھے تو یہ انتظار ہے کہ زندگی کی گاڑی دلدل میں پھنس گئی ہے تم اس کو نکال دو اور صحیح رخ پر ڈال دو تا کہ اس کے سوار نجات پاسکیں، بڑے بڑے حکماء اور اصحاب فن عاجز آ چکے، اب تمہارے پاس جو نبوت کی حکمت اور ایمان و یقین اور رسالت کی باقی ماندہ قوت ہے اس کے ذریعہ سے جو ناؤ گرداب میں پھنس گئی ہے اس کو پار لگا دو اور اسلامی شریعت و ہدایات کی روشنی میں اس کو صحیح راستہ پر ڈال دو۔

تمہیں یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہئے کہ تم میرا ہی ایک حصہ ہو، میرا ہر برا بھلا ضرور تم پر اثر ڈالے گا، میری گرم لپٹیں تمہیں جھلسائیں گی اور ٹھنڈی ہوائیں

تمہیں آرام پہنچائیں گی، تم مجھ سے علاحدہ ہو کر نہیں رہ سکتے، اگر تم نے میری فکر کی اور مجھے سنوارا تو خود اپنے اوپر احسان کیا اور اگر پہلو تہی کی تو خود مصیبت مول لی۔“ (۱)

عالم عربی پر مغربی تہذیب کے اثرات کا حضرت مولانا نے اپنی اس پہلی تقریر میں جس بلیغ انداز میں جائزہ پیش کیا ہے اس کو حضرت مولانا کی فکر کا متن کہا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد دوسری تقریر ”من جزیرۃ العرب الی العالم“ (دنیا کو جزیرۃ العرب کا جواب) کے عنوان سے فرمائی جس میں عالم عربی دنیا کو اس کی گفتگو کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے :

”آپ نے بے شک اپنے ایک جز کو مخاطب کیا جو آپ کے رنج و الم میں پوری طرح شریک ہے، دنیا کی قیادت کا تذکرہ کر کے آپ نے وہ زمانہ یاد دلایا کہ جب بھی میں اس کو یاد کرتا ہوں تو غم و اندوہ کے بادل مجھ پر چھا جاتے ہیں۔ پہلے میری حیثیت ہی کیا تھی! آپ کے بڑے متمدن لوگ مجھے لائق اعتناء بھی نہیں سمجھتے تھے، حالانکہ خود ان کا حال یہ تھا کہ زندگی کی کوئی رقم ان میں باقی نہیں رہی تھی، انبیاء کی تعلیمات فراموش کی جا چکی تھیں، میرا حال بھی غیر ہو رہا تھا، اللہ تعالیٰ کو انسانیت پر ترس آیا اور اس نے مجھ میں ایک رسول بھیجا جن کا وجود انسانیت کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک اور دنیا کے لیے باعث زیب و زینت تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو بعثت سے سرفراز فرمایا اور انہوں نے قوم کی ایسی تربیت کی کہ وہ عجیب و غریب صفات کی حامل بن گئی۔ یہیں سے میرے اندر ایمان کا کرنٹ دوڑ گیا اور ایک غیر معمولی طاقت پیدا ہو گئی۔ جب میں آگے بڑھا تو آپ نے مجھے بھی طالع آزمایا، بادشاہوں اور ملک و بادشاہت کے طالب جنگ کرنے والوں میں سمجھا اور پوری طرح میرا مقابلہ کیا، جب کہ میرا مقصد صرف آپ کو بت پرستی کے روگ سے اور تمدن کی خرابیوں سے نکالنا تھا، آپ نے مقابلہ کی بڑی کوشش کی لیکن آہستہ آہستہ مادیت کی برف پگھلی شروع ہوئی اور

ایمان کی حرارت کے آگے وہ پوری تحلیل ہو کر رہ گئی۔ پھر جب آپ نے میرے پیغام پر غور کیا تو آپ کو اندازہ ہوا کہ دین و دنیا کی بھلائی اسی میں مضمر ہے، یہی سلامتی اور علم و عقل کا پیغام ہے، تمدن کی اساس ہے اور انسانیت کی معراج ہے۔ پھر پوری طرح آپ نے سپر ڈال دی اور یہ نظام قبول کر لیا۔

پھر فتوحات کا دروازہ کھل گیا، مال غنیمت کے انبار لگ گئے، دنیا کے خزانے میرے قدموں میں آنے لگے، مجھے کہاں ان چیزوں سے سابقہ پڑا تھا، یہ دیکھ کر میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں ایمان کی آگ بجھنے لگی، روح ٹھنڈی پڑ گئی۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے

مسلمان نہیں را کھ کا ڈھیر ہے

مجھ پر ایسا زوال آیا کہ زندگی کے میدان میں میرا رہنا مشکل ہو گیا، میں نے اپنا بستر الپینا اور گوشہ عافیت سنبھالا، لیکن یہ ایسا عالمی حادثہ تھا اور انسانیت کے لیے ایسا عمومی خسارہ تھا کہ قومیں شتر بے مہار بن گئیں۔

لوگ علوم و تمدن، سیاست میں ادھر ادھر بھٹکنے لگے، انہوں نے بڑے بڑے وسائل اور طاقتیں ایجاد کر لیں لیکن ایمان و اخلاق کو مذاق سمجھا، آپ کی ترقی میں ایسی کجی پیدا ہو گئی جس نے نظام کو بگاڑ کر رکھ دیا، آپ کو جو بھی شکایتیں ہیں وہ اسی عدم توازن کا نتیجہ ہیں۔“ (۱)

اخیر میں جزیرۃ العرب بڑے جوش کے ساتھ دنیا کو مخاطب کر کے کہتا ہے :

”آپ کے سر میں مادیت کا ایسا سودا سما یا کہ آپ نے میرے اندر صرف خزانے تلاش کیے، آپ کو صرف پٹرول کے ان چشموں کی فکر تھی جو میرے اندر جاری ہیں، ہم نے کبھی آپ کو محروم نہیں کیا، ہمیشہ آپ کی پیاس بجھائی، مسائل کو اس کی طلب و ہمت کے بقدر ہی ملتا ہے، آج آپ ایسی چیز کا سوال لے کر آئے ہیں جو سب سے زیادہ قیمتی اور بلند ہے اور انسانیت کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش ہے۔ آپ مجھ سے رہنمائی چاہتے ہیں، میں آپ کا تہہ دل سے استقبال

کرتا ہوں، آپ کے سامنے دین سماوی اور وحی الہی کا چشمہ صافی رواں دواں ہے، جس کی پوری مدت میں نے حفاظت کی ہے، اس سے خوب خوب سیراب ہوئے، ایمان و یقین کی اپنی پیاس بجھائیے، خوش بخت زندگی اور علم کے صحیح گر سیکھے عمل صالح اور اخلاق حسنہ کی تعلیم لیجئے، ہر چھوٹی بڑی چیز کے بارے میں صحیح رہنمائی حاصل کیجئے، یہ رہنمائی صرف ایمان ہی سے ملے گی، چشمہ صافی سے حقیقت ایمان کا جام پی کر طاقت و نشاط اور زندگی پیدا کیجئے، روشنی اور شباب کے نکھار کے ساتھ سامنے آجائیے اور ایسی تاریک اور بیمار دنیا کا بدل بن جائیے جو زندگی و روح سے خالی ہو چکی ہو اور اس پر بڑھا پا طاری ہے اور اس کے پاس انسانیت کے لیے کوئی پیغام نہیں۔“ (۱)

یہ دونوں تقریریں حضرت مولانا کی فکر و نظر اور اسلوب بیان کا شاہکار کہی جاسکتی ہیں۔ ان میں حضرت مولانا نے مغربی تہذیب کی خرابیوں کو جس حکیمانہ انداز سے بیان فرمایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں عقل کو بھی غذا فراہم کی گئی ہے اور قلب کو بھی گرمایا گیا ہے۔ اسی طرح یہ عالم عربی میں حضرت مولانا کی اس دعوت و فکر کی تمہید بھی ہے جو پوری وسعت اور گہرائی کے ساتھ نصف صدی پر محیط ہے۔

مولانا کی ان تقریروں اور ملاقاتوں کا نو جوانوں اور تعلیم یافتہ طبقہ پر اچھا اثر پڑا، اور ایک نئی فکر ان میں پیدا ہوئی۔

مصر و شام

حضرت مولانا کو اس کا پورا اندازہ ہو گیا تھا کہ اس وقت عالم عربی کی قیادت مصر کے پاس ہے اور وہاں سے جو چیز بھی آتی ہے وہ قیمتی سمجھی جاتی ہے، یورپ اس سے پورا فائدہ اٹھا رہا تھا اور اس نے مصر کو اپنی کوششوں کا مرکز بنا رکھا تھا اور اسی کے راستہ سے مغربی تہذیب و فکر عالم عربی میں منتقل ہو رہی تھی۔ مولانا نے ضروری سمجھا کہ مصر کا سفر کر کے وہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں کو متوجہ کیا جائے۔

اپنے دوسرے سفر حجاز ہی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہیں سے مولانا نے مصر کا رخ فرمایا، وہاں علم و ادب اور دعوت و فکر کے چوٹی کے لوگوں سے ملاقاتیں فرمائیں۔ مولانا کی معرکۃ الآراء تصنیف ”ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین“ کچھ ہی ماہ پہلے وہاں چھپی تھی، اس کو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس طرح وہ کتاب حضرت مولانا کے لیے ایک وژیننگ کارڈ کی طرح ثابت ہوئی۔ مولانا نے وہاں کی یونیورسٹیوں، کالجوں اور دینی مدارس و معابد کا بھی مشاہدہ فرمایا، نظام تعلیم بھی دیکھا، اجتماعی تقریبات میں بھی شرکت فرمائی۔ مولانا نے محسوس فرمایا کہ ہر جگہ اپنی اپنی سطح کے اعتبار سے مغربی نظام و فکر کی حکمرانی ہے۔ مخلوط نظام تعلیم کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

”مخلوط تعلیم ترقی یافتہ یونیورسٹیوں کا فیشن اور آزادی و تہذیب کی علامت بن چکی ہے، یہ ذہنیت اتنی آگے بڑھ چکی ہے کہ پڑھے لکھے لوگ اس موضوع پر تنقید کا ایک لفظ نہیں سنا چاہتے۔ اس کے جو نتائج ہیں وہ اپنی جگہ پر، جو شخص ان پڑھے لکھے لوگوں سے اس کے بعد بھی خیر کی توقع کرے اس سے اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے۔“

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
بعدی گوئی کہ دامن تر کمن ہشیار باش“ (۱)

مغربی تہذیب کے اثرات اس قدر گہرے پڑ چکے تھے کہ اسلامی تمدن اس کے اوٹ میں چھپ گیا تھا اور نئی نسل ایسی تیار ہو گئی تھی جو نہ عمل کے اعتبار سے مسلمان تھی اور نہ اسلام پر اس کو اعتماد باقی رہ گیا تھا اور مغربی تہذیب سے بھی اس نے وہ اجزاء نہیں لیے تھے جو ترقی کی راہ میں سنگ میل ثابت ہو سکتے تھے۔ لارڈ کرومر (Cromer) نے جو ایک ایسے جدید مصر کی تشکیل کا سب سے بڑا مغربی داعی تھا جو اسلام کے برائے نام رشتہ کے ساتھ مغربی افکار و اقتدار کا حلقہ بگوش و علمبردار ہو، اس طبقہ کی اعتقادی، ذہنی اور اخلاقی کیفیت کی تصویر کشی کی ہے اور بڑی خوبی کے ساتھ دکھایا ہے کہ مغربی تعلیم کی چکی میں پس کر کس طرح ایک ایسی نئی مخلوق پیدا ہوئی ہے جو نہ پورے طور پر مسلمان ہے نہ مغربی۔ وہ لکھتا ہے :

(۱) شرق اوسط کی ڈائری صفحہ: ۱۶۵-۱۶۶ کچھ تلخیص کے ساتھ

”مصری معاشرہ تیزی کے ساتھ تغیر پذیر ہے جس کا فطری نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک ایسے افراد کی جماعت پیدا ہو گئی ہے، جو مسلمان ہیں تو اسلامی تہذیب سے عاری اور اگر یورپین ہیں تو کمر شکستہ (کنزور اور یورپی صفات سے بھی محروم یورپ کا اثر یافتہ مصری بسا اوقات برائے نام تو مسلمان رہتا ہے لیکن فی الحقیقت عموماً وہ منکر الہیات ہوتا ہے۔“ (۱)

آگے وہ لکھتا ہے :

”مصری آزاد خیال اس سے (یعنی یورپین آزاد خیال) سے بھی آگے بڑھا ہوا ہوتا ہے، وہ اپنے آپ کو ایک ایسے طوفانی سمندر میں پاتا ہے جہاں نہ کشتی ہے اور نہ ناخدا، نہ تو اس کا ماضی اور نہ اس کا حال ہی اس پر کوئی پر زور اخلاقی رکاوٹیں حائل کرتا ہے۔“ (۲)

حضرت مولانا نے ان حالات کا پورا مطالعہ کیا اور پھر اہل فکر علماء کو متوجہ کیا، اس کے لیے جا بجا تقریریں کیں اور مضامین لکھے۔

مصر میں چھ ماہ کے طویل قیام کے دوران سعودی عرب میں ریڈیو پر کی گئی تقریریں بھی شائع ہوئیں، اور بھی متعدد دعوتی و فکری رسائل شائع ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ لیے گئے، وہاں کی دینی جماعتوں اور قائدین نے ان میں اپنی حکایت دل محسوس کی۔

”اسمعی یا مصر“ کے نام سے حضرت مولانا نے مصر کو جو پیغام دیا اس کو سن کر متعدد چوٹی کے اصحاب فکر و دعوت علماء نے کہا کہ ”کاش مصر سن لے!“

مصر کی تاریخی جغرافیائی اور دینی حیثیت کے اعتراف و اظہار کے بعد حضرت مولانا نے فرمایا :

”آپ دونوں ثقافتوں کا سنگم ہیں، آپ کے ایک جانب اسلامی ثقافت کا مرکز ہے تو دوسری جانب مغربی ثقافت کا، آپ پر دو براعظموں ایشیا اور یورپ کی ذمہ داری ہے اور آپ دونوں ثقافتوں کا پیغام رکھتے ہیں، آپ کا کام یہ ہونا

(۱) مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش صفحہ ۱۳۲

(۲) ایضاً صفحہ ۱۳۳

چاہیے کہ یورپ کے علم و تجربات کو آپ ایشیا اور عرب ملکوں میں منتقل کریں اور دوسری بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ جزیرۃ العرب کے پیغام کو یورپ تک پہنچائیں۔“ (۱)

وہاں کے اہم ترین لوگوں سے تبادلہ خیال کے دوران حضرت مولانا نے متعدد حضرات کے سامنے مغربی فکر کے بارے میں اپنا متوازن نظریہ پیش فرمایا۔ اہم مجالس میں خطاب کے موقع پر بھی حضرت مولانا نے بڑی صراحت کے ساتھ عالم عربی میں مصر کی اہمیت و کردار کا ذکر کر کے فرمایا: ”اس وقت مصر کی بڑی ذمہ داری ہے، اگر وہ اس کو اچھی طرح سمجھ لے تو بہتر تبدیلی کی توقع کی جاسکتی ہے۔“ ”جمعية الشبان المسلمين کی ایک تقریر میں یورپ کے بارے میں فرمایا :

”وہ اس پکے ہوئے پھل کی طرح ہے جو اب اور تب گرنا چاہتا ہے اور دنیائے انسانیت دورا ہے پرکھڑی ہے۔“

خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح
دیکھئے گرتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

یہ اسلامی قیادت کا دور ہے، اب اگر مسلمان آگے بڑھتے ہیں اور گم کردہ راہ دنیا کی قیادت سنبھالتے ہیں تو ٹھیک ورنہ دنیا دوسرا رخ اختیار کرے گی۔“ (۲)

مصر سے حضرت مولانا فلسطین، شام اور سوڈان بھی تشریف لے گئے۔ وہاں بھی مولانا نے مادیت کے اثرات پائے جو مغرب کی دین ہے۔

دوران سفر بحری جہاز میں فجر کی اذان ہوئی۔ مسافروں کی تعداد کم ہونے کے باوجود بھی وہ سب کو بیدار نہ کر سکی، مولانا نے ان الفاظ میں اس پر اپنے تاثر کو قلمبند فرمایا ہے :

”یہ وہی آواز تھی جس نے کبھی سارے عالم کو بیدار کر دیا تھا، بحر و بر میں زندگی کی روح پھونک دی تھی۔ لیکن اس وقت یہ آواز جہاز کے سب مسافروں کو بھی نہ جگاسکی جو بہت تھوڑے تھے۔ کتنی دلخراش حقیقت ہے کہ اذان اپنی قوت و

(۱) العرب والاسلام صفحہ: ۳۱-۳۲ ترجمہ و تلخیص

(۲) شرق اوسط کی ڈائری صفحہ: ۱۷۷

طاقت اور دلوں پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت اس حد تک کھوپچکی ہے کہ اس کی روحانی قوت و تاثیر کو سب سے زیادہ جس چیز نے کمزور و بے اثر کیا ہے وہ مغرب کی مادیت ہے، جس کو دین و عقیدہ اور عبادت و نماز کے سوا تمام چیزوں میں کامیابی کی منزلیں نظر آتی ہیں۔“ (۱)

سفر سے حجاز مقدس واپسی پر حضرت مولانا نے علامہ اقبالؒ کے یہ اشعار پڑھ کر اپنے تاثرات ظاہر فرمائے :

سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذان میں نے دیا تھا جس نے پہاڑوں کو ریشہ سیما
وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب
پھر جزیرۃ العرب کو مخاطب کر کے فرمایا :

”اے جزیرۃ العرب! تجھ سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اس اذان کا سرچشمہ جس سے پہاڑ لرزتے اور تھراتے تھے اور وہ سجدہ جس سے زمین پر کچلی طاری ہو جاتی تھی، ایمان سے بھرپور شوق و محبت سے لبریز، موت پر جری، شہادت کا شائق، دنیا سے بے نیاز اور مادہ سے مستغنی دل تھا۔ ایک زمانہ سے یہ دل کمزور ہو چکا ہے، مغربی مادیت و مادہ پرستانہ تعلیم نے اس کو سخت نقصان پہنچایا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی کی تپش اور حرارت، بے باکی و جرأت اور سوز و دلوں بہت کھو چکا، اس تبدیلی سے زندگی کا ہر شعبہ اور ڈھانچہ متاثر ہوا، وہ مسجد و مدرسہ، گھر اور بازار ہر کہیں عام ہو گیا اور اسے ہر شخص نے جو احساس سے عاری نہیں ہوا ہے محسوس کیا، حتیٰ کہ کل دمشق میں امیر الشعراء شوقی کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ۔

فلا الأذان أذان في منارته اذا تعالى ولا الأذان أذان
(مناروں سے بلند ہونے والی یہ اذانیں وہ نہیں ہیں جو پہلے ہوا کرتی تھیں، نہ یہ سننے والے کان وہ کان ہیں جو پہلے اذان سن کر مست ہو جاتے تھے۔)“ (۲)

(۱) شرق اوسط کی ڈائری صفحہ: ۳۰

(۲) ایضاً صفحہ: ۳۹۵

لبنان

لبنان کو مشرق و مغرب کا سنگم کہا جاسکتا ہے، حضرت مولانا نے وہاں ایک مؤقر اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

”آپ کو مغربی تہذیب اور عصر حاضر کے چیلنج کا رد و رد و مقابلہ ہے جو بہت سی دوسری عرب اور مسلم اقوام کو نہیں ہے، آپ مغربی تہذیب کے بحر مواج میں ہیں، آپ نازک آزمائش گاہ اور ایک عملیاتی تجربہ گاہ میں ہیں اور سارا عالم اسلام اس تجربہ اور آزمائش میں آپ کی سر بلندی اور کامرانی کے لیے چشم براہ ہے۔

اگر اس رزم گاہ میں آپ کامیاب ہوئے اور اپنا راستہ نکال لیا تو آپ کے دوسرے ہمسایہ عرب اور اسلامی ملکوں کے لیے بھی راہ کھل جائے گی۔“ (۱)

پھر حضرت مولانا اس تہذیب سے نبرد آزما ہونے کی متوازن اور واضح شکل بیان فرماتے ہیں :

”مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب دونوں چونکہ انسان اور انسانی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اور انسان کے مسائل و ضروریات سے بحث کرتی ہیں اس لیے کچھ نقطوں پر ان کا اتصال ہوتا ہے اور کچھ نقطوں پر افتراق، بعض مواقع پر دونوں کے راستے ایک ہو جاتے ہیں اور بعض مواقع پر الگ۔

آپ صاحب فکر اور اسلام کے راز داں ہیں اور ایسے ملک میں ہیں جو دونوں ثقافتوں کا سنگم ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ ان دونوں تہذیبوں کے درمیان ایک باریک اور واضح لائن کھینچ دیں جو فرق و امتیاز کا کام دے اور بتا سکے کہ کن چیزوں کا مغربی تہذیب سے حاصل کرنا صحیح ہے اور کن چیزوں کا حاصل کرنا درست نہیں۔“ (۲)

(۱) دریائے کاہل سے دریائے یرموک تک صفحہ: ۱۵۵

(۲) ایضاً صفحہ: ۱۵۶-۱۵۷

شرق اردن

شرق اردن کی ایک تقریر میں وہاں مغربی سامراجی نظام کی کامیابی کے اسباب کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”عثمانی سلطنت کے زوال اور پہلی جنگ عظیم کے بعد اس ملک میں جن لیڈروں سے یورپ کو سابقہ پڑاؤہ مغربی تہذیب اور مادہ پرستی سے غیر معمولی حد تک متاثر تھے، جدید مغربی نظام تعلیم کے مہلک اثرات نے ان کو اس طرح کھوکھلا کر دیا تھا جس طرح دیمک لکڑی کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ یہ لیڈر بے ضمیر، وعدہ شکن، غیرت دینی سے محروم اور سچی وطن دوستی اور وفاداری سے عاری تھے، یورپ نے یہ دیکھا تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور اسے یقین ہو گیا کہ ضمیر کی سودے بازی اور اس علاقہ پر تسلط حاصل کرنے کا وقت آ گیا ہے چنانچہ ہمارے لیڈروں نے ایسی مادہ پرستی اور ضمیر فروشی کا ثبوت دیا جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔“ (۱)

آگے فرماتے ہیں :

”اولین معرکہ میدان جنگ سے پہلے انسان کے دل و ضمیر میں برپا ہوتا ہے اور جب انسان ضمیر کے معرکہ میں کامیاب ہو جاتا ہے تو خارجی معرکوں میں اس کی کامیابی اور فتح یقینی اور لازمی شے بن جاتی ہے۔“ (۲)

مزید فرماتے ہیں :

”بے وفائی اور غداري سے روکنے والی دوہی چیزیں ہو سکتی ہیں، پہلی چیز ”طاقتور عقیدہ“ ہے اور یقیناً عقیدہ ہی سب سے قابل اعتماد اور مضبوط ترین شے ہے۔ دوسری چیز ”حب الوطنی“ ہے، ہمارے سربراہوں اور لیڈروں کے لیے کون سا جذبہ مانع ہو سکتا ہے جن کے پاس نہ عقیدہ ہے اور نہ حب الوطنی۔“ (۳)

(۱) دریائے کابل سے دریائے ترموک تک صفحہ: ۲۳۴

(۲) ایضاً صفحہ: ۲۳۶

(۳) ایضاً صفحہ: ۲۳۶

کویت

”اسمعی یا زهرة الصحرا“ کے عنوان سے حضرت مولانا نے کویت کو خطاب کیا ہے اور اس کی مادیت پر ضرب لگائی ہے۔ اپنے خطاب میں فرماتے ہیں کہ :

پانچویں چھٹی صدی مسیحی میں روم و ایران کا تمدن اپنے عروج پر تھا، بعثت نبوی ﷺ کے بعد صحابہ کرام نے ان ملکوں کو فتح کیا لیکن ان کی نگاہیں تمدن کو دیکھ کر خیرہ نہیں ہوئیں۔ حضرت ربیع بن عامر رضی اللہ عنہ نے رستم کے بھرے دربار میں اس کو دنیا کی تنگی اور گھٹن قرار دیا اور ان کو دنیا کی وسعتوں میں آنے کی دعوت دی۔

آپ تمدن میں بہت آگے بڑھ گئے، خوبصورت سے خوبصورت عمارتیں آپ نے بنالیں لیکن آپ کا اصل کام اس سے بہت بلند ہے۔ آپ کے لیے اصل فخر کی چیز آپ کا ایمان ہے، آپ نے دنیا کی ظاہری آرائش و زیبائش میں لگ کر اپنی حقیقت کھودی اور عالمی قیادت کے منصب سے آپ کو الگ کر دیا گیا، آپ دوبارہ اپنے اس مقام کو بحال کیجئے اور اپنی حقیقت کو پہچانئے۔“ (۱)

عالم عربی کے زوال کے اسباب

حضرت مولانا نے مغربی تہذیب کی یلغار کو عالم عربی کے زوال و انحطاط کا بنیادی سبب قرار دیا ہے۔ اس کے نتائج کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”یہ اس تہذیب اور اس دولت نے اس سپاہیانہ اور مجاہدانہ خراج رکھنے والی امت پر جو اپنی فطرت اور اپنی تاریخ کے لحاظ سے جنگ آزما اور خطر پسند اور اپنی دعوت و پیغام کے لحاظ سے جفاکشی اور سادگی پسندی بہت گہرا اثر ڈالا، بلکہ اس کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی، اس میں عیش پسندی، آرام طلبی اور تن آسانی پیدا ہو گئی۔ جاں بازی اور مہم جوئی، خطر پسندی اور حوصلہ مندی، خود اعتمادی و خود شناسی، مصائب و مشکلات پر صبر اور زندگی کے معرکہ میں ثابت قدمی کے

اوصاف داستان پارینہ بن گئے۔“ (۱)

”منکرات و معاصی اور احکام خداوندی کی برسرعام نافرمانی اور سرتابی کی عادت پڑ گئی، علماء نے دعوت و احتساب کا فریضہ چھوڑ دیا، بے حیائی، فسق و فجور اور الحاد و زندقہ پھیلانے والے اخبارات گھر گھر پھیل گئے اور بے حیائی کی اشاعت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔“ (۲)

حضرت مولانا نے اس زوال و انحطاط کا ایک سبب عالم عربی میں روز بروز کی بغاوتوں اور فوجی انقلابات کو بھی قرار دیا ہے جس کے نتیجہ میں وہاں کا قیمتی سرمایہ جو باصلاحیت قائدین کی شکل میں موجود تھا تلف ہو گیا، ان کو یا تو تہ تیغ کر دیا گیا یا زندگی کے میدان سے سبکدوش کر دیا گیا۔

”قومیت عربیہ“ کا فتنہ

قومیت عربیہ کو حضرت مولانا نے عالم عربی کے لیے ایک ناسور قرار دیا ہے اور اس کو بھی عربوں کے زوال کا بنیادی سبب گردانا ہے۔

یورپ نے عربوں کو اسلام اور مسلمانوں سے کاٹنے کے لیے یہ ایک گہری سازش رچی تھی۔ ایک عیسائی عرب فاضل میشل عفلق نے اس کی دعوت پیش کی اور آہستہ آہستہ عرب اس سازش کا شکار ہوتے گئے۔ سروں میں اس کا سودا ایسا سمایا کہ اس نے ایک عقیدہ اور مذہب کی شکل اختیار کر لی، اس کے نتیجہ میں اسلام اور نبوت محمدی ﷺ سے دوری پیدا ہونا شروع ہوئی، مقدیم جاہلی عربوں کو ہیر و بنا کر پیش کیا جانے لگا، اور عربوں میں ایک ارتدادِ عام کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

مولانا نے سب سے پہلے اس خطرہ کو محسوس کیا اور عالم عربی میں اس کے خلاف صور پھونک دی، اپنی تحریروں اور تقریروں میں پورے شہد و مد کے ساتھ اس کے نقصانات واضح فرمائے، کبھی اُجاہلیۃ بعد الاسلام؟ (کہا اسلام کے بعد جاہلیت کی ضرورت ہے؟) کے عنوان سے خطاب فرمایا کبھی، إسمعوا منی صریحۃ ایہا العرب! (اے عربو! کان

(۱) عالم عربی کا الیہ صفحہ ۳۲

(۲) ایضاً صفحہ ۳۳

کھول کر سن لو) کہہ کر جھنجھوڑا اور ان کی خودی کو لکا را، صدر جمال عبدالناصر اس تحریک کے قائدین میں سے تھے اور ان کو ”بسی القومية“ کے خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا، ان کے خلاف حضرت مولانا نے ایک محاذ کھول دیا۔

قومیت کا نعرہ اسلامی مزاج کے خلاف ہے اور حضرت مولانا نے تحریر فرمایا ہے :

”کہیں دنیا کے کسی گوشہ میں یہ نعرہ بلند کیا جائے، اہل دین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سے نبرد آزما اور برسر پیکار ہوں، اسی بنا پر ان قائدین نے جن کو اسلامی حمیت اور ایمانی فراست سے حصہ وافر ملا تھا انہوں نے ہر طرح کی قوم پرستی کی مخالفت کی، وہ ترک قوم پرستی ہو، ایرانی یا افغانی قوم پرستی ہو یا ہندوستانی نیشنلزم ہو۔“ (۱)

آگے قومیت عربیہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

”لیکن یہ نعرہ جب اس سرزمین سے بلند کیا جاتا ہے، جہاں دنیا کے بت کدوں کے بجائے خدا کا گھر بنایا گیا تھا اور جس کو اس دعوتِ اخوت و پیغامِ انسانیت کا آخری اور سب سے مضبوط حصار قرار دیا گیا تھا تو ایک ایسے شخص کے لیے جس کو اس کا یقین ہے کہ اسلام خدا کا آخری دین اور عرب اس کے حامل و امین ہیں، یہ بات برداشت سے باہر ہو جاتی ہے کہ وہ اس کو کسی بڑے سے بڑے سیاسی یا مادی مفاد کی خاطر نظر انداز کر دے، اور وہ ایک ذہنی و روحانی کرب کے ساتھ بے اختیار پکاراٹھتا ہے کہ

ع چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانان؟

اس قوم پرستی میں جب قدیم تہذیب کے احیاء کی سرمستی اور آباء پرستی کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے تو وہ نہ صرف اخوتِ اسلامی کی حریف، بلکہ نبوتِ محمدی ﷺ کی رقیب بھی بنتی نظر آتی ہے، وہ جس رفتار سے ترقی کرتی ہے، اسی رفتار سے محمد رسول اللہ ﷺ کی سیادت و امامت کا عقیدہ، اور ان کے ”دائے سبل“، ختم الرسل“ اور ”مولائے کل“ ہونے کا اعتقاد بھی کمزور ہوتا چلا جاتا ہے، یہ سب

اندیشہ ہائے دور دراز اور تخیل پروردہانت کے کرشمے نہیں ہیں، وہ حقائق ہیں جن کا غالی عرب قوم پرستوں کے مضامین، پر جوش عرب نوجوانوں کی مجلسوں اور مصر و شام کی ادبی اور سیاسی مجلسوں میں ہر وقت مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، اور ہمارے محدود علمی ذخیرے میں اس کا خاصا حصہ محفوظ ہے۔ صدر ناصر کی ذات سے اس عرب قوم پرستی کو جو قوت تازگی اور جوین الاقوامی اہمیت حاصل ہوئی اس سے کوئی انصاف پسند انکار نہیں کر سکتا، اس بنا پر اگر کوئی ایسا شخص جو عربوں کو اسلام کا راس المال، اور ان کی مقدس سرزمین کو دنیائے اسلام کا روحانی دار السلطنت اور محمد رسول اللہ ﷺ کا قلعہ سمجھتا ہے، بے چینی محسوس کرے، اور اس کے قلب و قلم سے کچھ آہ و فغاں نکل جائے تو تعجب کی بات نہیں کہ۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت در دے بھر نہ آئے کیوں“ (۱)

حضرت مولانا کی اسمعیات میں ”اسمعی یا سوریہ“ بھی شامل ہے جس میں مولانا نے شام کو اس کی خصوصیات و امتیازات کے اعتراف کے بعد اس کی کمزوریاں بھی بتائی ہیں۔ قومیت کی کمزوری بیان کرتے ہوئے بڑے جوش کے ساتھ فرماتے ہیں :

”جب آپ کے فرستادہ دعوت کا پیغام آ لے کہ ہمارے پاس آئے اس وقت ہم بھی ایک قومیت رکھتے تھے یا اس پر ہمیں فخر تھا، اپنی زبان پر بھی ہمیں ناز تھا، اس کے لیے اپنی جان قربان کر دینا ہمارے لیے آسان تھا لیکن ہم اس سے پوری طرح دستبردار ہو گئے، اور عظیم اسلامی خاندان میں شامل ہو گئے، ہم نے عربی زبان سیکھی اور قومی اصلیت اور حمیت جاہلی سے ہمیں کوئی سروکار نہیں رہا، آپ نے جس جاہلی تصور سے ہمیں آزاد کیا تھا اور قومیت کے گھر و دندوں سے نکالا تھا میں خدا کا حوالہ دے کر کہتا ہوں آپ اس سے اپنا دامن بچا کر رکھئے اور اس دلدل میں خود نہ پھنس جائیے جس سے آپ ہی نے ہم کو نجات دی تھی۔“ (۲)

عربوں کے لیے جامع دعوت فکر

عربوں کے سامنے حضرت مولانا نے بڑی جامعیت اور توازن کے ساتھ دینی دعوت فکر پیش کی ہے، ایک طرف وہ فرماتے ہیں :

”اسلام عالم عربی کی قومیت ہے، محمد رسول اللہ ﷺ اس کے امام اور قائد ہیں، ایمان اس کی قوت کا خزانہ ہے جس کے بھروسہ پر اس نے دوسری قوموں کا مقابلہ کیا اور فتح یاب ہوا۔ اس کی طاقت کاراز اور اس کا کارگر ہتھیار جوکل تھا وہی آج ہے، جس کے ساتھ وہ دشمنوں سے جنگ کر سکتا ہے، اپنی ہستی کی حفاظت کر سکتا ہے، اور دوسروں تک اپنا پیغام پہنچا سکتا ہے۔

عالم عربی کو اگر کمیونزم یا یہودیت سے جنگ کرنا ہے یا کسی دوسرے دشمن کا مقابلہ کرنا ہے تو اس دولت کے بل بوتے پر جنگ نہیں کر سکتا جو برطانیہ اس کو عطا کرتا ہے یا امریکہ اس کو خیرات دیتا ہے، یا پٹرول کی قیمت کے طور پر اس کو حاصل ہوتی ہے، وہ اپنے دشمن کا مقابلہ صرف اس ایمان، معنوی قوت، اس روح اور اسپرٹ کے ساتھ کر سکتا ہے جس اسپرٹ کے ساتھ کبھی اس نے بیک وقت رومی و ایرانی حکومتوں کو جنگ کی دعوت دی تھی، اور فتح حاصل کی تھی۔ وہ اس دل کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتا جس کو زندگی سے عشق اور موت سے نفرت ہو۔ اس جسم سے مقابلہ نہیں کر سکتا جو عیش و عشرت کا دلدادہ ہو۔ اس عقل کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتا جس کو شک و شبہ کا گھن لگ چکا ہو، اور افکار و خواہشات باہم دست و گریباں ہو، اس کو یاد رکھنا چاہیے کہ ضعیف الایمان اور متشکک قلب اور میدان میں ساتھ چھوڑ دینے والی قوت کے ساتھ میدان جنگ کبھی نہیں جیتا جا سکتا۔ عرب کے قائدین اور عرب لیگ کے ذمہ داروں کے لیے سب سے اہم کام یہ ہے کہ وہ عربی فوج، کسانوں، تاجروں اور جمہور کے ہر طبقہ میں ایمان کی تخم ریزی کریں، ان میں جہاد کا جذبہ، جنت کا شوق اور ظاہری آرائشوں کی تحقیر و اہانت کا احساس پیدا کریں، ان کو خواہشات نفس اور زندگی کی مرغوبات پر

قابو حاصل کرنے، خدا کے راستے میں مصائب اور تکلیفیں برداشت کرنے، مسکراتے چہروں کے ساتھ موت کے استقبال اور اس پر پروانوں کی طرح گرنے کا سبق دیں۔“ (۱)

دوسری طرف وہ عالم عربی کو جدید ترین وسائل اختیار کرنے، علوم سے آراستہ ہونے اور ترقیات کے لیے ان نئے راستوں کو اختیار کرنے کی بھی دعوت دے رہے ہیں جن کا دین و اخلاق سے کوئی تصادم نہ ہو۔ تحریر فرماتے ہیں :

”عالم اسلامی کی طرح عالم عربی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تجارت، مالیات، صنعت و حرفت اور تعلیم میں پورے طور پر آزاد اور خود کفیل ہو، وہاں کے رہنے والے انہیں چیزوں کا استعمال کریں جو ان کی زمین کی پیداوار ہو اور ان کی صنعت و محنت کا نتیجہ ہوں، زندگی کے ہر شعبہ میں وہ مغرب سے مستغنی ہوں، اپنی تمام ضروریات، مصنوعات، غذا، لباس، ہتھیار، مشینیں، آلاتِ حرب کسی چیز میں وہ غیر کے دست نگر اور مغرب کے پروردہ رحمت اور نمک خوار نہ ہوں۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ عالم عربی اگر بعض ناگزیر حالات کی بنا پر مغرب سے جنگ کرنا چاہے تو وہ اس لیے جنگ نہیں کر سکتا کہ وہ اس کا مقروض اور اس کی امداد کا محتاج ہے۔ جس قلم سے وہ مغرب کے ساتھ معاہدہ پر دستخط کرتا ہے، وہ قلم بھی مغرب ہی کا بنا ہوا ہے۔ اگر وہ مقابلہ کرتا ہے تو میدان جنگ میں اسی گولی کو استعمال کرتا ہے جو مغرب کے کارخانہ کی تیار شدہ ہے۔ عالم عربی کے لیے یہ ایک بڑی ٹریجڈی ہے کہ وہ اپنے دولت کے ذخیروں اور قوت کے سرچشموں سے خود فائدہ نہ اٹھا سکے، زندگی کا خون اس کو فائدہ پہنچانے کے بجائے اسی کی رگوں سے دوسروں کے جسم میں پہنچتا ہو، اس کی فوجوں کی ٹریننگ مغرب کے ایجنٹ اور فوجی افسران کے ہاتھ میں ہو اور حکومت کے دوسرے شعبے بھی انہیں کے سپرد ہوں۔ عالم عربی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ضروریات کا خود کفیل ہو، تجارت و مالیات کی تنظیم درآمد برآمد، قومی صنعت،

فوج کی ٹریننگ اور مشینوں، اور آلات حرب کی تیاری پر اس کا مکمل قبضہ ہو، ایسے اشخاص کی تربیت کی جائے جو حکومت کی ذمہ داریوں کو سنبھال سکیں اور سرکاری فرائض پوری واقفیت، فنی مہارت، دیانت اور خیر خواہی کے ساتھ انجام دیں۔“ (۱)

مغربی تہذیب کے مراکز میں مولانا کا پیغام

حضرت مولانا نے یورپ اور امریکہ کے دسیوں سفر کیے، وہاں طویل قیام کی نوبت آئی، مختلف انجمنوں اور تنظیموں کی دعوت پر مختلف شہروں میں تشریف لے گئے، مغربی تہذیب کے ان مراکز میں مولانا نے جو پیغام دیا ہے اس میں وہاں کے مسلمان باشندوں کے لیے بھی دعوت و فکر ہے اور یورپ و امریکہ کے لیے بھی۔

حضرت مولانا نے وہاں جو تقریریں کیں ان میں تہذیب مغرب پر بڑے توازن کے ساتھ نقد کیا ہے جس میں اس کی مادی ترقیات، وسائل کی فراہمی کا اعتراف بھی ہے اور اس کی خامیوں اور نقصانات کا اظہار بھی، اس میں مولانا نے قوت و اخلاق کے عدم توازن کو بڑے تجزیہ کے بعد مثالوں اور حقائق و واقعات کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

عیسائیت جو اس تہذیب کا سرکاری مذہب ہے مولانا نے اس کی پوری تاریخ بیان کی ہے اور ثابت کیا کہ یورپ و امریکہ کے لیے یہ بڑی بد قسمتی کی بات ہے کہ وہ مذہب اس کے حصہ میں آیا جس کی بنیاد ہی زندگی سے فرار پر ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے مذہب ہی کو زندگی کے میدان سے الگ کر دیا۔ پھر حضرت مولانا نے ثابت کیا کہ اگر کوئی مذہب وہاں کے لیے موزوں ترین ہو سکتا تھا تو وہ اسلام تھا۔ یورپ کی ترقی اس وقت شروع ہوتی ہے جب اس نے عیسائیت کو دور سے سلام کیا اور عالم اسلام کا زوال اس وقت شروع ہوا جب سے اس نے اسلام سے اپنا رشتہ کمزور کر لیا۔

امریکہ میں کی گئی ایک تقریر میں فرماتے ہیں :

”جو شخص مذاہب کی تاریخ سے واقف ہے، اگر اس سے پوچھا جائے کہ

یورپ کے مزاج اور مغرب کی افتاد طبع سے سب سے زیادہ میر رکھنے والا مذہب کون ہو سکتا ہے؟ تو اس کا جواب ایک ہوگا کہ عیسائیت! اور اگر پوچھا جائے کہ اس کی بے چین طبیعت کو آسودہ کرنے والا، اس کو صحیح رُخ پر لگانے والا، اس کے اندر اعتدال پیدا کرنے والا، وسائل و مقاصد کو ہم آہنگ بنانے والا اور ان کے رشتے سے انسانیت کا ایک نیا منصوبہ بنانے والا، انسانیت کو ایک نیا خون عطا کرنے والا اور پوری انسانیت کو صحیح راہ پر لگانے والا مذہب کون ہو سکتا ہے؟ تو انصاف پسند آدمی صرف ایک ہی جواب دے گا کہ وہ ہے اسلام! (۱)

مغرب کی اسلام سے دوری اور زندگی پر اس کے نتائج و اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”اسلام سے یورپ کے بعد کا انسانی سوسائٹی کی تاریخ اور تہذیب و ترقی کی رفتار پر بہت گہرا اور دور رس اثر پڑا، اگر یورپ یا اس کی کبھی بڑی قوم نے اسلام کو اختیار کیا ہوتا اور اس دعوت کی علمبردار ہوتی تو نہ صرف یورپ بلکہ پوری دنیا کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا، زندگی اس طرح بے معنی اور بے مقصد نہ ہوتی، دین و اخلاق اس طرح بے دست و پا اور بے اثر نہ ہوتے، انسانی تہذیب کا رخ تباہی و بربادی کی طرف نہ ہوتا اور مشرق محض استحصال اور جبر و استعمال کی آماجگاہ نہ ہوتا جیسا آج ہے۔“ (۲)

جرمن قوم کی قومی خصوصیات و امتیازات، صنعت و کاریگری میں اس کے تفوق، اس کی مہم جوئی اور قوت عمل کا تذکرہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

”اس انقلاب پسند اور حوصلہ مند قوم سے اور اس ملک سے جو عرصہ سے انقلابوں کا مسکن اور انقلابات کی آماجگاہ رہ چکا ہے، اس کی توقع تھی کہ وہ اس تہذیب سے بغاوت کرتا جس نے انسان کو ایک گمراہ، سرکش وجود اور ایک طاقتور تباہ کن ہستی بنا دیا ہے، اس نے اس کو ایک ایسی اندھی بہری مشین بنا دیا

(۱) نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں صفحہ ۲۳-۲۴

(۲) مغرب سے صاف صاف باتیں صفحہ ۳۵

ہے جو نہ روح رکھتی ہے نہ دل، نہ عقیدہ نہ ضمیر۔ اس نے پوری دنیا کو ایک قمار خانہ یا بوچڑ خانہ اور پوری زندگی کو خرید و فروخت اور لین دین کی ایک منڈی بنا دیا ہے، اس نے زندگی سے ندرت، جدت، تنوع، گہرائی اور حرارت سلب کر لی ہے، اس تہذیب کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا جس نے زندگی کو ایک نہ ختم ہونے والا سفر، نہ ختم ہونے والی مشکلات بنا دیا ہے، ایک ایسی ریس بنا دیا ہے جس کی کوئی انتہا نہیں، ایک ایسی جدوجہد، تگ و دو جس کا کوئی نتیجہ نہیں، اس نے عصر حاضر کے انسان کو ”کولہو کا نیل“ بنا دیا ہے، جو مسلسل ایک دائرہ میں چکر کاٹتا رہتا ہے، اس نے انسان سے اس کی سب سے بیش قیمت متاع چھین لی، اس کو سب سے بڑی شرافت سے محروم کر دیا، اور وہ ہے ایمان اور یقین، بے لوث اخلاص، پاکیزہ محبت اور درد و سوز کی دولت۔“ (۱)

یورپ و امریکہ میں رہنے والے مسلمانوں کی ذمہ داریاں
یورپ اور امریکہ میں رہنے والے مسلمانوں کو حضرت مولانا نے خاص طور پر دو باتوں کی طرف متوجہ کیا ہے :

ایک ملی تشخص کی حفاظت و بقاء کا مسئلہ اور دوسرے دعوتی ذمہ داری کو پورا کرنے کی فکر۔ امریکہ کی اپنی ایک تقریر میں عام مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”قبل اس کے کہ میں امریکہ کی زمین کو خیر باد کہوں میں آپ سے یہ بات کہتا ہوں کہ آپ اس تہذیب سے مرعوب نہ ہوں، آپ جس درخت کے پھل ہیں وہ نبوت کا درخت ہے۔ آپ یہاں رہیں لیکن آپ تہذیب کے غلام نہ بنیں، آپ شوق سے یہاں فائدہ اٹھائیں لیکن آپ اس مادیت سے مرعوب نہ ہوں، آپ اپنا پیغام یاد رکھیں، آپ اپنی شخصیت کو تحلیل نہ ہونے دیں۔“ (۲)

مسلمان طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے ایک تقریر میں فرماتے ہیں :

(۱) مغرب سے صاف صاف باتیں صفحہ: ۳۹-۴۰

(۲) نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں صفحہ: ۲۶

”آپ مغرب اس لیے نہیں آئے کہ موم کی طرح پگھل جائیں، آپ اس لیے آئے ہیں کہ نیا عالم تعمیر کریں، ابراہیم علیہ السلام کے فرزند اور ان کے پیرو ہی ایسا عالم تعمیر کر سکتے ہیں۔

آپ مغرب اس لیے ہرگز نہیں آئے کہ یہاں سے واپس جا کر اہل مشرق کو طوطوں کی طرح رٹا رٹایا سبق سنائیں، بندروں کی طرح نقلیں بنائیں۔ اس وقت مشرق کو ان بلند حوصلہ مند، بے باک اور جری نوجوانوں کی ضرورت ہے، جو مغرب کی آنکھوں سے آنکھیں ملا سکیں اور کہہ سکیں کہ تو نے یہاں یہاں غلطی کی۔“ (۱)

مسلمانوں کو ان کے دعوتی منصب یا دلاتے ہوئے کہتے ہیں :

”یہ ملک ایک وسیع آزر رکھ رہا ہے جس میں ابراہیمی اذان کی ضرورت ہے، اور ابراہیمی اذان سنانے والے آپ ہی ہو سکتے ہیں، آپ ہیں ابراہیم کے اصل نام لیوا، یہود نہیں ہیں، اس راستہ سے وہ دور ہو چکے، عیسائی نہیں، وہ حضرت مسیح کے بجائے سینٹ پال کی عیسائیت کی راہ پر چل رہے ہیں، وہ اصل عیسائیت سے بالکل تہی دست ہو چکے۔

آپ ابراہیم کے جانشین ہیں، آپ معمار حرم ہیں، آپ کو نئی دنیا کی تعمیر کرنی چاہیے۔ آج دنیا میں تخریب کا رگر ہے، وہ دیکھنے میں تعمیر ہے حقیقت میں تخریب، آپ جس پیغام کے حامل ہیں، آپ جس آسمانی کتاب کے حامل ہیں، آپ جس نبی کے امتی ہیں، اس نبی کا ہی یہ منصب تھا کہ دنیا کو تمام غلامیوں سے نجات دے کر خدائے واحد کی غلامی میں داخل کرے۔

آپ اس ملک کے باشندوں کو پیغام دیں، ان کو جگائیں، ان کو جھنجھوڑیں کہ تم زندگی کے غلط راستے پر پڑ گئے ہو، زندگی کا کون سا لطف تم کو حاصل ہے؟ زندگی کے صحیح رخ سے تم روشناس ہوئے ہی نہیں!“ (۲)

(۱) مغرب سے صاف صاف باتیں، صفحہ: ۵۷، ۵۶

(۲) نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں، صفحہ: ۲۸، ۲۷

اس کے بعد حضرت مولانا نے خالص امریکی اور مغربی تمدن اختیار کرنے والوں کی بے اطمینانی اور بے چینی کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعض واقعات بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

”جس طرح آدمی کو تخمہ ہو جاتا ہے ان کو تمدن کا تخمہ ہو گیا ہے، تمدن کی شراب انہوں نے اتنی پی لی ہے کہ اب وہ تے کر رہے ہیں۔ (۱)

پھر وہاں کے مسلمانوں کو خطاب کر کے ان کی بلند ذمہ داری یاد دلاتے ہیں :

”میرے بھائیو اور بہنو! آپ یہاں صرف اس لیے نہیں ہیں کہ کمائیں اور کھائیں۔ یہ کام تو دنیا کی ہر قوم کر سکتی ہے، اور ہمارے بہت سے ہم وطن یہ خدمت ہم سے بہتر انجام دے سکتے ہیں۔ آپ یہاں اس لیے ہیں کہ بقدر ضرورت کھائیں اور کمائیں لیکن اپنے منصب کو پہچانیں اور ایک نئی زندگی کا نمونہ ان کو دکھائیں۔ اذانیں دیں تاکہ ان کے دماغوں کو چوٹ لگے۔ نمازیں پڑھیں تاکہ وہ آنکھوں کے راستہ سے غور کرنے پر مجبور ہوں۔ پاک و صاف رہیں تاکہ ان کو آلودہ زندگی سے نفرت پیدا ہو۔ اعتدال سے زندگی گزاریں تاکہ ان کو اپنی بے اعتدالی کا احساس ہو، مشینوں کی غلامی سے آزاد ہو کر سکون کی زندگی بسر کریں تاکہ ان کو معلوم ہو کہ سکون کہاں ملتا ہے۔ اپنے دل کی دنیا آباد کیجئے، آپ کے اندر وہ روحانیت ہو کہ وہ آپ کے پاس بیٹھیں تو ان کو یہ محسوس ہو کہ ان کے اندر ایک نئی طاقت آگئی۔“ (۲)

ترکی

ترکی کی تاریخ محمد الفاتح سے وابستہ ہے جس نے تینیس چوبیس سال کی عمر میں قسطنطنیہ فتح کیا، اس طرح نام نہاد مسیحیت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی، وہ شہر جہاں گیارہ سو سال سے تین خداؤں کی پرستش ہو رہی تھی خدائے وحدہ لا شریک کے نام کا آواز بلند ہوا اور ایسا صوفیا میں پہلی مرتبہ اذان دی گئی۔ محمد الفاتح کے اس فاتحانہ اور اولوالعزمانہ کارنامے کے

بعد دنیا میں ترکوں کی دھاک بیٹھ گئی اور کچھ ہی عرصہ میں عباسی خلیفہ المتوکل نے سلطان سلیم کے سر پر تاج خلافت رکھ کر ترکی کو یہ خلعت بھی سوئپ دی، تین سو سال تک پوری شان و شوکت کے ساتھ ترکوں نے حکومت کی، یورپ کے لیے وہ ہمیشہ سوہان روح ثابت ہوئے۔ حضرت مولانا نے مفتی امین اقصیٰ کے واسطے سے تحریر فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ یہودیوں کا ایک وفد سلطان عبدالحمید خاں سے ملا اور اس نے چاہا کہ فلسطین میں یہودیوں کو اپنا وطن اور مرکز بنانے کی اجازت دے دی جائے۔ اور اس نے بڑی مالی مدد کا وعدہ کیا ترکی اس وقت مالی بحران میں تھا، لیکن سلطان نے زمین سے مٹی کی ایک چٹکی اٹھائی اور کہا کہ فلسطین کی خاک میں سے اتنا بھی میں تمہیں دینے کو تیار نہیں۔ پھر اپنے محافظ پر عتاب آمیز نگاہ ڈالی اور کہا کہ ”کس نے اس کتے کو یہاں آنے کی اجازت دی؟“

ہر عروج کے لیے زوال بھی ہے۔ یورپ پوری تیاری کے ساتھ سازشوں میں مصروف رہا اور مسلمانوں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، پھر وہ دن بھی آیا کہ یورپ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا اور اوزان معاہدہ کی رو سے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا، لیکن ترکی کا مرکز براہ راست یورپ کے قبضہ میں کبھی نہیں گیا۔

حضرت مولانا نے اپنی ایک تقریر میں ترکوں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا ”آپ یاد رکھیں کہ یورپ نے ترکی کو کبھی قبول نہیں کیا۔ یہ وہ نوالہ ہے جو اس سے کبھی نہ لگلا گیا اور نہ اگلا گیا۔“ حضرت مولانا نے اس کے بعد مثالوں سے یہ بات ثابت کی ہے کہ یورپ نے ترکی کو اپنا اصل حریف سمجھا ہے اور اس کو کچلنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں :

”لیکن اب یورپ نے اپنا نقشہ جنگ بدل دیا ہے، اب اس نے حملہ

اسلحہ جنگ اور فوجی طاقت کے ذریعہ سے نہیں کلچر، ذرائع ابلاغ (Public

Media) نظام تعلیم اور افکار و نظریات کے ذریعہ شروع کیا ہے، یورپ ترکی کو

مسلمان دیکھنا نہیں چاہتا، اس نے زیر زمین سرنگ بچھا رکھی ہے اور جو کام وہ

اپنی فوجوں اور توپوں کے ذریعہ نہیں کر سکا اندرونی ذرائع سے کر رہا ہے۔“ (۱)

ترکی زبان کے رسم الخط کو بدل کر یورپ نے جس طرح ترکی کو اسلام سے دور کرنے کی سازش

کی ہے، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”عصر حاضر کے مشہور فلسفی (Arnold Joyntee) نے لکھا ہے ”کہ عربوں کے کتب خانہ اسکندریہ جلانے کی روایت تاریخی طور پر صحیح ہو یا بے بنیاد، اب کسی کتابی ذخیرہ کو جلانے یا کسی زبان و ثقافت کے مٹانے کی ضرورت نہیں، رسم الخط کا بدل دینا کافی ہے، اس طرح ملک و قوم کا رشتہ ماضی سے کلی طور پر منقطع کیا جاسکتا ہے۔“ یورپ امریکہ اور اس کے ایجنٹوں کی کوشش ہے کہ ترکی کو دوسرا اسپین بنادیا جائے، اس لیے بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔“ (۱)

حضرت مولانا نے ترکوں کو خاص طور پر تین چیزوں کی طرف متوجہ فرمایا: پہلی چیز ایمان کی حفاظت اور اس کو طاقت پہنچانے کی کوشش ہے۔ دوسری چیز آئندہ نسل کو مسلمان بنانے کی فکر ہے تاکہ ایمان کا تسلسل نسلوں میں باقی رہے اور تیسری چیز اس تعلیم یافتہ طبقہ کی فکر ہے جو یورپ و امریکہ سے تعلیم حاصل کر کے آتا ہے اور زمام حکومت اسی کے ہاتھ میں آتی ہے، اس کے لیے علمی و فکری غذا، موثر لٹریچر اور ان کی نفسیات کے مطابق اسلام کی تفہیم کی ضرورت ہے۔

ترکوں کو خطاب کر کے وہ صاف صاف فرماتے ہیں :

”آپ اس طبقہ کو ہرگز نظر انداز نہ کیجئے، اسلام کی ضرورت و عظمت کو ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کیجئے ان کے دلوں اور دماغوں کو اسلام کی ابدیت اس کی تعلیمات کی صداقت اور اس کے ہر زمانہ میں قیادت کی صلاحیت پر مطمئن کیجئے۔“ (۲)

پاکستان

پاکستان وہ اسلامی ملک ہے جس کی بنیاد ہی اس لیے پڑی تھی تاکہ وہاں شریعت اسلامی کا نفاذ ہو سکے، لیکن افسوس ہے کہ اس کو (مرحوم) ضیاء الحق کو مستثنیٰ کر کے ایسے قائدین

(۱) ترکی کی مجاہدلت اسلامی صفحہ: ۱۵

(۲) ایضاً صفحہ: ۲۱

نہل سکے جو اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرتے۔

حضرت مولانا نے اپنے ہر سفر میں وہاں کے قائدین کو خاص طور پر توجہ دلائی اور معاشرہ کی اصلاح کر کے اس کو اس قابل کرنے کی دعوت دی کہ نفاذ شریعت کو پوری طرح قبول کر سکے، اور اس میں نفس کی ترغیبات، مالی ترغیبات یا اخلاقی امتحانات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

مولانا نے اپنی تقریروں میں فرمایا کہ تخریبی طاقتیں بڑی تیزی سے مصروف عمل ہیں، ان کے پاس ہر طرح کے وسائل موجود ہیں، ان کی پوری کوشش یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ کو بگاڑ کر رکھ دیا جائے۔ لیکن دوسری طرف مسلمانوں کے پاس جو تعمیری طاقت ہے وہ بڑی ست رفتاری کے ساتھ اپنا کام کر رہی ہے، جب کہ وسائل بھی اس کے پاس نہیں ہیں۔ مولانا نے اس کی مثال کچھوے اور خرگوش سے دی اور فرمایا کہ کچھوہا ست رفتاری کے باوجود سوراہا ہے اور خرگوش تیزی کے ساتھ مصروف عمل ہے۔

حضرت مولانا نے صاف صاف کہا :

”اس وقت اسلام ایک عقیدہ کی حیثیت سے موجود ہے لیکن اس کو تمدن سے محروم کر دیا گیا ہے، اور یہ مغرب کی بہت بڑی سازش ہے کہ اس نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کو عقیدہ سے ہٹانا مشکل ہے اور ان کے احساسات اس کے بارے میں بہت تیز ہیں، اس کو اس کے بہت تلخ تجربے ہوئے ہیں تو اس نے یہ حکمت عملی (Stratary) طے کی کہ مسلمانوں کو ان کے عقیدہ سے ہٹانے کے بجائے ان کے تمدن سے اور ان کے نظام معاشرت سے علاحدہ اور محروم اور اس پر آمادہ کر دینا چاہیے کہ وہ دوسرا تمدن اختیار کر لیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یورپ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہو گیا ہے۔“ (۱)

اسلامی تمدن اور معاشرہ کی از سر نو تشکیل کے لیے مولانا فرماتے ہیں :

”یہ دور جہاں ایمان و عقیدہ کی طاقت چاہتا ہے وہاں بڑے عمیق مطالعہ کا بھی طالب ہے، بڑی سنجیدگی اور فکر کی گہرائی کا بھی طالب ہے، ایثار و قربانی

کا بھی طالب ہے، یہ مرحلہ بغیر ان عناصر کے طے نہیں ہوتا اور نہ کبھی اس سے پہلے طے ہوا ہے اور نہ اس وقت طے ہو سکتا ہے۔ یہ جس طرح ہمارے عقیدہ کا امتحان ہے اسی طرح ہماری ذہانت کا بھی امتحان ہے، اس لیے کہ ایک نئے معاشرہ کا ایک نیا ڈھانچہ بنانا اس کو اسلام کی تعلیم کے مطابق کرنا، ان عناصر کو خارج کرنا جو اسلام کے منافی ہیں اور ایک نیا تمدن تشکیل میں لانا ہے۔“ (۱)

مولانا نے مسلمانان پاکستان کو ”قومیت“ کے فتنہ سے بھی آگاہ کیا ہے، لسانی و تہذیبی عصیت کے نقصانات بتائے ہیں اور اسلامی و ایمانی وحدت میں اپنے آپ کو پرونے کی دعوت دی ہے۔

بتان رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تو رانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

وہ فرماتے ہیں :

”میں آپ کو آگاہی دیتا ہوں اور اپنی بات پہنچانا چاہتا ہوں کہ اس ملک کے لیے سب سے زیادہ خطرناک چیز یہ لسانی یا تہذیبی عصیت یا قدیم تہذیب کے احیاء کی دعوت ہے، میں تنہا پاکستان کی بات نہیں کرتا اور بھی دوسرے ممالک ہیں مثلاً مصر میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ فرعون کی تہذیب کو زندہ کیا جائے، جیسا کہ چند سال پہلے یہ فتنہ کھڑا ہوا تھا، یا ایران میں سائرس کی عظمت اور اس کو ایران کا ہیرو بنانے کا فتنہ پیدا ہو جائے تو وہاں اسلام کی چولیس ہل جائیں گی۔ اس لیے وحدت اسلامی کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے، یہی وحدت اسلامی ہے جو امن پسند ہے، اور تعمیری صلاحیت رکھنے والی ہے، وہ انسانوں کو جوڑتی ہے توڑتی نہیں، اور انسانوں کے لیے تعمیر کا باعث ہے تخریب کا باعث نہیں، اللہ نے ہم کو آپ کو بہت پہلے یہ نعمت عطا کی تھی۔ ”وَإِذْ كُنَّا نَبْعَثُ إِلَيْكُمْ إِبْرَاهِيمَ إِذْ كُنْتُمْ أَكْثَرُ ظَالِمِينَ“ (آل عمران ۱۰۳)

خدا کے اس احسان کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اللہ نے تمہارے دل ملا دیے، تم اس کے فضل سے بھائی بھائی ہو گئے۔
 اللہ نے اس وحدت اسلامی کی نعمت ہی آپ کو عطا نہیں کی ہے، آپ کو اس کی دعوت دینے کی ذمہ داری بھی تفویض کی ہے، آپ کا فرض ہے کہ دنیا کے سامنے نمونہ پیش کریں کہ وحدت اسلامی کے ثمرات و برکات کیا ہوتے ہیں؟“ (۱)

متوازن فکر و دعوت

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو بڑا متوازن مزاج عطا فرمایا تھا، توازن اور اعتدال ان کی ایک ایک ادا سے ظاہر تھا۔ ہر شخصیت کی ایک ماہہ الامتیاز صفت ہوتی ہے، مولانا جیسی جامع الکملات شخصیت کے لیے کسی ایک صفت کو تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، اگر ان کی ماہہ الامتیاز ایک ہی صفت بیان کرنی ہو تو شاید ہر تجزیہ کرنے والا مولانا کے اسی صفت ”توازن“ کو بیان کرے گا۔

مولانا کی پوری زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ فکر و نظر سے لے کر دعوت و عمل کے ہر گوشہ میں اسی وصف کی جلوہ نمائی ہے۔

مولانا نے اگر کسی پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے تو اس کے محاسن و معائب دونوں بڑے توازن کے ساتھ بیان فرمادیے ہیں، نہ ہی معائب کی ظلمتیں ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال سکی ہیں اور نہ ہی محاسن کی جلوہ سامانیاں ان کی نگاہوں کو خیرہ کر سکی ہیں۔

تہذیب مغرب کے بارے میں عام طور سے مفکرین و مصنفین توازن باقی نہ رکھ سکے، جو اس سے متاثر ہوئے وہ یا تو اسی کی رو میں بہہ گئے یا اس کے میکاکی طرز فکر سے متاثر ہو گئے، اور دین کی تشریح بھی اسی انداز سے کرنے لگے۔ جن لوگوں نے تنقید میں جارحانہ رویہ اختیار کیا وہ اس قدر غلو کر گئے کہ اس کی خوبیاں بھی ان کو خامیوں ہی کی شکل میں نظر آئیں، اور انہوں نے اس کو پوری طرح شجر ممنوعہ قرار دے دیا، حالانکہ جو تنقید آنکھ بند کر کے کی جاتی ہے وہ سنجیدہ اور علمی حلقوں میں قبول نہیں کی جاتی، اس لیے یہ طبقہ بھی معاشرہ پر اثر

انداز نہیں ہو سکا۔

حضرت مولانا کے نزدیک مغربی تہذیب کا انکار سو فیصدی صحیح نہیں ہے۔ اپنی ایک تقریر میں وہ فرماتے ہیں :

”یہ نکتہ آپ یاد رکھئے کہ محض مبالغہ اور اذواء سے کام نہیں چلتا، یہ چیز اکثر مضر ہوتی ہے مثلاً یہ کہہ دیا جائے کہ مغربی تہذیب کچھ نہیں، اس میں کوئی چیز قابل استفادہ نہیں، ٹھوکر مارنے کی چیز ہے، لیکن جب آدمی کو اس کے خلاف کوئی ثبوت ملے گا، یا اس کو تجربہ ہوگا سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد کا تو وہ پھر منکر ہو جائے گا۔“ (۱)

آگے فرماتے ہیں :

”یہ حقیقت بھی یاد رکھیے کہ عدم توازن بعض اوقات ارتداد تک پہنچا دیتا ہے اور رخ بدل دیتا ہے۔“ (۲)

مغربی تہذیب کا حضرت مولانا نے جو منصفانہ اور متوازن جائزہ لیا ہے اس سے مولانا کے متوازن مزاج کی عکاسی ہوتی ہے نقد مغرب کے بارہ میں حضرت مولانا کا یہ توازن سب سے زیادہ ان کی معرکہ الآراء تصنیف ”مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش“ میں نمایاں ہے، جس میں حضرت مولانا نے تہذیب مغرب کے سلسلہ میں تین مکاتب فکر کا تذکرہ کیا ہے اور پھر دونوں انتہا پسندانہ مکاتب فکر کے نقصانات کا جائزہ لیا ہے اور معتدل مکتب فکر کی بھرپور ترجمانی فرمائی ہے، اس کو اسلامی ملکوں کے لیے ضروری اور مفید قرار دیا ہے۔

مولانا نے اس تہذیب کے اچھے برے پہلوؤں کے درمیان جس بصیرت کے ساتھ حد فاصل کھینچی ہے اور اس میں جس حساسیت اور قوت اور اک کا مظاہر فرمایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس سے مولانا کی حقیقت پسندی اور دقیقہ رسی صاف نظر آتی ہے۔

”فولاد کی سختی اور ریشم کی نرمی“ کا عنوان قائم کر کے مولانا نے اسلامی تہذیب کے حدود متعین کیے ہیں، اس سے مولانا کا نقطہ نظر بھی واضح ہو جاتا ہے۔

فرماتے ہیں :

”یہ تہذیب، حقائق، نئے مسائل اور وقت کے نئے تقاضوں کے معاملہ میں (بغیر مبالغہ اور خیال آرائی اور تخیل پسندی کے) ریشم کی نرمی رکھتی ہے، عقیدہ و اخلاقی کی سرحدوں پر وہ فولاد سے زیادہ سخت ہے اور پہاڑوں کی طرح ثابت قدم اور غیور۔ وہ دنیا کے علوم کے بارہ میں خواہ وہ کسی دور دراز ملک اور خطے میں ہوں، اپنی ضمیر و عقل کی آنکھ کھلی رکھتی ہے اور سیدہ کشادہ، نیز ان تنظیموں اور منصوبوں کو قبول کرنے پر آمادہ رہتی ہے جو نہ دین کو مجروح کرتے ہیں اور نہ اس کے اخلاقی نظام میں کوئی تغیر پیدا کرتے ہیں۔“ (۱)

مادیت جو تہذیب نو کی بنیاد ہے، اسلام اس کی کلیۃً نفی نہیں کرتا، اس کے لیے حدود متعین کرتا ہے اور اس کی دعوت دیتا ہے کہ ایمان و اخلاق کے بنیادی اصولوں کو سامنے رکھ کر ہی اس کو اختیار کیا جائے اور اس کے وہ تمام اجزاء جو ان اصولوں سے متصادم ہوں ان کی نفی کی جائے۔

انسان خود اس مادیت کے تابع نہ ہو بلکہ اس پر اپنی فرمانروائی کرے۔ حضرت مولانا نے بڑے خوبصورت اسلوب میں مثال دے کر اس کو واضح کیا ہے۔ تاریخ اسلام کے ان جیالوں کا تذکرہ کرتے ہوئے جنہوں نے مادیت کو اپنا غلام بنا رکھا تھا تحریر فرماتے ہیں :

”جن کا حال یہ تھا کہ مادیت کو انہوں نے تابع کر رکھا تھا وہ مادیت کے تابع نہیں تھے، مادیت کے راکب تھے مادیت کے مرکب نہیں تھے، آج اصل فرق یہ ہے کہ مادیت کے ہم مرکب ہیں یا ایسے بے اختیار راکب کہ

ع نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ہماری حالت یہ ہے کہ جیسے کوئی گھوڑا چھوٹ جائے اور اس کا راکب بے اختیار ہو جائے، مادیت ہمیں سرپٹ دوڑائے لیے پھر رہی ہے، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اس گھوڑے کو کس طرف موڑیں اور کس طرح چھوڑیں، دونوں باتیں ہمارے اختیار میں نہیں، خندق میں۔ لے کر کود جائے، کسی کھائی میں چھلانگ لگا دے، سمندر میں کود جائے، ہمیں پتہ نہیں۔ اس وقت ہمارے پورے تمدن کا

یہ حال ہے کہ تمدن ہمارے اختیار میں نہیں رہا، تمدن کی باگ ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے۔“ (۱)

حضرت مولانا نے توازن کے ساتھ یہ فکر پیش کی ہے کہ تمدن، تہذیب، مادی وسائل، معیشت ان میں سے کسی چیز کو چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ اس کی باگ اپنے ہاتھ میں رہے، یہ سارے اسباب اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مسخر کیے ہیں، ان پر انسانیت کی بالادستی قائم رہے، انسان خود ان کا تابع نہ ہو جائے۔

حضرت مولانا نے ملکوں ملکوں یہ دعوت پیش کی ہے کہ مغربی تہذیب نے مادیت کو جس طرح بنی نوع انسان کا راکب بنا دیا ہے اور وہ مادیت انسان کو سرپٹ دوڑائے لیے جارہی ہے، یہ پوری انسانیت کے لیے بڑے خطرہ کی بات ہے۔ اس کی وجہ صرف ایمان و اخلاق کا ان میں فقدان ہے۔ قوت و اخلاق کا یہ عدم توازن بڑی تیزی سے پوری انسانیت کو ہلاکت خیزی کی طرف لے جا رہا ہے، ایسی صورت حال میں سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ قوت و اخلاق میں توازن پیدا کیا جائے، قوت کو توڑنا اور سائنسی ترقیات سے دستبردار ہونا کچھ مفید نہیں، ضرورت ہے کہ اس کے ساتھ ایمان و اخلاق کا درس بھی شامل کیا جائے تاکہ توازن پیدا ہو اور انسانیت ان ترقیات سے پورا اور صحیح فائدہ اٹھا سکے۔

مولانا نے جگہ جگہ یہ بات پیش کی ہے کہ ایمان و اخلاق کا سرمایہ صرف مسلمانوں کے پاس ہے، ان کی بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ اس میں نکل سے کام نہ لیں اور یورپ کو ایمان و اخلاق کی تعلیم دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا نے مشرقی اقوام بالخصوص مسلمانوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ وہ یورپ کے ایسے سعادت مند شاگرد نہ بن جائیں جو ہر چیز میں یورپ کی تقلید کرتا ہو، بلکہ ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ یورپ کی ترقیات سے پورا فائدہ اٹھائیں اور وہ علوم جن کی بنیادیں خود مسلمانوں نے فراہم کی تھیں وہ دوبارہ ان میں آگے بڑھیں اور قیادت کے منصب پر فائز ہوں۔

مغربی ممالک میں تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے وہ بڑا

حقیقت پسندانہ اور متوازن مشورہ دیتے ہیں :

”اگر آپ نے مشرق میں جا کر کہا کہ مغرب سرتا پا خیر اور سراسر بے عیب ہے تو آپ نے اپنی قوم کو دھوکہ دیا اور ایک خلاف واقعہ بات بیان کی۔ آپ کو یہاں سے واپس جا کر اپنے بھائیوں کو بتانا ہے مغرب کے پاس کیا خوبیاں ہیں؟ اس کی قوت کا کیا راز ہے اور ان کی زندگی کے کون سے پہلو قابل تقلید ہیں؟ اسی طرح مغرب کی کون کون سی بیماریاں ہیں جو اس کے درخت کو گھن کی طرح کھاتی جا رہی ہیں؟ وہ آج کس اخلاقی جذام میں مبتلا ہے؟ ہمیں اس کی کن کن چیزوں سے پرہیز کرنا ہے اور اس کی کون سی چیزیں ہیں جن میں مشرق کو اس کی تقلید کرنے کی ضرورت نہیں؟“ (۱)

مصر کو حضرت مولانا نے ”ملتقى الثقافتين“ اسلامی و مغربی تہذیب کا سنگم قرار دیا ہے اور اس کو تلقین کی ہے کہ وہ مشرق و مغرب کے درمیان پل کا کام کرے۔ اس کو خطاب کر کے فرماتے ہیں :

”ایشیا اور عرب ملکوں کا آپ پر حق یہ ہے کہ آپ یورپ کے تجربات ان مشرقی ملکوں میں منقل کریں، آپ اپنی ذمہ داری سے اس وقت تک عہدہ برآ نہیں ہو سکتے جب تک آپ ان کے علوم، ان کے نشاطات (Activities) اور جدوجہد اور طریقہ کار سے ان مشرقی عرب ممالک کو باخبر نہ کر دیں۔

اور یورپ کی بھی ذمہ داری آپ پر ہے اور اس ذمہ داری سے آپ اسی وقت عہدہ برآ ہوں گے کہ جب آپ جزیرۃ العرب کے پیغام اسلام کو ان ملکوں میں پہنچائیں، اور جن مشکلات نے یورپ کے بڑے بڑے مفکرین کو عاجز کر دیا ہے ان کا اسلامی حل ان کے سامنے پیش کریں۔ وہ یورپ جس سے آپ نے بہت کچھ لیا ہے اس کا حق اسی طرح ادا ہو گا کہ آپ اپنے اس عظیم اور مقدس فرض کو نبھائیں اور اپنی ذمہ داری پوری کریں، اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ یورپ نے آپ پر جو احسان کیا ہے اس سے بڑا یورپ پر آپ کا یہ احسان ہو گا۔“ (۲)

(۱) مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں صفحہ: ۵۸

(۲) العرب والا سلام صفحہ: ۳۱

حضرت مولانا کی فکریہ ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں جہاں کہیں بھی یورپ وامریکہ کی یا کسی بھی قوم کی بالادستی قائم ہے وہاں تہذیب نو کا غائرانہ مطالعہ کیا جائے اور مفید اجزاء سمیٹنے کی کوشش کی جائے اور اس کے جو اجزاء مخرب اخلاق اور مضر ہیں ان کو کھرچ کر پھینک دیا جائے۔

مولانا کے اس توازن کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس کتاب وسنت کا گہرا علم ہے، ان کی فکر کی تشکیل سیرت نبوی ﷺ کے مدرسہ میں ہوئی ہے، اسلامی نصوص کا انہوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی تعلیم انہوں نے رجال اللہ اور وارثین رسول اللہ ﷺ سے حاصل کی ہے۔ سلف صالحین کی اصلاح و تجدید کی تاریخ ان کی نگاہوں کے سامنے ہے، وہ فکر کی پختگی اور بالیدگی کے ساتھ دعوت کے میدان میں آئے ہیں، ان کے پاس مضرب عقل اور ساز دل دونوں کو چھیڑنے کی یکساں قدرت ہے۔ یورپ کا مطالعہ مولانا نے فکر و شعور کی اسی پختگی کے ساتھ کیا ہے، وہ کہیں بھی اس سے متاثر نظر نہیں آئے، اس کی خوبیوں اور خامیوں پر استادانہ شان کے ساتھ وہ انگلی رکھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا وہ تجدیدی کام ہے جو بیسویں صدی میں اللہ تعالیٰ نے ان سے لیا، اس کام میں اگرچہ اور بھی اصحاب علم و فکر شریک ہیں لیکن جس توازن اور قوت کے ساتھ مولانا نے یہ کام کیا وہ مولانا کی بڑی خصوصیت ہے۔



﴿باب دوم﴾

حکام و امراء کی دینی و فکری رہنمائی

دعوت دین

دین خالص کی دعوت اس امت کا شعار ہے، گزشتہ امتوں نے وہ سرمایہ ضائع کر دیا جو ان کو اپنے اپنے زمانوں میں انبیاء و مرسلین سے حاصل ہوا تھا، یہ صرف اسی امت کی خصوصیت ہے کہ اس نے دین کے ایک ایک جزء کو محفوظ رکھا، اور ہر زمانہ میں جب بھی دین کے کسی شعبہ پر افتاد پڑی، اس وقت کے مصلحین امت اور مجددین دین کھڑے ہوئے اور انہوں نے اس کا مقابلہ کیا، صحیح اسلامی معاشرہ وجود میں لانے اور دین کی جڑوں کو مضبوط کرنے کے لیے بھی انہوں نے تگ و دو کی، اسکے ساتھ ساتھ اسلامی نظام کو بیگانوں میں پیش کر کے اسلامی سلطنت کے حدود میں توسیع کا فریضہ بھی انجام دیا، دعوت و اصلاح کا یہ عمل ہر زمانہ میں جاری رہا، اس کی رفتار کبھی تیز ہوئی اور کبھی سست، لیکن کسی دور میں یہ مکمل جمود و تعطل کا شکار نہیں ہوا، اور حوادث کے طوفان تیز تر کے باوجود اس کے چراغ کو کوئی گل نہ کر سکا۔

ہوا ہے گو تیز و تند لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

دعوت کے اس کام کو انجام دینے میں خادمین اسلام نے ہمیشہ حکمت و دعوت کی اس قرآنی تعلیم کو پیش نظر رکھا، ”ادع الی سبیل ربک بالحکمة و الموعظة الحسنة و جادلہم بالتی ہی احسن“ (۱) (لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار

کے راستہ کی طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو) مقصود حقیقی کو سامنے رکھتے ہوئے، قرآن وحدیث کے اصولوں کو برتتے ہوئے، حالات اور تقاضوں کی رعایت کرتے ہوئے ہر دور میں علماء اس فریضہ کو ادا کرتے رہے ہیں۔

دعوت واصلاح کی تاریخ کا جائزہ لینے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اصول دین میں پورے تصلب کے ساتھ دعوت کے طریقہ کار میں ہمیشہ تبدیلی ہوتی رہی ہے، نفسیات انسانی اور زمان و مکان کی ہمیشہ اس میں رعایت کی جاتی رہی ہے، اور یہ دعوت کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اگر اس کو نظر انداز کیا گیا تو اس میدان میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی اور بنیادی بات یہ ہے کہ جس طبقہ میں یہ کام انجام دینا ہو اس کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے، اس کے حالات و ضروریات، ماحول اور تقاضوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے، پھر اسی کی روشنی میں دعوت کا کام انجام دیا جائے۔ یہ اصول آب زر سے لکھنے کے قابل ہے جو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد مرتبہ بیان فرمایا کہ ”داعی کے لیے بہت اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ وہ کھلے دروازے سے داخل ہو“۔ جو دروازے پہلے سے مقفل ہوں، ابتداء ہی میں ان کے قفل توڑنے کی کوشش نہ کی جائے، کتاب الہی سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے، اہل کتاب کو جب دعوت پیش کی گئی ہے تو سب سے پہلے فرمایا گیا: ”قل یا اهل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم ألا نعبد الا الله ولا نشرک به شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون الله۔“ (۱)

(کہہ دو کہ اے اہل کتاب! جو بات ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے اس کی طرف آؤ، وہ یہ کہ خدا کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے)

اگر دعوت واصلاح کا کام طبقہ امراء و حکام میں انجام دینا ہے تو اس کے لیے بھی بڑے حزم و احتیاط اور حکمت کی ضرورت ہے، زمان و مکان کے تغیرات کا حالات پر گہرا اثر پڑتا

ہے، اور اس کی رعایت دعوت کی بنیادی ضرورت ہے۔

دین کو برسر اقتدار لانے کے دو راستے

مختلف ادوار کے دعاۃ مصلحین اور مجددین دین کے حالات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ طریقہ کار کے جزوی اختلافات اور تغیرات کے باوجود دین کو برسر اقتدار لانے کے دو ہی طریقے اختیار کیے ہیں، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دونوں طریقے اپنی اپنی جگہ بہت اہم اور ضروری ہیں، لیکن ان میں حالات کی رعایت اور ترتیب کا لحاظ غایت درجہ ضروری ہے، اور عام طور پر اگر اس کا خیال نہ رکھا جائے تو بڑی رکاوٹیں سامنے آتی ہیں۔

پہلا راستہ

دین کو اقتدار میں لانے کا سب سے پہلا راستہ جو ترتیب کے لحاظ سے بھی مقدم ہے اور اپنی تاثیر اور افادیت میں بھی اس کو اولیت حاصل ہے؛ یہ ہے کہ اہل دین دعوت دین کو اس طبقہ میں پہنچائیں جس کے ہاتھ میں زمام اقتدار ہو یا وہ آگے اس کی باگ ڈور سنبھالنے والا ہو، اس کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دیں اور اس کے لیے مناسب اسلوب اور حکیمانہ طریقہ اختیار کریں۔

دوسرا راستہ

دوسرا راستہ یہ ہے کہ براہ راست دیندار حضرات کرسی تک پہنچنے کی کوشش کریں، اور اہم مناصب حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کریں۔ بلاشبہ یہ دونوں طریقے اپنی اپنی جگہ پر اہم اور مفید ہیں اور بعض حالات میں دوسرا طریقہ بھی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ اسی وقت مناسب ہے جب دعوت و اصلاح کی امید منقطع ہو جائے اور اصلاح کے لیے انقلاب ہی تنہا ایک راستہ باقی رہ جائے، اس وقت طاقت کے خلاف جہاد کرنا اور دعوت کے راستہ سے رکاوٹ کو دور کر دینا علمائے امت کا فریضہ ہے۔ مختلف زمانوں میں اس کی مثالیں موجود ہیں جو اسلام کی تاریخ کا سنہرے باب ہیں، تاہم عمومی حالات میں دعوت کا سب سے مؤثر طریقہ یہی ہے کہ دین حکام و مسلاطین اور امراء کے طبقہ میں پہنچایا جائے، اس کی ذہنی و فکری تربیت کا اہتمام ہو

اور ہر ممکن طریقہ پر اس کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا جائے۔ دعوت و اصلاح کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہی طریقہ زیادہ مفید اور کامیاب ثابت ہوا ہے اور اس کے بہترین نتائج سامنے آئے ہیں اور اپنے اپنے زمانہ میں مجددین و مصلحین نے اس کی طرف خاص توجہ رکھی ہے۔

سلاطین و امراء کی تربیت و ارشاد کے چند واقعات

سید التاجین حضرت حسن بصریؒ نے خلیفہ وقت یزید بن عبد الملک کا احتساب کیا، اور کئی موقعوں پر اس کو غلطی پر تنبیہ کی۔ امام مالکؒ نے خلیفہ ہارون رشید کو بڑا تفصیلی خط بھیجا جس میں اس کی پوری رہنمائی فرمائی۔ امام احمد بن حنبلؒ معتصم خلیفہ عباسی کے زمانہ میں دین حق کے لیے سینہ سپر ہو گئے اور ”فتنہ خلق قرآن“ کے موقع پر پوری عزیمت کے ساتھ مسلک حق پر قائم رہے اور خلیفہ کو مسلک حق کی تلقین کرتے رہے، پھر متوکل کے زمانہ میں اس کو مشورے دیتے رہے اور اس کے اصرار پر کئی روز لشکر میں قیام فرمایا اور اس میں دینی روح اور اسلامی جذبہ بیدار کرنے کی کوشش فرماتے رہے۔ امام غزالیؒ کو سلطان سنجر سے ملنے کا اتفاق ہوا تو بھرے دربار میں اس کو ٹوکا، اور اس کے بڑے بھائی محمد کو جو اپنے وقت کا سب سے بڑا حاکم تھا ایک ہدایت نامہ لکھ کر بھیجا جس میں اس کو حکمانہ ذمہ داریوں، خوف خدا، اور اصلاح ملکی کی طرف متوجہ کیا۔ مشرقی سلطنتوں میں عموماً حکومت کا نظم و نسق چونکہ وزراء کے ہاتھوں میں ہوتا تھا اس لیے امام غزالیؒ نے خاص طور پر سلاطین سلجوقیہ کے وزراء کی طرف توجہ فرمائی اور ان کو مفصل خطوط اور ہدایت نامے ارسال کیے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا فیض عام تھا، خلفائے وقت، وزراء و سلاطین سب کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرماتے۔ خلیفہ مقتدی لامر اللہ نے ایک گورنر متعین کیا جو ابن المرحم الظالم کے لقب سے مشہور تھا، تو شیخ نے خلیفہ کو تنبیہ فرمائی اور گورنر کو معزول کیا گیا۔

اس سلسلہ میں حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ کا نام نامی بھی شامل ہے جو اگرچہ سلسلہ نقشبندیہ کے امام اور اپنے وقت کے سب سے بڑے شیخ ہیں لیکن انہوں نے بھی اس کام کو پیش نظر رکھا اور اپنے وقت کے سلاطین و امراء کی رہنمائی فرماتے رہے۔ حضرت مجدد صاحبؒ اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :

”آپ بادشاہوں کی مجلسوں میں تشریف لے جاتے تھے اور اپنی قوت باطنی اور تاثیر روحانی سے ان کو اپنا مطیع و منقاد بنا لیتے تھے، پھر ان کے ذریعہ شریعت کو رواج دیتے تھے۔“

ان ہی مجددین و مصلحین کی فہرست میں امام ابن تیمیہؒ بھی شامل ہیں، جنہوں نے تاتاریوں کے بادشاہ قازان سے بڑے حکیمانہ انداز سے گفتگو کی، وہ اگرچہ ملک شام فتح کر چکا تھا لیکن امام کے حکیمانہ کلام سے بہت متاثر ہوا اور ان کی سفارش سے مسلمانوں کی بڑی تعداد جو اس کے یہاں قید تھی رہا کر دی اور امام کو عزت و احترام کے ساتھ رخصت کیا۔ ۷۰۰ھ میں تاتاریوں کے دوبارہ حملہ کی اطلاع ملی تو امام ہی کی سفارش اور گفتگو سے سلطان مصر اپنی فوجوں کے ساتھ مدد کو آئے۔

۷۰۲ھ میں تاتاریوں سے سخت مقابلہ ہوا اور مسلمان فاتح ہوئے اس میں بھی امام ابن تیمیہؒ کے مشورہ اور رہنمائی کا خاص حصہ تھا۔

شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلامؒ

اس باب میں سب سے نمایاں نام شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلامؒ کا ہے۔ سلاطین وقت ان کا احترام کرتے تھے۔ انہوں نے خود کبھی کسی بادشاہ کے یہاں حاضری دینا گوارہ نہیں کیا، لیکن بادشاہ وقت نے اگر خود تشریف آوری کی درخواست کی تو تشریف لے گئے اور اس کو صحیح مشورے دیئے اور اس کی اور اسلام و مسلمانوں کی خیر خواہی میں کمی نہیں کی۔

یہ شیخ کا بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے سلطان الملک الاشرف کو تاتاریوں کے مقابلہ کے لیے آمادہ کیا اور ملک میں فتنہ و فجور کا جو دور چل رہا تھا بادشاہ کو متوجہ کیا کہ اس پر پابندی لگائی جائے۔ سلطان نے اسی وقت ان تمام چیزوں کی ممانعت کے احکام جاری کر دیئے۔

اس طرح جب تاتاریوں کا رخ مصر کی طرف ہوا اور وہاں سراپیمگی پھیل گئی، سلطان کو مقابلہ کی ہمت نہ ہوتی تھی، تو شیخ نے ہی اس کو ہمت دلائی اور فرمایا کہ تم اللہ کا نام لے کر نکلو میں فتح کی ضمانت لیتا ہوں۔ جب اس نے مال کی کمی کا عذر کیا تو فرمایا کہ پہلے محل کے جواہرات اور بیگمات کے زیورات نکالے جائیں، ان کے سکے ڈھلوا کر لشکر میں تقسیم کیے

جائیں، اس سے انشاء اللہ مصارف جنگ پورے ہو جائیں گے۔ شیخ کو اللہ تعالیٰ نے ایسا رعب عطا فرمایا تھا کہ بادشاہ اور امراء سلطنت نے جواہرات و زیورات حاضر کر دیئے اور اس سے مصارف جنگ پورے ہو گئے اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔

شیخ کے مصر کے زمانہ قیام میں متعدد حکام و سلاطین تخت نشین ہوئے۔ شیخ ان کی رہنمائی فرماتے رہے۔ خاص طور پر الملک الظاہر بیہر س شیخ کا بڑا قدر داں تھا، متعدد اہم فیصلے اس نے شیخ کے ہی مشورہ سے کیے اور شیخ ہی کی توجہ سے اس نے تاتاریوں اور صلیبیوں پر پے در پے حملے کیے اور فتوحات حاصل کیں۔

حضرت مجدد الف ثانی

ہندوستان کے علماء و مشائخ اور مصلحین و مجددین بھی اپنے اپنے دور میں یہ فریضہ انجام دیتے رہے، گیارہویں صدی کے مجدد حضرت شیخ احمد سرہندی کا نام نامی اس باب میں سب سے نمایاں ہے جنہوں نے سلطنت مغلیہ کی چول بٹھانے کا کام کیا اور اکبر کے الحاد و زندقہ کے نتیجہ میں جو بگاڑ پیدا ہو گیا تھا آہستہ آہستہ انہوں نے اس کی اصلاح کی۔ یہ حضرت مجدد کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ جہانگیر کی زندگی میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی اور اس کے بعد شاہ جہاں سریر آرائے سلطنت ہوا۔ وہ اپنی ذات سے فرائض شرعی کا پابند تھا، علماء و صلحاء کو قریب رکھتا تھا اور ان کا احترام کرتا تھا، اس نے بعض خلاف شرع رسوم و آداب پر بھی پابندی لگائی۔ اس کے بعد اورنگ زیب عالمگیر جیسا بادشاہ تخت پر بیٹھا جس کو ”سادس الخلفاء الراشدین“ کہا جاتا ہے، وہ باقاعدہ حضرت مجدد کے نامور صاحبزادہ اور جانشین حضرت خواجہ محمد معصوم کا دست گرفتہ تھا۔ بادشاہ کے اصرار پر حضرت خواجہ نے اپنے صاحبزادہ خواجہ سیف الدین کو دہلی قیام کا حکم دیا تھا۔ انہوں نے براہ راست بادشاہ کی اصلاح و تربیت کا کام کیا، اور صدیوں کے بعد عالم اسلام کو ایسا صالح بادشاہ نصیب ہوا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے زمانہ میں اگرچہ سلطنت مغلیہ پر نزع کا عالم طاری تھا

لیکن شاہ صاحب نے جو ممکن ہو سکا اس کی تقویت و اصلاح کا سامان بہم پہنچایا، بادشاہ کی بھی مقدور بھر رہنمائی کی اور امیر الہ مراد نواب نجیب الدولہ کو خاص طور پر خطوط کے ذریعہ سے مناسب ملکی و عسکری اقدامات کی طرف متوجہ کیا، پھر شاہ صاحب کی توجہ و مراسلت سے احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان کا آخری مرتبہ رخ کیا اور مرہٹوں کو شکست فاش دے کر حکومت مغلیہ کا شیرازہ مجتمع کرنے کی کوشش کی اور واپس اپنے ملک روانہ ہو گیا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور ان کا اسلوب دعوت

اس اخیر دور میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا نام نامی اس باب میں سب سے زیادہ روشن ہے، جنہوں نے بڑے وسیع پیمانہ پر اصحاب اقتدار و سطوت کی رہنمائی کی اور ذہنی و فکری تشکیل کے لیے حکیمانہ کوشش کیں۔

حضرت مولانا نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ دینی و علمی ماحول تھا اور اس میں تاریخ و ادب کی آمیزش تھی۔ مولانا کے دادا مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی مؤرخ، ادیب اور شاعر تھے۔ والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ اسلامیان ہند کی تاریخ کے سب سے بڑے مصنف، صاحب ذوق مؤرخ و ادیب تھے، دعوتی فکر بھی ان کو ورثہ میں ملی تھی۔ برادر معظم مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالحی صاحب جن کی آغوش تربیت میں حضرت مولانا نے ترقی کے منازل طے کیے بڑے وسیع النظر اور وسیع الفکر عالم تھے، علوم جدید اور علوم قدیم کا ان کو بہترین سنگم قرار دیا جاسکتا ہے، دین پر عقیدہ اور عملاً تہلب ان کی بنیادی خصوصیت تھی۔ انہوں نے اس انداز سے حضرت مولانا کی تربیت کی کہ وہ وسیع پیمانہ پر دعوت کا کام انجام دے سکیں۔ علوم شریعت کے علاوہ تاریخ و ادب کا اچھا ذخیرہ گھر کے کتب خانہ میں موجود تھا، حضرت مولانا نے اس سے فائدہ اٹھایا، تعلیم کے دوران پھر اسی تعلیم سے فراغت کے بعد خاص طور پر مطالعہ میں وسعت اور انہماک پیدا کیا، عالم اسلام کی تاریخ بھی پڑھی، دوسرے ادیان و مذاہب کی تاریخ کا بھی مطالعہ کیا اور حالات حاضرہ پر مشتمل مواد سے بھرپور کتابوں کو بھی دیکھا۔ انگریزی میں اتنی استعداد پیدا کر لی کہ ضروری مواد کا مطالعہ براہ راست ممکن ہو سکے۔ دعوت کی تڑپ کے ساتھ تاریخ کا خاص ذوق ان کو ورثہ میں ملا تھا، مطالعہ کی وسعت

سے اس کو جلا ملی۔ تاریخ کا مطالعہ حضرت مولانا نے دعوتی فکر و نظر سے کیا اور اس سے وہ لعل و گہر تلاش کیے جن کی طرف عام طور پر محققین کی نگاہ نہیں پہنچتی۔ چودہ صدیوں پر محیط دعا، مصلحین اور مجددین دین کے تجربات سے انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور دعوتی میدان میں جگہ جگہ اس سے کام لیا۔ انہوں نے تاریخ کے مطالعہ سے دعوت کے وہ ذریعے اصول پیش فرمائے جو صدیوں دعوت کا کام کرنے والوں کے لیے رہنمائی کرتے رہیں گے۔

شیخ یوسف القرضاوی فرماتے ہیں کہ ہم تاریخ و سیرت کی کتابیں پڑھتے ہیں اور گزر جاتے ہیں لیکن شیخ ان میں سے وہ لعل و جواہر تلاش کر لیتے ہیں جن کی طرف ہماری نگاہ بھی نہیں پہنچتی۔

ذاتی زندگی کے اوصاف و کمالات

حضرت مولانا کی زندگی ان تمام بنیادی صفات سے آراستہ تھی جو وسیع پیمانہ پر دعوت کا کام کرنے والوں کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ وہ حقائق پر گہری نگاہ رکھنے والے، حکمت و تدبیر کے امام، زبان و ادب کے رمز شناس ہی نہیں بلکہ اس کو نیا رخ دینے والے، ساری انسانیت کے لیے دھڑکتا ہوا دل رکھنے والے، فکر امت میں سیرت نبوی ﷺ کی جھلک لیے ہوئے اور اخلاق نبوی ﷺ کا پر تو تھے۔

ایک داعی کے لیے خاص طور پر جب اس کو ملوک و امراء کے طبقہ میں کام کرنا ہو، ایک اہم اور بنیادی صفت زہد و استغناء کی ہے۔ مولانا کی زندگی میں اس کے ایسے واقعات موجود ہیں جو سلف صالحین کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ ملوک و امراء ان کے در پر آئے، شاہوں کے محلات میں تشریف آوری کی درخواست قبول فرمائی مگر اسی داعیانہ مزاج اور شان استغناء کے ساتھ، اپنی بات کہی مگر اخلاق کریمانہ کے ساتھ۔ زہد و استغناء کے بعد عام طور پر مزاج میں جو حدت اور خشکی پیدا ہو جاتی ہے اس سے کوسوں دور۔ یہ جامعیت اگر نایاب نہیں تو کیا ب ضرور ہے۔

ملوک و امراء میں حضرت مولانا کی دعوت کا طریقہ کار کیا تھا اور کس پیمانہ پر یہ کام انجام پاسکا قبل اس کے کہ یہ حقائق بیان کیے جائیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے عالم

اسلام کا ایک مختصر جائزہ بھی پیش کر دیا جائے۔

چودھویں صدی کے عالم اسلام کا ایک اجمالی خاکہ

انیسویں صدی عیسوی کے آغاز ہی سے مغربی تہذیب نے بال و پر نکالنے شروع کر دیے تھے، یہ ایک تازہ دم قوت و وسائل سے بھرپور تحریک تھی جس نے انیسویں صدی کے پورے ہوتے ہوتے زار و زار عالم اسلام کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا، شروع میں مختلف اسلامی ملکوں میں اس کی مزاحمت کی کوشش کی گئی لیکن اس کے لیے جو فہم و شعور اور حوصلہ کی ضرورت تھی اس کی پورے عالم اسلام کے قائدین و حکام میں کمی تھی۔

اس تہذیب میں اچھائیاں بھی تھیں اور برائیاں بھی، خوبیاں بھی تھیں اور خرابیاں بھی، اس کے اجزاء ترکیبی میں بعض اجزاء مضرتھے اور بعض مفید بھی، غلط بھی تھے اور صحیح بھی۔ اس وقت اس کی شدید ضرورت تھی کہ اس کا غائرانہ مطالعہ کیا جائے، اس کے محاسن و معائب کو الگ الگ کر کے بیان کیا جائے، اس کی خوبیاں قبول کی جائیں اور خامیاں رد کر دی جائیں، لیکن اس میں توازن باقی نہ رہ سکا۔ کچھ ملکوں نے اس کے سامنے بالکل ہی سپر ڈال دی اور پوری طرح اس تہذیب کو قبول کر لیا، اور بعض ممالک ایسے بھی تھے جو پوری طرح اس سے دور رہنے کی کوشش کرتے رہے، ان میں خاص طور پر یمن اور افغانستان پیش پیش تھے لیکن ان کے رہنماؤں میں بھی تدبیر اور دوراندیشی کی کمی کا نتیجہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔

اس تہذیب کے جدید علوم اور مفید وسائل سے دست کش ہو کر اپنی محدود دنیا میں محصور رہنا زیادہ دنوں تک ممکن نہ تھا، ایک ایک کر کے تمام مشرقی ممالک مغربی تہذیب کا قلمہ تر بن گئے، اور بیسویں صدی کے وسط تک اس تہذیب نے اپنے تمام نقائص کے ساتھ پوری اسلامی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور کوئی اسلامی ملک ایسا نہ بچ سکا جہاں اس نے اپنے پنچے نہ گاڑ دیے ہوں۔

وقت کی ضرورت

ایسی صورت حال میں اس کی شدید ضرورت تھی کہ ایسے بالغ نظر علماء و مفکرین، مصلحین اور داعیان دین کھڑے ہوں جن کی حقائق پر نگاہ ہو، دین پر اعتماد بحال کرنے کی

صلاحیت ہو اور وہ اس نئی تہذیب کے ماضی و حال سے پوری طرح واقف ہوں، وہ عوام و خواص کو اس کی حقیقت سے باخبر کرا سکیں اور امراء و حکام، سلاطین و وزراء کی رہنمائی کا کام بھی کر سکیں۔

حضرت مولانا کی دعوتی زندگی کا آغاز اسی صورت حال میں ہوا، انہوں نے پوری بصیرت اور حقیقت پسندی کے ساتھ حالات کا مطالعہ کیا، دعوت و اصلاح کی تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے اور اس کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دعوت کا لائحہ عمل طے فرمایا اور اسی کی روشنی میں دعوتی زندگی شروع کی، ہر طبقہ کو انہوں نے اپنی دعوت کا مخاطب بنایا، خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ کو متاثر کیا، سلاطین و امراء کی دینی و فکری رہنمائی میں آپ نے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔

حکام و سلاطین میں تبلیغ دین کا طریقہ کار

دین کو اقتدار میں لانے کے لیے مولانا دعوت کے پہلے طریقہ کار ہی کو مناسب اور موزوں خیال فرماتے تھے، حضرت مجدد الف ثانی کا طریقہ دعوت و ارشاد ان کے سامنے تھا۔ ۱۴۱۴ء میں شکاگو کی ایک مجلس میں سوال کیا گیا کہ دنیائے اسلام میں اسلامی نظام کیسے قائم و نافذ ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ :

”دو طریقے ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ دین و ایمان والوں کو کرسی تک پہنچایا جائے یا پھر دین و ایمان کو کرسی والوں تک پہنچایا جائے۔ پہلے طریقہ کار میں خدشہ اس بات کا ہے کہ کرسی والے کرسی چھوڑنے پر کرسی توڑنے کو ترجیح دیں اور معاملات احسن کے بجائے اور ابر ہو جائیں۔ دوسرا طریقہ مدت طلب ضرور ہے، لیکن پائیدار ہے اور شاید اس کے بغیر چارہ کار بھی نہ ہو۔ حضرت مجدد الف ثانی کی تحریک تجدید سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ کرسی کرسی والوں ہی کو مبارک ہو، دیندار تو اس کی اصلاح چاہتے ہیں نہ کہ کرسی۔“ (۱)

دینی تحریکات اور جماعتوں کے بارے میں مولانا یہی مناسب سمجھتے تھے کہ وہ ممکن حد

تک سیاست سے علاحدہ ہو کر دینی و فکری رہنمائی کا کام کرتی رہیں، اور قبل از وقت سیاسی یا انقلابی اقدام سے گریز کریں البتہ اگر اس کی ضرورت پیش آجائے تو پھر کوئی کوتاہی نہ ہو۔ یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ ان کا دل جہاد و شہادت کے جذبہ سے سرشار تھا، متعدد مواقع پر اس کا اظہار ہوا۔ بعض اسلامی ملکوں میں فوج کے سامنے خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :

مجھے بے شمار ایسے اجتماعات اور مجالس میں شرکت کا موقع ملا ہے جن میں علماء و مقررین کی کثرت ہوتی تھی، اور جن میں بہت سی یکتائے روزگار شخصیات جلوہ افروز ہوتی تھیں لیکن آج جو سرشاری، جو رقت، جو خشوع اور جو سعادت و لذت محسوس کر رہا ہوں وہ زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں محسوس ہوئی تھی۔ اگر میرے بس میں ہوتا اور اس کی اجازت ہوتی تو میں آپ میں سے ہر فوجی کی دست بوسی کی کوشش کرتا کیونکہ آپ کا ہاتھ اسلام کے لیے برسرِ پیکار ہے، آپ کا ہاتھ اس لیے ہتھیار پکڑتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی مدافعت کرے۔“ (۱)

حضرت مولانا کی فکر اس سے صاف ظاہر ہوتی ہے۔ ان کو ہر وہ نفاذ پسند تھا جو اسلام کا محافظ ہو اور ہر وہ تحریک ان کو عزیز تھی جو اشاعتِ دین اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے فریضہ میں مشغول ہو، وہ اپنے حقیقت پسندانہ ذہن، بالغ نظری اور وسعتِ مطالعہ سے یہ سمجھتے تھے کہ موجودہ حالات میں تبلیغِ دین کا بہتر طریقہ یہی ہے کہ دین کو کرسی والوں تک پہنچایا جائے، دیندار لوگوں کے لیے کرسی و اقتدار کے حصول کی جو کوششیں زمانہ حال میں کی گئیں وہ زیادہ کامیاب نہیں ہو سکیں، اور عام طور پر ایسی تحریکات کچل کر رکھ دی گئیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو دینی و دعوتی کام وہ کر سکتی تھیں اس کا دروازہ بھی بند ہو گیا، تاہم وہ اس کے قائل تھے کہ اس طرح کی جو کوششیں صحیح نیت اور صحیح اصول کے مطابق کی جاتی ہیں وہ خواہ عملاً ناکام ہو جائیں لیکن ان کا ذہنی اثر، قربانی اور جدوجہد کا تسلسل کچھ کم قیمتی نہیں، خود مولانا ہی کے الفاظ میں :

”اسلامی تاریخ کی آبرو انہی جواں مردوں سے قائم ہے جنہوں نے غلط اقتدار اور مادی ترغیبات کے سامنے سہم نہیں ڈالی، اور صحیح مقصد کی خاطر اپنے

خون کا آخری قطرہ بہا دیا۔“ (۱)

اپنے اسی توازن اور اعتدال کے ساتھ مولانا نے اپنی دعوتی زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا۔ یہ ۱۹۳۹ء کا زمانہ ہے جب وہ سیرت سید احمد شہیدؒ کی تالیف سے فارغ ہو چکے تھے اور کتاب نے دینی و دعوتی حلقوں میں خاصی مقبولیت حاصل کر لی تھی، یہی وہ زمانہ ہے کہ عصری تہذیب نے دلوں اور دماغوں کو مسحور کر رکھا تھا، یہ نئی تہذیب اپنے سائنسی اکتشافات اور اسباب آرائش کی کثرت کی بنا پر ہر جگہ جڑ پکڑ چکی تھی۔

اسی تہذیب سے اپنا دامن بچانے کی تہا شکر حضرت مولانا کی رائے میں یہی تھی کہ اس کے مفید اجزاء قبول کیے جائیں اور اس کے جواجزاء اسلامی عقیدہ اور عمل کے خلاف ہوں ان کو رد کر دیا جائے۔ حضرت مولانا نے اس تہذیب کا مطالعہ کر کے اس کا تجزیہ فرمایا اور اس پر مبصرانہ تنقیدیں کیں اور مدافعانہ اسلوب اختیار کرنے کے بجائے اس پر ایسے تیشے چلائے کہ بہت سے ذہن اس سے صاف ہوئے، اور خواص و عوام میں اس کی حقیقت آشکارا ہوئی۔ اس عمومی دعوت کے ساتھ حضرت مولانا نے اس کو ضروری سمجھا کہ مختلف اسلامی ملکوں کے سربراہوں کو خاص طور سے دین کی طرف متوجہ کیا جائے اور ان ہی کو دینی فکر کا محافظ بنانے کی کوشش کی جائے، اس کے ساتھ ان کو ملکی اصلاحات کی طرف بھی متوجہ کیا جائے۔

ملوک و امراء اور حکام و سلاطین کی دینی و فکری رہنمائی حضرت مولانا کی دعوتی زندگی کا ایک روشن باب ہے۔ انہوں نے ملاقاتوں کے ذریعہ سے بھی ان کے ذہنوں کو صحیح رخ پر لانے کی کوشش کی اور مراسلت کے ذریعہ سے بھی ان کو ہدایات دیں اور اس کے مختلف ملکوں میں خاطر خواہ اثرات مرتب ہوئے۔

سعودی عرب

حجاز مقدس ہی اسلام کا سرچشمہ ہے، وہیں سے اسلام کی نمود ہوئی، وہاں کی مٹی بھی ہر مسلمان کے لیے کیمیا کی حیثیت رکھتی ہے

ع خاک یثرب از دو عالم خوشتر است

عالم اسلام میں اس کو وہی مقام حاصل ہے جو جسم میں دل کو لیکن افسوس ہے کہ اس کو بھی

صدیوں سے ایسے حکام میسر نہ آ سکے جو اس کی ظاہری عظمت و شوکت کو قائم کر سکیں اور ظاہری طور پر بھی دنیا کے نقشہ میں اس کو کوئی اہم مقام دلا سکیں، سعودی حکومت جب سے قائم ہوئی بلا شبہ نظام میں بہتری آئی، مملکت میں امن و امان قائم ہوا، بدعات و خرافات کا خاتمہ بھی ہوا، ملکی اصلاحات کی طرف بھی توجہ کی گئی لیکن سعودی حکام کو جس طرح ملک کو ترقی کی راہ پر ڈالنا چاہیے تھا اور ترقی پذیر ملکوں کی صف میں داخل ہونے کی کوشش کرنی چاہیے تھی وہ نہ کی جاسکی اور غالباً اس کا ایک بڑا سبب ان سلاطین و حکام میں سیاسی سوجھ بوجھ اور پلاننگ کی صلاحیت کی کمی تھی۔ محمد اسد صاحب (سابق لیو پولڈ ویس) اپنی مشہور کتاب "The Road to Mecca" میں سلطان بن سعود سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”میں نے جب گندم کی پیداوار کے لیے پروجیکٹ رکھا اور بتایا کہ اس میں تقریباً پانچ اور دس سال کے درمیان کا عرصہ لگے گا تو سلطان نے صاف کہہ دیا کہ یہ تو بڑی مدت ہے، دس سال پہلے سے ہم منصوبے اور نقشے تیار کریں یہ ہمارے مزاج اور خواہش کے لحاظ سے بڑی مدت ہے۔“ (۱)

اس سے سلطان کی بصیرت کی نارسائی اور تنظیمی اسپرٹ کی کمی ظاہر ہوتی ہے۔

اپنے خول میں یہ نظام کب تک چل سکتا تھا، کتنی سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی قوتیں اس کے دروازہ پر دستک دے رہی تھیں، اور اس کا خطرہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ فرسودہ نظام مغربی تہذیب کے آگے جلدی ہتھیار ڈال دے گا پھر اس سے بے محابہ اختلاط کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ اپنی روایتی شکل کھو دے گا بلکہ اپنی روحانی جڑوں اور سرشتوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا!!

یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا اور مغربی تہذیب عالم اسلام کے مقدس مرکز میں فاتحانہ داخل ہو گئی، جدید مصنوعات اور مغربی مال سیلاب کی طرح امنڈ پڑا، سامانِ تعیش اور غیر ضروری اشیاء سے بازار پرٹ گئے اور عربوں کی وہ خصوصیات بھی ناپید ہو گئیں جو قدیم زمانہ سے ان کا مابہ الامتیاز سمجھی جاتی تھیں۔

حضرت مولانا محمد امجد علیؒ ۱۹۲۷ء میں پہلی مرتبہ حج کی ادائیگی کے لیے حجاز مقدس تشریف لے

گئے، یہ وہ زمانہ تھا کہ ملک دوسری پٹری پر پڑ چکا تھا، حالات بدلنے شروع ہو گئے تھے۔ حضرت مولانا نے ایک دردمند اور صاحب بصیرت داعی کی آنکھوں سے وہ سب دیکھا، ان کے دل پر اس کا اثر پڑا، سفر سے واپسی کے دن انہوں نے وہاں کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ولی عہد مملکت امیر سعود کو ایک بصیرت افروز دردمندانہ اور ناصحانہ مکتوب تحریر فرمایا۔ یہیں سے طبقہ حکام و امراء میں مولانا کی دعوتی کوششوں کا آغاز ہوتا ہے۔ مولانا نے اپنے پورے قیام میں جس استغناء کے ساتھ دعوت و تبلیغ کا کام انجام دیا اور جو مناسب اسلوب اس کے لیے اختیار کیا اس کے نتیجہ میں وہاں کے متعدد اصحاب فکر و عمل ان سے متاثر ہوئے، ان میں ایک نمایاں نام شیخ عمر بن حسن آل الشیخ کا ہے جو ”ہیئۃ الأمر بالمعروف والنہی عن المنکر“ کے رئیس تھے اور امیر سعود کے بڑے معتمد بھی تھے، یہ خط حضرت مولانا نے ان ہی کے ذریعہ سے امیر موصوف کو ارسال فرمایا، بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے خود یہ مکتوب امیر کو پڑھ کر سنایا۔

خط میں حضرت مولانا نے مملکت کی اہمیت و عظمت بیان فرمائی ہے، مسلمانوں کی اس سے جو توقعات ہیں ان کا تذکرہ کیا ہے پھر اس غلط رخ کا ذکر فرمایا ہے جس پر عام طور سے حکومتیں پڑ جایا کرتی ہیں اور اس کی ضروری اور مناسب اصلاحات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مولانا نے یہ مکتوب اس امید میں تحریر فرمایا تھا کہ کل زمام کار امیر کے ہاتھ میں ہوگی، اگر ان اصلاحات کو ان کے ذہن نے قبول کر لیا تو بہتر تبدیلی کی توقع کی جاسکتی ہے، مگر اس وقت امیر موصوف اس کی طرف توجہ نہ دے سکے اور اس کی اہمیت شاید ان کے ذہن میں نہ آسکی یا وہ حالات سے مجبور ہو گئے اور ان کے زمانہ میں بھی مملکت کی گاڑی اسی پٹری پر چلتی رہی جس پر پہلے سے رواں دواں تھی۔

حضرت مولانا نے ۱۹۵۱ء میں حجاز مقدس کا دوسرا سفر کیا اور اس میں وہاں طویل قیام فرمایا۔ پہلے اور دوسرے سفر کے دوران تقریباً چار سال کا وقفہ ہے، اس وقفہ میں وہاں کے حالات تقریباً بدل چکے تھے، نئی تہذیب نے پوری طرح اپنے پنجے گاڑ دیئے تھے، ہر اس چیز کی قیمت تھی جو ”وہاں“ سے درآمد کی جائے، نگاہیں اس تہذیب کی ملج ساز یوں سے خیرہ

ہو رہی تھیں اور دل اس کی طرف مائل تھے۔ ان حالات سے حضرت مولانا کی حساس طبیعت اور دردمند دل پر ایک چوٹ پڑی۔ ایک مکتوب میں جو برادر معظم کے نام ارسال کیا گیا تھا ان کے محتاط قلم سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل گئے :

”کوئی نہیں جانتا کہ خوبصورت عربی لباس میں کتنے دل اور دماغ خالص مغربی بن چکے ہیں، زندگی کا تصور اس کے بغیر ممکن نہیں کہ امریکہ کے سائے میں پناہ لی جائے اور ترقی کی جائے وہ بائے عام کی طرح اس کا اثر فضاء اور ہوا میں ہے۔ (۱)

حضرت مولانا نے اس فضا کو بدلنے کے لیے پوری کوشش کی، دعوتی رسائل، خطابات اور ملاقاتوں کے ذریعہ ہر طبقہ کے لوگوں کو متاثر فرمایا۔ خلوص و دردمندی اور جوش دروں کے ساتھ ان کو ادبی ذوق حاصل تھا، اس سے وہاں کے حالات پر اثر پڑا اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ایک جماعت حضرت مولانا کی فکر و دعوت کو لے کر اٹھ کھڑی ہوئی، لیکن اب بھی وہاں کے اکثر نوجوان اور تعلیم یافتہ لوگ دین سے بے پرواہ اور تہذیب نو کے دلدہا تھے۔ انہیں ایام میں مولانا کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ اب باقاعدہ حکومت میں بھی آزادی کا رجحان پیدا ہونے لگا ہے، اور وہ سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کر رہی ہے کہ مغربی تہذیب کے ایک حصہ کو پوری طرح اپنالیا جائے اور عوام کو راحت پہنچانے کے نام پر تمام جدید وسائل تمدن، آلات تفریح کی آزادی دے دی جائے۔ یہ ایک بہت غلط رجحان تھا جو پیدا ہو چلا تھا۔ مولانا نے اس سے پہلے امیر سعود کو جواب بادشاہ مملکت تھے ایک مکتوب کے ذریعہ سے ہدایات دے چکے تھے، اس لیے حضرت مولانا نے مناسب سمجھا کہ بجائے سلطان کے ولی عہد مملکت سے ملاقات کر کے ان کو متوجہ کیا جائے، شاید وہ ان ہدایات پر سنجیدگی سے غور کریں۔ اتفاق سے انہیں دنوں امیر مدینہ منورہ تشریف لائے، مولانا نے ان سے تخیل میں گفتگو کی اجازت چاہی، انہوں نے فراخ دلی کے ساتھ موقع دیا۔ حضرت مولانا نے بنیادی طور پر ایک تحریر بھی تیار کر لی تھی جو ولی عہد موصوف نے ملاحظہ کی، پھر اسی کی روشنی میں حضرت مولانا نے گفتگو فرمائی اور ان خطرات سے آگاہ کیا جو مملکت کو درپیش تھے، امیر نے بہت سنجیدگی سے گفتگو سنی اور اس سے پورا اتفاق کیا۔ اللہ تعالیٰ نے امیر موصوف کو بہت کھلا ہوا ذہن اور وسیع دماغ دیا تھا۔ حضرت مولانا کی

اس گفتگو سے ان کے دل میں فکر اسلامی کا بیج پڑ گیا جو بعد میں برگ و بار لایا۔

اس کے بعد حالات میں تغیرات آتے رہے، گرد و پیش کے سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی عوامل کے سبب حکومت کے رجحان و عمل میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ حضرت مولانا ہمیشہ ان تغیرات کا جائزہ لیتے اور ضرورت ہوتی تو حکام و سلاطین کو ہدایات دیتے۔ اسی طرح کی بعض نامناسب تبدیلیاں اور آزادانہ اقدامات کا جب ان کو علم ہوا تو انہوں نے امیر فیصل ہی کو دوبارہ متوجہ کیا اور ایک بصیرت افروز مکتوب ان کو ارسال فرمایا۔ اس میں مملکت کی اہمیت و عظمت بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں :

”مسلمانوں کے جذبات کی رعایت اور حکیمانہ سیاست کا یہ تقاضا ہے کہ یہاں جو قاعدہ قانون بنے، جو نصب العین طے ہو یا حکومت کی جو پالیسی بھی قرار پائے اس میں اس مملکت کی مخصوص شخصیت، اس کی عالم گیر مرکزیت، اس کی دائمی دعوت کا پورا لحاظ رکھا جائے اور ہر اس چیز سے بچا جائے جو اس کے اصول و عقائد کے منافی ہو اور اس کی شخصیت و حیثیت کو داغدار کرتی ہو۔“ (۱)

مرض کے غلط علاج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”بعض لوگوں کا خیال ہے کہ زندگی کو خوشگوار اور آرام دہ بنانے والی چیزوں کو اپنانے اور مغرب کے پیچھے چلنے والی متمدن دنیا کی تقلید میں جدید ذرائع ابلاغ، آزاد و بے قید نشریاتی پروگراموں اور مغربی زندگی کے مظاہر کو اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں، اس سے عوام کی بے چینی کا علاج ہوتا ہے اور وہ غلط ڈھنگ سے سوچنے سے بچ جاتے ہیں مگر مجھے معاف رکھا جائے کہ میں تاریخ اور تجزیہ کی روشنی میں اس سے اتفاق نہیں کر سکتا، میرے ناقص خیال میں یہ کوئی علاج نہیں، سمندر کا کھاری اور نمکین پانی تو پیا سے کو سیراب کرنے کے بجائے اس کی پیاس اور بڑھا دیتا ہے۔“ (۲)

مرض کے: لاج اور مملکت کے استحکام و ترقی کے اصول بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :

(۱) حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب امیدوں اور اندیشوں کے درمیان صفحہ: ۳۵

(۲) حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب امیدوں اور اندیشوں کے درمیان صفحہ: ۳۵

”صحیح علاج اسلام کے عدل اجتماعی کا قیام، ملک کی صنعت و تجارت کی ترقی، رزق حلال کی فراہمی، خود کفیل بنانے کے وسائل، کارخانوں کی تعمیر زندگی کی ضرورتوں کا سستا ہونا اور جائز سہولتوں کی فراہمی ہے جن کا میدان جنگ اور محدود نہیں جیسا کہ شریعت اور انسانی فطرت سے ناواقف افراد سمجھتے ہیں۔“ (۱)

مکتوب کے اخیر میں ان کی دینی حمیت اور عزت کا حوالہ دے کر مخاطب کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

”میں آپ کو آپ کی ہمت بلند اور اہلیت ارجمند کا واسطہ دیتا ہوں اور اللہ کے عطا کردہ اس جاہ و منصب اور اثر و نفوذ سے کام لینے کی درخواست کرتا ہوں جس سے اس نے آپ کو نوازا ہے، آپ اس کے ذریعہ عمومی و خصوصی زندگی کے کسی بھی شعبہ میں ابھرنے والے اس خطرہ کا مقابلہ کریں اور ان عرب و مسلمان ممالک کی شخصیت کی حفاظت، فکری رہنمائی، رائے عامہ، صحافت، نشریات، علوم و فنون کو صحیح خطوط پر چلانے کے لیے اپنی پوری قوت و توانائی لگا دیں۔

..... دعوت و جہاد کا جو موقع اور میدان اللہ نے آپ کو عطا کیا ہے، وہ ہر ایک کو ہر جگہ اور ہر وقت میسر نہیں آتا.....

ع کہ آتی نہیں فصل گل روز روز

اس لیے میں اخلاص اور اصرار کے ساتھ یہ توقع رکھوں گا کہ آپ اس فرصت کو غنیمت جانیں گے اور اپنے پیغام کو عملی شکل میں نافذ کریں گے۔“ (۲)

امیر فیصل سے ولی عہدی کے زمانہ میں حضرت مولانا کی متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ انہوں نے بخوبی اس کا اندازہ کر لیا کہ مولانا ایک پر خلوص درد مند اور بالغ نظر داعی و مفکر ہیں، صرف دینار و درہم ہی نہیں ان کو دنیا کی عزت و وجاہت سے بھی کوئی سروکار نہیں۔ غالباً بعض ملاقاتوں میں امیر نے کچھ پیش کرنا چاہا تو حضرت نے پورے استغناء کے ساتھ معذرت کر لی۔ امیر کے سامنے یہ واقعہ بھی ضرور آیا ہوگا کہ ان کے ماموں شیخ عمر بن حسن جو حضرت

(۱) حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب امیدوں اور اندیشوں کے درمیان صفحہ ۳۶۔

(۲) ایضاً صفحہ ۳۸

مولانا کے بڑے عقیدت مند اور ان کی فکر کے ترجمان تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ اشرفیوں (سونے کی گنیاں) کی تھیلی حضرت کو نذر کرنی چاہی اور مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی (سابق معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء) کے ذریعہ سے خدمت میں بھیجی۔ حضرت مولانا نے شکریہ کے ساتھ صرف ایک گنتی رکھ لی بقیہ پوری تھیلی واپس کردی۔ اسی طرح کا ایک واقعہ امیر سعود الکبیر کا جو بادشاہ کے چچا ہوتے تھے پیش آیا، انہوں نے چاندی کے پانچ سو سکے بھیجے، حضرت مولانا نے پوری رقم واپس فرمادی۔ (۱)

اسی طرح حضرت مولانا نے جب ۱۹۶۲ء میں کویت کا سفر کیا تو سعودی عرب کے وزیر مالیات شیخ محمد سرور الصبان نے حج و زیارت کے لیے رقم کی پیش کش کرنی چاہی، مگر اس کو بھی حضرت نے قبول نہیں کیا اور کسی کامنوں و احسان مند ہو کر یہ سفر انہوں نے پسند نہیں فرمایا۔ پھر جب اس واقعہ کے چند ہی ماہ بعد شاہ کی تحریک و سرپرستی میں مدینہ منورہ کی جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا تو شاہ سعود مرحوم نے خود حضرت مولانا سے ایک ذاتی مکتوب میں درخواست کی تھی کہ وہ جامعہ میں تشریف لے آئیں، لیکن حضرت مولانا نے یہ پیش کش بھی قبول نہ فرمائی۔ انہوں نے حضرت مولانا کو اس کی مجلس شوریٰ کا رکن اساسی منتخب کیا۔ اسی سال رابطہ عالم اسلامی کا قیام عمل میں آیا، اور اس کے افتتاحی اجلاس میں حضرت مولانا کو خصوصی دعوت دی گئی، شاہ سعود بذات خود اس میں شریک تھے، لیبیا کے فرماں روا ملک اور لیس سنوسی بھی تشریف رکھتے تھے۔ حضرت مولانا نے اس اجلاس میں بعض موقعوں پر جلسہ کی صدارت بھی فرمائی، ایک پر مغز مقالہ بھی پیش فرمایا، یہ شاہ فیصل کی ولی عہدی کا زمانہ تھا۔ یہ سب واقعات بھی ان کی نظروں سے گزرے۔

وہ علماء کے قدر شناس تھے، انہوں نے تجربہ کر لیا تھا کہ حضرت مولانا صرف اپنی دعوت پیش کرنا چاہتے ہیں، اور ان کو اس سلسلہ میں نسبت نبوت حاصل ہے۔ اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں۔ ”وما أسئلكم عليه من أجر“ (میں اس دعوت پر اجرت کا طلب گار نہیں۔) خطوط و ہدایات سے ان کے سامنے مولانا کی بصیرت اور دور اندیشی پوری طرح واضح ہو چکی تھی۔ اس لیے انہوں نے حضرت مولانا کی پوری قدر کی اور ان کی ہدایات سے فائدہ اٹھایا

(۲) میر کارواں صفحہ ۱۵۴ از مولانا عبداللہ عباس ندوی، طبع اول

اور آہستہ آہستہ ان کا ذہن فکر اسلامی کے سانچے میں ڈھلتا گیا۔ پھر جب ۳ نومبر ۱۹۶۳ء میں ان کے ہاتھ میں زمام اقتدار آئی تو انہوں نے ممکن حد تک اس کی کوشش کی کہ مملکت کو عالم اسلام میں مرکزیت حاصل ہو۔ وہ جس وقت برسرِ اقتدار آئے وہ بڑے خطرات کا زمانہ تھا۔ دشمن ہر طرح کی اچھی حرکت سے باز نہ آتے تھے۔ مگر شاہ فیصل نے تھوڑے ہی عرصہ میں ان پر بھی قابو پالیا، اور مخالف منصوبوں اور کوششوں کو ناکام بنا کر عوام کا اعتماد حاصل کر لیا، اور دنیا نے ان کو خادمِ حرمین شریفین، اسلامی اتحاد کے علمبردار اور جملہ اسلامی مسائل کے ایک بہرہوش اور صاحبِ ہوش حامی و داعی کی شکل میں دیکھا۔ انہوں نے ”رابطہ عالم اسلامی“ کو ایک فعال ادارہ بنایا، اور پورے عالم اسلام کو اس سے نفع پہنچا۔

حضرت مولانا ان کی مسلسل رہنمائی فرماتے رہے، اور اہم موقعوں پر ان کو ہدایات دیتے رہے۔ اپنے ایک مکتوب میں جو ۱۹۶۹ء میں لکھا گیا ہے، تاریخی حقائق کی روشنی میں خطرہ کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”میں دیکھ رہا ہوں کہ جزیرۃ العرب کی طرف ایسے خطرناک فتنے منہ پھیلائے ہوئے چلے آ رہے ہیں جو رحم کرنا نہیں جانتے اور جن کے یہاں کسی کا استثناء نہیں۔ اور اب تو تمام عرب ممالک بلکہ اسلامی ممالک الا ماشاء اللہ اشتراکیت و کمیونزم کے تجربے سے گزر رہے ہیں اور فوجی حکام اور انقلابی رہنماؤں اور مطلق العنان لیڈروں کے رحم و کرم پر ہیں۔

عوام کے لیے اسبابِ عیش کی فراوانی اور ان کے جائز و ناجائز مطالبات کی تکمیل اور آرام و راحت کا ہر سامان مہیا کرنے کا تجربہ، بنو امیہ و بنو عباس سے لے کر آج تک کے جملہ اسلامی ممالک اور اسلام کی طویل تاریخ میں ناکام رہا ہے، اور یہ سیاست ہمیشہ ناکام رہی ہے جس میں یہ سمجھا گیا تھا کہ عوام کے اضطراب و بے چینی اور نوجوانوں کی حوصلہ مندی کو ملکی مسائل اور سیاسی حالات پر غور کرنے کے بجائے لذتوں اور مسرتوں اور زندگی کے لطف کی طرف موڑا جاسکتا ہے۔ اس سیاست نے کبھی قوموں کو شکر و احسان مندی اور قدردانی پر آمادہ نہیں کیا۔

..... بلکہ ایسے لوگ پہلی فرصت میں بغاوت پر کمر بستہ ہو گئے اور انہوں نے حکومتوں کا تختہ الٹ دیا۔ یہ لذت کوش اور موقع پرست مادیت کی فطرت رہی ہے، جو دین کے مفہوم سے نا آشنا اور اخلاقی قدروں اور آخرت کے حساب کی منکر ہے۔ اور یہ ہر جگہ کی ایسی کہانی اور ایسا ڈرامہ ہے جو تاریخ کے تمام ادوار میں دہرایا گیا ہے۔ امویوں اور عباسیوں کے اخیر دور میں اور مشرقی اور مغربی حکومتوں کے ساتھ یہی ہوا۔ مصر و شام میں یہی ہوا۔ ماضی قریب میں عراق میں یہی کچھ ہو چکا ہے۔ اور سوڈان میں کچھ دنوں پہلے ہی انقلاب ہوا ہے۔ ان ملکوں میں رعایتوں اور سہولتوں اور عیش و آرام اور تفریح و دلہنگی کے اسباب کی فراوانی نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا، عوام نے ہر سر پھرے کو خوش آمدید کہا۔ اور پہلی فرصت میں انقلاب برپا کر دیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ایمان راسخ، اخلاقی چٹنگی و استقامت، زندگی میں میانہ روی اور اسباب معیشت میں زہد و قناعت اور (مختصر و واضح الفاظ میں) خوف خدا، حساب آخرت کا ڈر، شرم و حیا اور صدق و وفا ہی وہ صفات ہیں جو ناشکری و نافرمانی، مسلسل بے چینی، خیانت و غداری، چڑھتے سورج کی پوجا، ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر لپکنے سے روکتی ہیں۔ بہت ڈرتے ڈرتے یہ بات زبان سے نکال رہا ہوں کہ مقدسات اسلامیہ کو ان سرکش لہروں سے بچانے کی فرصت بہت کم رہ گئی ہے، جو غضبناک انداز میں اس کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ نیز اس کا پورا اندیشہ ہے کہ جزیرۃ العرب بھی ان ازانیت پسند انقلابیوں کا صید زبوں اور لقمہ تر بن جائے، جو ملک کو تباہ اور اسے دیا و آخرت کی ہر نعمت سے محروم کر دیتے ہیں۔ مجھے معاف رکھا جائے اگر میں کہوں کہ یہ آخری فرصت و موقع ہے اور اس مملکت کا بالغ نظر حکمران مہلت کی اس مختصر مدت اور اس خطرے کی شدت سے اچھی طرح واقف ہے، غیر معمولی حالات کا مقابلہ اس عام سیاست سے نہیں ہو سکتا جسے وہ تمام حکومتیں اپناتی رہی ہیں جو ان انقلابات کا شکار

ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان رسمی وروایتی طریقوں میں کوئی کامیابی نہیں رکھی ہے۔ اس لیے وہ کسی ملک میں انقلاب کی لہر کو نہیں روک سکے۔ اس نازک وقت میں تو فیصلہ کن اور جرأت مندانہ اقدامات اور بنیادی اصلاحات اور اللہ سے سچا عہد و پیمان ہی کام آسکتا ہے۔ اس لیے جلالتہ الملک! مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ ہماری مثال قوم یونس جیسی ہے۔ جس نے آخری ساعت میں اللہ تعالیٰ سے اپنے صدق و اخلاص اور توبہ و رجوع کا اظہار کیا، اور اپنی حالت بدلی، تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس کے ساتھ اپنا معاملہ بدل دیا۔“ (۱)

مکتوب میں حضرت مولانا نے دینی اصلاحات کی طرف خصوصی توجہ دلائی ہے اور بڑی جرأت کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں :

”اس تضاد اور رد عمل کا خاتمہ ہونا چاہیے جو جلالتہ الملک کے اعلانات و عزائم کے باوجود اس ملک میں پائی جاتی ہیں۔ اور جس کے مظاہر نظام تعلیم، ذرائع ابلاغ، نشریات و ثقافت اور اخلاق و معاشرے میں روزمرہ دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ تفریح اور لہو و لعب، ہیجان انگیز افسانوں، اور درآمد کیے ہوئے پروگراموں کی طرف عوام کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے، اور جس کے سبب والدین، مربی، اساتذہ، اور علماء کے ہاتھوں سے زمام کار ٹکٹی جا رہی ہے، اور جس کے ہوتے ہوئے کوئی بھی قوم اپنا باقی ماندہ دینی شعور اور اخلاقی پاکیزگی برقرار نہیں رکھ سکتی، اور ہنگامی اور ناگہانی حالات و حوادث کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اور کسی بیرونی خطرہ سے نہیں نمٹ سکتی۔“ (۲)

اس خط میں بڑی جرأت کے ساتھ حضرت مولانا نے اس پر بھی نکیر فرمائی کہ شاہی خاندان میں دولت کی ریل پیل اور بعض وسائل اور اسباب معیشت پر ان کی اجارہ داری، دولت کا اکتنا زور اور افراط زر، یہ سب باتیں نہایت مضر ہیں، اور کمیونزم اور اشتراکیت کی راہ ہموار کرتی ہیں جس کے نقصانات مسلم ہیں۔

(۱) حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب امیدوں اور اندیشوں کے درمیان صفحہ ۴۲-۴۳

(۲) حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب امیدوں اور اندیشوں کے درمیان صفحہ ۴۵

مکتوب کے اخیر میں حضرت مولانا نے اس خطرہ سے بھی آگاہی دی ہے جو بالآخر پیش آیا۔ تحریر فرماتے ہیں :

”انانیت پسند عرب قائدین پر اعتماد نہ کیا جائے جن کو صرف اپنے ذاتی مصالح و مفادات سے غرض ہے، جن کے بارے میں قرآن مجید نے کہا ہے :

”لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلَّا وَلَا ذِمَّةً. (توبہ-۱)

(وہ کسی مومن کے رشتہ اور تعلق کا لحاظ نہیں کرتے۔)

اور جن کی صفت یہ بیان کی ہے کہ :

يُرْضَوْنَكَ بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَىٰ قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ (توبہ-۸)

(وہ تمہیں اپنی زبانی باتوں سے خوش کرتے ہیں حالانکہ ان کے دلوں میں کچھ اور ہوتا ہے اور ان میں سے اکثر فاسق لوگ ہیں۔)

یہ قائدین اپنے حلیفوں کی حکومت کا تختہ الٹنے اور انقلاب لانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، انہیں کسی ملک کا استحکام اور خوش حالی پسند نہیں، انہیں مسلمانوں اور عربوں کے مقابلہ میں یہود عزیز ہیں، یہ لوگ پہلی فرصت میں ان لوگوں سے انتقام لیتے ہیں جنہوں نے آڑے دھنوں میں ان کی مالی مدد کی تھی، انہیں مصیبت سے نکالا تھا، وہ اپنی نشریات و صحافت کے ذریعہ اس طرح ان کے دن برے کرتے ہیں، ان کے عیوب اچھالتے ہیں، اور ان کی خوبیوں پر پردہ ڈالتے ہیں جیسے ان سے کبھی دوستی کا رشتہ ہی نہ تھا۔ قرآن کہتا ہے :

كَأَن لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُ مَوَدَّةٌ (النساء-۷۳)

(گویا کبھی تمہارے اور ان کے درمیان محبت رہی نہیں۔)

اس کے برعکس ملک اور بیرون ملک کے سچے اور مخلص لوگوں پر اعتماد کرنا چاہیے جنہیں آپ سے عقیدت اور جذباتی تعلق ہے، اخلاص و وفاداری جن کا دین و ایمان ہے، جو اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے عداوت پر عقیدہ رکھتے ہیں،

اور ان کی غرض اللہ کا قرب اور اللہ کے دین کی سر بلندی، بغیر کسی مالی منفعت یا ذاتی و سیاسی مصلحت کے ہوتی ہے، مشکل وقتوں میں یہی لوگ قوت بازو ثابت ہوتے ہیں، اور کام آتے ہیں، یہ اخلاص صرف گہرے ایمان، بے لچک دینداری، روحانی تعلق، اور ایسی صاف دلی سے پیدا ہوتا ہے جس میں کسی شبہہ کی گنجائش نہیں ہوتی، حکومت اور انتظامیہ میں ان کا وجود، داخلی و خارجی سیاست میں ان پر اعتماد، کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

برخلاف اس کے موقع پرست، نامذہبی اصول، حکومت پر عقیدہ رکھنے والے عناصر کا کوئی دین و ایمان نہیں، ان کے یہاں اخلاق و عقیدہ کی کوئی اہمیت اور ان کے دل میں بلا مقدسہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں، وہ اپنی خواہشوں اور مصلحتوں کے بندے ہیں اور اپنے غیر ملکی آقاؤں کے اشاروں پر کام کرتے ہیں۔

یہ سب باتیں جو لکھی گئیں، اخلاص اور اس مملکت اور اس شخصیت سے محبت و تعلق کا نتیجہ ہیں جسے اللہ نے ان بلا مقدسہ کی خدمت و حفاظت سپرد کی ہے، اور اس کا محرک یہ احساس ہے کہ فتنے اور خطرات اس مقدس و محبوب سر زمین کی فیصلوں تک پہنچ گئے ہیں، اور وہ اس کے دروازوں پر دستک دے رہے ہیں۔

جلالۃ الملک کی وسیع معلومات اور نادر ذکاوت، مجھے مزید طوالت و تفصیل اور شرح و تعلیل سے روکتی ہے۔ واللہ المستعان“۔ (۱)

شاہ فیصل مرحوم کی بیدار مغزی، دینی فکر اور صلابت رائے سے امریکہ و یورپ میں بڑے خطرات محسوس کیے جانے لگے تھے، اور ان کو یہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ اگر یہ شخص زیادہ دنوں تک برسر اقتدار رہ گیا تو ان کا بنانا یا سارا کھیل بگڑ کر رہ جائے گا، یہ چیز ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ انہوں نے راستہ سے اس رکاوٹ کو ہٹانے کی کوشش کی، اور اسی خاندان کے ایک فرد کو اس کے لیے تیار کیا جس نے موقع پا کر اچانک شاہ کو شہید کر ڈالا، بعد میں مغربی میڈیا نے یہ کہہ کر اس پر پردہ ڈال دیا کہ قاتل دماغی طور سے مفلوج تھا اور یہ کام اس نے یا گل پن میں انجام دیا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کو باقاعدہ ایک سازش کے طور پر تیار کیا گیا

تھا کہ اسلام کا ایک قائد جس سے مسلمانوں کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں راستہ سے ہٹا دیا جائے اور امریکہ و یورپ سہولت کے ساتھ اپنے مقاصد کی تکمیل کر سکیں۔

اس حادثہ کا حضرت مولانا کو بہت صدمہ ہوا اور برسوں کی درد مندانہ و مخلصانہ محنت و کوشش جو برگ و بار لانے لگی تھی اور اس کے نتائج ظاہر ہونے لگے تھے اچانک ملک کی شہادت سے اس پر گہرا اثر پڑا۔

شاہ فیصل مرحوم کے بعد شاہ خالد نے زمام سلطنت سنبھالی اور امیر فہد کو ولی عہد مقرر کیا۔ دولت کی فراوانی نے ملک کو جدید تمدن کے راستہ پر ڈال دیا تھا۔ مادیت کی لہریں اس کو اپنی گرفت میں لے رہی تھیں۔ اس کے نتیجہ میں اخلاقی بیماریاں بڑھنے لگی تھیں۔ حضرت مولانا حالات کا جائزہ لیتے رہے، پھر اپنے ایک سفر میں ریاض تشریف لے گئے، اور شاہ خالد سے ملاقات کر کے ان کو بگڑتے ہوئے حالات سے آگاہ کیا اور اس کے اسناد کی تدبیریں بھی بیان فرمائیں۔ اور اس کے علاوہ امیر فہد کو جو اس وقت ولی عہد مملکت تھے ایک بصیرت افروز مکتوب تحریر فرمایا۔ اس میں شاہ فیصلؒ کی توجہ اور کوشش کا حوالہ بھی دیا تھا، اور ضروری اصلاحات کی طرف متوجہ فرمایا۔ ملک کو درپیش خارجی خطرات کی نشاندہی کرنے کے بعد اندر موجود خطرات کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :

”..... رہا داخلی خطرہ تو میرے نزدیک پہلے سے کہیں زیادہ بڑھا

ہوا ہے۔ امیر معظم! صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ملک اس وقت تیزی سے خودکشی کے راستہ پر جا رہا ہے اور قوم کو دو طوفانی موجیں گھیرے ہوئے ہیں۔ ایک موج مال کی ہوس، اس میں اضافہ کی حرص، جائز و ناجائز ہر طریقہ سے اس کے حصول کی کوشش ہے۔ جس کے سبب تمام دینی و اخلاقی قدریں، احترام انسانی اور عالم اسلام سے آنے والوں اور یہاں بسنے والوں کے مفاد بھلا دیئے گئے ہیں۔ اس رجحان کو ہم مادیت اور ہوس کی ”ہسٹریا“ سے تعبیر کر سکتے ہیں، جس کے سبب عجیب و غریب اور پیچیدہ مشکلات سامنے آرہی ہیں۔

دوسری سرکش موج آرام طلبی و تفریح کا حد سے بڑھا ہوا شوق و شغف ہے۔ ملک اس وقت نغمہ و موسیقی اور لہو و لعب کے سیلاب میں تیر رہا ہے، اور ہر قسم کی سخت کوشی و جفاکشی اور صبر و ضبط سے فرار اختیار کرنے کے موڈ میں ہے، اور اسی کے سبب وہ عرب مسلم قوم (جو تاریخ میں جفاکشی، سادگی اور فروسیت، (شہ سواری) کے لیے مشہور عالم رہی ہے اور جس کے ذریعہ اسلام کی امانت کی حامل رہ کر اس نے دنیا کی متمدن مریض قوموں پر غلبہ پایا تھا) مردانگی اور بہادری کے تمام اوصاف سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔ اور اگر کچھ دنوں یہی حال رہا تو ایک ایسی نازک نسوانیت کی حامل نسل آئے گی جو کسی بھی خارجی یا داخلی چیلنج کا مقابلہ نہ کر سکے گی اور ملک کی سالمیت کو برقرار نہیں رکھ سکے گی، چہ جائے کہ وہ اسلامی دعوت کی تبلیغ کرے اور عالم اسلام سے آنے والے حجاج کے لیے صالح نمونہ اور رہنما بنے۔“ (۱)

دوسرے مذاہب کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں اور اس کے نتائج و خطرات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”فیصلہ الہی تو یہ تھا اور ہے کہ جزیرۃ العرب اسلام کا حرم اور پناہ گاہ بنے اور اخیر وقت میں رسول اللہ ﷺ نے اس کی وصیت کرتے ہوئے فرمایا: ”جزیرۃ العرب میں دو دین نہ رہیں۔“ اور فرمایا کہ ”جزیرۃ العرب سے یہود و نصاریٰ کو نکال دو۔“ اس جزیرہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد لفظی مطلب کے علاوہ اپنے اندر بڑے دور رس معانی رکھتا ہے، وہ ان کے اثرات، ان کی ثقافت و اقدار سے بھی اس جزیرہ کو پاک رکھنے کا اشارہ کر رہا ہے، اور اس خطرہ کی نشاندہی کرتا ہے کہ کوئی ایسی نسل نہ پیدا ہو جائے جس کے اور حرم و مسجد رسول کے درمیان کوئی ہم آہنگی، مفاہمت و اتفاق نہ ہو، یہ ایسا خطرہ ہے جس کی گزشتہ تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی اور اس کا وجود (اللہ وہ دن نہ لائے) اس ملک کی عزت و سلامتی کے لیے بڑا ہی منحوس ہے اور غیرت الہی کو جوش میں لا

سکتا ہے جیسا کہ تاریخ میں بارہا ہوا ہے۔“ (۱)

یہ مکتوب ۱۹۷۶ء میں تحریر کیا گیا ہے۔ حضرت مولانا اس کے بعد بھی حالات کا جائزہ لیتے رہے، سال میں دو تین مرتبہ حجاز کا سفر ہوتا اور کئی کئی ہفتے وہاں قیام کی نوبت آتی، ہر طبقہ کے لوگوں سے ملاقاتیں ہوتیں۔ مولانا نے اندازہ کر لیا کہ اب بھی گاڑی غلط رخ کی طرف جارہی ہے اور ملک و معاشرہ کا رخ تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے۔ حضرت مولانا نے اس کی ضرورت محسوس کی کہ باقاعدہ اعداد و شمار کے ساتھ ایک ریکارڈ تیار کر کے اس کی روشنی میں صاف صاف وہاں کے ذمہ داروں کو آگاہی دی جائے۔ اس کے لیے حضرت مولانا نے ایک مفصل مضمون تیار فرمایا جو خود اپنی جگہ صاحب مضمون کی بصیرت و فراست، دور بینی، بالغ نظری، اور وسعت مطالعہ کا غماز ہے۔ یہ مضمون فل اسکیپ کے اٹھارہ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں بڑی بلاغت اور حکمت دعوت کے ساتھ وہاں کے اعلیٰ عہدیداروں اور ذمہ داران حکومت خاص طور پر شاہ اور ولی عہد کو خطاب کیا گیا ہے۔

مکتوب میں حضرت مولانا نے پہلے حجاز مقدس کی اہمیت و عظمت، اہل ایمان کا اس سے تعلق و ارتباط اور خود اپنی قلبی کیفیت کا ذکر فرمایا ہے، پھر سعودی حکومت کی خوبیوں کا اعتراف کرنے کے بعد اصل موضوع کو چھیڑا ہے۔ اس میں حضرت مولانا نے چھ نکات کی طرف خاص توجہ دلائی ہے اور اعداد و شمار کے ساتھ تفصیل سے ترتیب وار ان کو بیان فرمایا ہے:

- ۱- ذرائع ابلاغ (Public Media) ۲- فلمیں اور ملک میں پھیلے ہوئے کیسٹ ۳- صحافت
- ۴- تعلیم ۵- کھیل کا جنون کی حد تک پہنچا ہوا شوق اور حکومت کی سرپرستی ۶- معیار زندگی کی بلندی، سامان قیاش کی فراوانی اور تفریحی رجحان۔

ان تمام نکات پر حضرت مولانا نے حقائق و واقعات، روزمرہ کے مشاہدات کو سامنے رکھتے ہوئے دو دو چار کی طرح گرفت کی ہے، اور ان کے لیے مناسب اور ضروری اصلاحات کا ذکر فرمایا ہے۔ اخیر میں فرماتے ہیں :

”جزیرۃ العرب پر فقر اور ذرائع آمدنی کا ایک دور گزرا ہے جو صدیوں قائم رہا، لیکن اس سے اسلام کا یہ مرکز اس خطرہ سے دوچار نہیں ہوا جو دولت کی

اس فراوانی، معیار زندگی کی بلندی، اور خوش حالی ورفاہیت سے پیدا ہو گیا ہے بلکہ اس فقر و پسماندگی کے دور سے یہ فائدہ ہوا کہ بداندیشوں اور توسیع پسندوں کی نگاہوں سے یہ ملک محفوظ رہا، اور انہوں نے کبھی اس پر اپنی توانائیاں صرف کرنے اور ڈورے ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھی جس کے نتیجہ میں ان کو کسی مادی فائدہ کے حاصل کرنے کی امید نہیں تھی۔ لیکن اب صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے۔

ان ہی حقائق و خطرات کے پیش نظر اس کی جرأت کی جارہی ہے کہ یہ تحریر جو عام اشاعت کے لیے نہیں ہے، ذمہ داروں کی خدمت میں شخصی طور پر پیش کی جائے تاکہ یہ حقائق ان کے سامنے متعین اور مدلل طریقے پر اور مستند ذرائع کے حوالے سے آجائیں، اور وہ صورت حال کی نزاکت کا احساس اور اس کے تذکرہ کے لیے کوئی اقدام کر سکیں۔“ (۱)

یہ تحریر این تنجہ الجزیرۃ العربیۃ الی ای غایۃ تنتھی (جزیرۃ العرب کس طرف جارہا ہے اور کہاں جا کر رہے گا) کے عنوان سے مرتب کی گئی اور مکتوب کی شکل میں ذمہ داروں کو بھیجی گئی۔ شاہ خالد کو یہ مکتوب شیخ بن باز اور شیخ عبداللہ بن حمید کے ذریعہ پہنچایا گیا، اور شاہ نے اس کا مطالعہ کیا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد شاہ کی وفات ہو گئی اور ملک فہدان کے جانشین قرار پائے۔

ملک فہد کے زمانے میں کویت پر عراق نے حملہ کیا جو امریکہ کے سازشی ذہن کا ایک حصہ تھا، اس کے نتیجہ میں امریکہ کو موقع مل گیا کہ وہ سعودی عرب اور کویت میں اپنی فوجیں اتار دے، پوری عرب دنیا کے لیے یہ بڑی شرمناک صورت حال تھی۔ اس کے بعد بھی جب حضرت مولانا نے سعودی عرب کے سفروں میں وہاں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کی اور دیکھا اس طرح لوگ لذات دنیوی میں منہمک ہیں، حلال و حرام کا فرق اٹھتا جا رہا ہے اور حالات میں بجائے بہتر تبدیلی پیدا ہونے کے وہ غلط رخ کی طرف جارہے ہیں، امریکی تہذیب اپنی تمام خرابیوں کے ساتھ حاوی ہوتی چلی جا رہی ہے تو مولانا نے فرماں روا کے مملکت سعودیہ شاہ فہد

بن عبد العزیز کو اپنے ایک مکتوب کے ذریعہ آگاہ کیا، وقت کی نزاکت کا احساس دلاتے ہوئے ان کو اخلاص، انابت الی اللہ اور امکانی حد تک مملکت اور معاشرہ کو مثالی اور معیاری بنانے کی طرف متوجہ کیا۔ اپنے درد دل کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”اگر ممکن ہوتا تو راقم سطور اپنے مضطرب و بے تاب دل اور درد و کرب سے متاثر دماغ کو اس مخلصانہ عریضہ کے صفحات پر نکال کر رکھ دیتا۔ اگر روشنائی کے بجائے خون جگر اور آنسوؤں سے یہ تحریر رقم کی جاسکتی تو اس میں بھی دریغ نہ کرتا۔“ (۱)

عمومی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”اس وقت عالم اسلام عموماً اور جزیرۃ العرب اور بلادِ مقدسہ خصوصاً ایسے سنگین اور فیصلہ کن مرحلہ سے گزر رہے ہیں جس کا مقابلہ کرنے اور اس کے ازالہ کی کوشش میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر کی گنجائش نہیں اور نہ کسی امکانی جدوجہد سے گریز ممکن ہے۔“ (۲)

اس کے بعد دو چیزوں کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی اور فرمایا :

”اس وقت تمام اسلامی ملکوں میں دو ایسے خلاء ہیں جن کو پر کرنا فوری طور پر ضروری ہے۔ ایک خلاء ہے مثالی معاشرہ کے فقدان کا جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہو اور عقائد و اخلاق سے لے کر معاملات اور زندگی کے تمام شعبوں میں وہ اسلامی تعلیمات کا آئینہ دار ہو، انسان اس فضا اور ماحول میں امن و سکون اور طمأنینہ قلبی محسوس کرے، ایمانی خوشبو اس کے مشام جاں کو معطر کر دے۔“ (۳)

عالم اسلامی کا دوسرا خلاء کسی ایسی طاقتور اور مومنانہ دعوت و قیادت کا فقدان ہے جس کے اندر مردانگی کا جوہر، بلند نگاہی، عالی ہمتی، دور اندیشی اور پیش بینی کے ساتھ ان بڑی طاقتوں کو سامنا کرنے کی صلاحیت اور قدرت بھی

(۱) کاروانِ زندگی دوم صفحہ ۲۲

(۱) کاروانِ زندگی پنجم صفحہ ۲۳

(۲) کاروانِ زندگی پنجم صفحہ ۲۶

ہو جنہوں نے بغیر کسی جواز و استحقاق کے نوع انسانی کی زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے اور جو اسلامی ملکوں اور قوموں کی قسمتوں کی مالک بن بیٹھی ہیں۔ (۱)

سعودی ملوک و امراء کے علاوہ وہاں اثر و نفوذ رکھنے والے عہدیداروں، اور وزراء و اہل مناصب کی طرف بھی حضرت مولانا نے توجہ رکھی اور ان کی ذہن سازی کی فکر کرتے رہے۔ ان میں وزیر مالیات شیخ احمد سرور الصبیان جو بعد میں ”رابطہ عالم اسلامی“ کے جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے حضرت مولانا سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ شیخ علی الحرکان خود بھی بڑے عالم اور محدث تھے، حضرت مولانا سے ان کو بڑی عقیدت و محبت تھی، مسجد نبوی میں کبھی کبھی اپنا درس روک کر حضرت کے رسائل پڑھ کر سناتے، بعد میں وہ جدہ کے قاضی پھر وزیر قانون و انصاف منتخب ہوئے۔

تعلیم کے میدان کو حضرت مولانا نے ہمیشہ بڑی اہمیت دی، مولانا کی نگاہ میں ملک کی اصلاح کے لیے اس کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی ہے، سعودی وزیر تعلیم شیخ حسن بن عبد اللہ کو مولانا مستقل توجہ دلاتے رہے۔ موصوف کو بھی حضرت مولانا سے بڑا تعلق تھا، وہ مولانا کے مشوروں کی پوری قدر کرتے اور اعتماد فرماتے اور ان خطوط پر عمل کی کوشش بھی فرماتے۔ ان کے نام مولانا کے ایک مکتوب کا بڑا حصہ یہاں نقل کیا جا رہا ہے، اس سے مولانا کے طریق فکر اور اسلوب دعوت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں :

”ان بلاد مقدسہ کے حالات سے میرا تعلق خاطر اور ان رجحانات کے سلسلہ میں اضطراب جن سے اس ملک کا دینی و فکری اور اعتقادی مستقبل وابستہ ہے باعث تعجب نہیں اور نہ کسی شرح کا محتاج ہے، کیونکہ یہ ملک عالم اسلام کا دھڑکتا ہوا دل ہے، اور یہاں کے مستقبل کے واقعات و رجحانات سے تمام اسلامی ممالک کا گہرا تعلق ہے، اس مملکت کا ہر قسم کی فکری کشمکش، نفسیاتی اضطراب، دعوت اسلامی کی ابدیت اور اس کی قائدانہ صلاحیت پر عدم اعتماد اور اخلاقی انارکی سے بچا رہنا، اہم ترین مقاصد میں سے ہے۔ اور یہ بات اس

ملک کی ہر بھی خواہ کی توجہ تعلیم کی طرف لے جاتی ہے، تعلیم ہی کسی ملک کو نئے سانچے میں ڈھالتی اور وہی معاشرہ کو آخری شکل دیتی ہے، مسلمانوں کے لیے فکر مندر بننے والے بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ”اگر میری کوئی ایک ہی دعا قبول ہونے والی ہوتی تو ملک کے صاحب امر وہی کے لیے کرتا کیونکہ مسلمانوں کی خیر و صلاح اس کے خیر و صلاح پر موقوف ہے۔“ اور میں یہ کہتا ہوں کہ میری اگر کوئی دعا قبول ہونے والی ہوتی تو وہ میں وزیر تعلیم کے لیے کرتا اور اللہ سے ان کے لیے توفیق و استقامت اور نصرت کی دعا مانگتا اور اگر میری زندگی کا آخری لمحہ ہوتا تو میں اسے اس وزارت کی خدمت و تعاون میں لگا دیتا۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر کسی ملک کو برباد کرنے کے پیچھے ہزاروں طاقتیں، ادارے، اور ذہانتیں لگ جائیں، مگر اس کی وزارت تعلیم صحت مند اقدار کی حامل اور اپنے فرض سے آگاہ ہو اور اسے اپنے مخلص و ذہین کارکنوں کا تعاون حاصل ہو تو وہ نغریبی قوتیں اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اور اگر اس کے برعکس ہزاروں افراد، ادارے اور صلاحیتیں کسی ملک کی تعمیر میں لگ جائیں مگر اس کی وزارت تعلیم ناکارہ اور ٹکمی ہو تو وہ کچھ نہیں کر سکتیں۔

عالم اسلام کو آج صرف ایک ہی حقیقی معرکہ درپیش ہے اور وہ ہے اسلامیت و مغربیت کا (اپنے وسیع ترین معنوں میں) معرکہ اور اس عالمی کشمکش سے کم و بیش یہ ملک بھی متاثر ہوا ہے۔ اور صورت حال کی نزاکت اس کے عبوری مرحلہ میں ہونے سے اور بڑھ جاتی ہے جب کہ وہ ناخواندگی سے عام اور وسیع تعلیم و ثقافت کی طرف بڑھ رہا ہے اور جس پر بے مثال سخاوت اور دریادلی سے خرچ کیا جا رہا ہے، اس کے ساتھ اس سادہ و محدود زندگی سے جو قرون وسطیٰ کی زندگی سے مشابہ تھی، اس تغیر پذیر زندگی کی طرف جس کی انتہا نہ معلوم ہے اور جو دو تعطل سے تلاش و تحقیق کی جانب رواں دواں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مرحلہ قوموں اور ملکوں کی تاریخ کا نازک ترین مرحلہ ہوتا ہے، جو بڑے باریک اور حکیمانہ

لائحہ عمل اور وسیع و عمیق تنقیدی نظر، مومن و مخلص معاونین اور پختہ اور تجربہ کار، منصوبہ سازوں کے تعاون کا طالب ہوتا ہے، اور اس سلسلہ میں معمولی لغزش و کوتاہ نظری، ناقص منصوبہ بندی یا معلمین کے انتخاب یا بیرونی اساتذہ کے تقرر میں ذرا سی بے احتیاطی اس ملک کو ایسے گڑھے میں گراسکتی ہے جس کی کھائی کی تھاہ نہیں اور اس منزل تک پہنچا سکتی ہے جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔“ (۱)

ان خطوط سے جہاں حضرت مولانا کی فکر مندی اور درد و سوز کا پتہ چلتا ہے وہیں ان کی بصیرت اور فہم و فراست بھی نظر آتی ہے، اور دعوت کا اسلوب ظاہر ہوتا ہے۔

حضرت مولانا نے اپنی اس دعوت و فکر کا محور حجاز مقدس کو بنایا تھا جو کل عالم اسلام کا دل ہے۔ وہ جانتے تھے اگر اس کی اصلاح ہوگئی اور نظام درست ہو گیا تو بقیہ ممالک میں اس کے اثرات ضرور اپنا کام کریں گے۔ ان کی اس کوشش کا سب سے بڑا نتیجہ شاہ فیصل مرحوم کی شکل میں ظاہر ہوا تھا۔ مرحوم نے اتحاد اسلامی کے علمبردار کی حیثیت سے بڑی خدمات انجام دیں، اور اس کے نتائج ظہور پذیر ہونے لگے تھے، لیکن اچانک ان کی شہادت کی وجہ سے اس فکر و دعوت پر ضرب لگی۔ حضرت مولانا کو اس سے طبعاً صدمہ پہنچا۔ لیکن وہ مایوس نہیں ہوئے اور ان کے بعد آنے والے حکمرانوں کے سامنے مسلسل اپنی دعوت پیش کرتے رہے۔ سعودی عرب کے علاوہ بھی جس ملک میں تشریف لے جاتے وہاں اس طبقہ کو خاص طور سے متاثر کرنے کی کوشش فرماتے جس کے ہاتھ میں زمام کار ہے۔

کویت

۱۹۶۲ء میں پہلی مرتبہ مولانا کویت تشریف لے گئے۔ وہاں کے امیر شیخ عبداللہ سالم سے بھی ملاقات کی اور ضروری مشورے دیئے، اس کے علاوہ تحریری یادداشت بھی ان کے سپرد کی جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں :

”اللہ تعالیٰ نے تاریخ میں آپ کو وہ نادر موقع دیا ہے جس میں آپ اپنا انقلابی رول ادا کر سکتے ہیں، جو ہمیشہ شکر و اعتراف کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔

وہ رول ہماری موجودہ تہذیب کے خلا کو پر کرنا ہے؛ وہ خلا کسی ایسی حکومت کا نہ ہونا ہے جو دین و عقیدہ اور مادی وسائل و ذرائع کے درمیان ربط پیدا کرے، وہ خلا ایسے معاشرہ کا فقدان ہے جس میں ایمان و اخلاق اور معاصر دنیا کے جدید تجربات کے درمیان ہم آہنگی ہو۔ یہ ایسا خلا ہے جسے دنیا کی کوئی بڑی حکومت بھی نہیں بھر سکتی۔ جو حکومت بھی اس شعار کو اپنائے گی وہ حکومتوں کی صف میں معنوی لحاظ سے اپنا اولین مقام بنالے گی اور اس کو ایسا وقار و احترام حاصل ہوگا جو دنیا کے بڑے ملکوں کو بھی حاصل نہیں۔

یہ نصرت الہی، تائید غیبی، برکات، اور عوامی مقبولیت کے علاوہ ہے جس کا اللہ نے اپنے نیک بندوں سے وعدہ فرمایا ہے، جو اس دین کے وارث اور اس پیغام کے حامل اور اس راستہ کے مجاہد ہوں گے۔

اس مقصد کی تکمیل کے وسائل بجز اللہ بہت ہیں اور اس کا موقع بھی میسر ہے۔ بشرطیکہ ارادے نیک اور عزم مستحکم ہو۔ ”إِن تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يَثْبِثْ أَقْدَامَكُمْ“۔

آپ کو معلوم ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد ﷺ کی بعثت کے ساتھ یہ طے فرمادیا تھا کہ عربوں کی ترقی، وحدت و قیادت اور ان کی مشکلات کا حل اس دین اور محمد رسول اللہ ﷺ کے طریقہ ہی سے ممکن ہے۔ تاریخ اس کی گواہ اور تازہ واقعات اس کی دلیل ہیں۔ چنانچہ جو بھی عربوں کے رشتہ کو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے کمزور کرنا چاہے گایا انھیں ان سے الگ کر کے ایک قوم کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کرے گا وہ عرب قوم پر سب سے بڑا ظلم کرے گا، وہ اس کے دل سے ایمان کی جڑ کھود پھینکنا، اس کے عقیدہ کو کمزور کرنا اور مخلصین و مصلحین اور امت عربیہ کی صدیوں کی تعمیر کو برباد کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ کسی بھی عرب مملکت کی ہمت افزائی کا مستحق نہیں، وہ ان کا سب سے بڑا دشمن ہے، جو ان کا تعلق ماضی اور حال کی وسیع دنیائے اسلام سے کاٹ دینا چاہتا اور اس

سرچشمہ کو خشک کر دینا چاہتا ہے۔“ (۱)

اسی مکتوب میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

”عرب اور مسلم مملکتوں میں نظام تعلیم کی تشکیل، گہرے غور و فکر، اور خاص منصوبہ بندی کی بنیادوں پر ہونی چاہیے، جو اسلام کے عقیدہ اور پیغام کے مطابق ہوں، کیونکہ تعلیم ہی پر آنے والی نسلوں اور قوم کے دینی و اخلاقی مستقبل اور تہذیبی رجحانات کا مدار ہے۔ اس کے ساتھ نو جوانوں میں بے راہ روی اور اخلاقی گراؤٹ کو روکنے کی تدبیر بھی ضروری ہے۔ کیونکہ یہ چیز جب کسی قوم میں آ جاتی ہے تو اسے ذلیل بھی کرتی ہے اور تباہ بھی اور جواں مردی (فتوت) بھی ختم ہو جاتی ہے جو ہمیشہ سے عرب قوم کا شعار اور اس کا سرمایہ افتخار رہا ہے۔“ (۲)

اخیر میں ایک بڑے خطرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”آخری بات جس کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ اس ملک میں غیر مسلم عبادت گاہوں کی تعمیر کا مسئلہ ہے۔ آپ کو معلوم ہے رسول اللہ ﷺ نے جزیرۃ العرب کو اسلام، مسلمانوں اور خدا کی خالص توحید و عبادت کے لیے مخصوص فرمایا۔ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ”جزیرۃ العرب سے یہود و نصاریٰ کو بھی نکال دوں گا اور مسلمانوں کے سوا وہاں کسی اور کو رہنے کی اجازت نہیں دوں گا“ اور سفر آخرت کے وقت فرمایا ”لا یسقین دینان علی ارض العرب“ (سرزمین عرب میں دو دین ہر گز نہ رہیں) اور حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی آخری وصیت تھی کہ ”جزیرۃ العرب میں دو دین نہ رہیں۔“ ان غیر اسلامی معاہدے سے ملک کی سالمیت کو اس لیے خطرہ ہے کہ ان کے متولی ان کی حمایت کا مطالبہ کریں گے اور ان کے وجود سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے اور اس سے ایسے عقدے پیدا ہوں گے جن کا حل ممکن نہ ہوگا۔ اس طرح اقلیتوں، ان کی بڑھتی ہوئی

(۱) حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب صفحہ: ۹۲-۹۳

(۱) حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب صفحہ: ۹۳-۹۴

سرگرمیوں اور آراضی کی ملکیت کے بارے میں بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔
جس کے سبب ”ریاست اندرون ریاست“ پیدا ہونے اور لائیو مشکلات کے
ابھرنے کا خطرہ ہے۔“ (۱)

اس خط سے بھی حضرت مولانا کی فراست و بصیرت صاف ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے
جس چیز کا اندیشہ ظاہر کیا تھا وہ آج ایک حقیقت اور واقعہ کی شکل میں سامنے ہے۔

شرق اردن

۱۹۵۱ء میں شرق اردن کے سفر میں شاہ عبداللہ والی اردن سے دو مرتبہ ملاقات ہوئی،
اس موقع پر حضرت مولانا نے ان کو خاص طور سے مسئلہ فلسطین کی طرف توجہ دلائی۔ مسجد اقصیٰ
کی تولیت کی نازک ذمہ داری کا احساس دلایا۔ اور پناہ گزینوں کی دیکھ بھال کے لیے متوجہ
کیا۔ (۲) اس سفر میں مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی بھی ہمراہ تھے، وہ فرماتے ہیں کہ ”مولانا
علی میاں نے شاہ سے کہا کہ جلالتہ الملک اگر چھوٹے سے چھوٹا ملک ہو اور خواہ اس کی پیداوار
کم ہو، اس کی فوج بھی ناقابل ذکر ہو، لیکن اسلام کو اپنالے اور دین کے احکام اپنی مملکت میں
راج کر لے تو وہ دنیا کے لیے رحمت بن سکتا ہے۔ اور ساری دنیا کے لئے نمونہ بن سکتا ہے۔
جب مولانا بات کر رہے تھے تو میں نے شاہ کو دیکھا کہ وہ کنکھیوں سے اپنے ایک وزیر کو دیکھ
رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں: سنو ایک ہندی داعی دین کیا کہہ رہا ہے؟“

مولانا عبید اللہ عباس صاحب ندوی لکھتے ہیں :

”شاہ نے ان کو ایک ہدیہ بھی پیش کیا تھا، جس کو مولانا نے فلسطین فنڈ میں
دے دیا۔ کیونکہ شاہ کا ہدیہ واپس کرنا آداب شاعی کی توہین شمار ہوتا ہے۔ مگر
جس فنڈ میں چندہ دیا اس کے صدر خود بادشاہ تھے۔“ (۳)

اس کے بائیس سال کے بعد حضرت مولانا جب دوبارہ شرق اردن تشریف لے گئے تو
حالات بدل چکے تھے۔ شاہ حسین ملک عبداللہ کے پوتے تخت نشین تھے۔ حضرت مولانا اس

(۱) حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب صفحہ: ۲۵، ۹۴

(۲) عجیب اتفاق ہوا کہ حضرت مولانا سے ملاقات کے دوسرے ہی دن وہ فلسطین گئے اور وہاں شہید کر دیے گئے

(۳) میر کارواں صفحہ: ۳۰۱-۳۰۲

دورہ میں ”رابطہ عالم اسلامی“ کے وفد کی قیادت فرما رہے تھے۔ شاہ حسین نے وفد کی دعوت کی۔ اور حضرت مولانا نے وفد کی نمائندگی کرتے ہوئے ملک کے سامنے بڑی پر جوش اور مدلل تقریر کی، اور شاہ حسین کو وہ عظیم ذمہ داری یاد دلائی جو فلسطینی پناہ گزینوں کے بارے میں ان پر عائد ہوتی ہے۔ انہوں نے فرمایا :

”یہ کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے کہ فلسطینیوں کو عیسائی مبلغین اور رفیو جی ریلیف کمیٹیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے جو ان کی زیوں حالی اور بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہیں۔“ (۱)

مزید فرماتے ہیں :

”یہ عظیم ترین ذمہ داری ہے دنیا میں بھی، آخرت میں بھی، ہم سب ایک روز اللہ کے حضور کھڑے کیے جائیں گے اور ان مصیبت زدہ اور قابل رحم لوگوں کے بارے میں ہم سے باز پرس ہوگی جو اپنے وطن سے صرف اس بنا پر نکالے گئے کہ انہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار صرف اللہ ہے۔“ (۲)

شاہ نے حضرت مولانا کے ساتھ بڑے احترام و عقیدت کا معاملہ کیا، خود آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور رخصت کرنے کے لیے کچھ دور چل کر آئے۔

اس سفر کے بعد کئی سال تک شرق اردن کا سفر نہیں ہو سکا۔ اگرچہ وہاں کے ولی عہد امیر حسن بن طلال حضرت مولانا سے خاص تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے متعدد مرتبہ دعوت دی۔ لیکن ۱۹۸۲ء میں سفر کی نوبت آئی، یہ سفر ”موسسة آل البيت“ کی دعوت پر ہوا تھا۔ امیر حسن اس ادارہ کے سرپرست تھے۔

افتتاحی پروگرام میں وہ شریک ہوئے اور خاص طور پر حضرت مولانا کا انہوں نے شکریہ ادا کیا۔ ۲۷ رجب کے افتتاحی پروگرام کا خاص موضوع مسئلہ فلسطین تھا۔ اس میں امیر حسن نے اپنے اعداد و شمار سامنے رکھ کر پر مغز تقریر کی اور اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ امیر موصوف کی تقریر کے بعد حضرت مولانا کی تقریر ہوئی جس میں نے انہوں نے ایمان کی

(۱) دریائے کابل سے دریائے یرموک تک صفحہ: ۲۲۳

(۲) دریائے کابل سے دریائے یرموک تک صفحہ: ۲۲۳

اصل طاقت کا حوالہ دیتے ہوئے اس کی ضرورت پر زور دیا۔ مولانا نے فرمایا :
 ”انسانی بالخصوص اسلامی تاریخ کی متواتر شہادتیں ہیں کہ اصل فیصلہ کن چیز، ملتوں اور قوموں کی تقدیر کو بدلنے والی حقیقت، ممالک کا سیاسی اور جنگی نقشہ یکسر تبدیل کر دینے والی طاقت، اعداد و شمار، قلت و کثرت کا تناسب اور تسلیم شدہ صورت حال نہیں ہوتی۔ اصل انقلاب انگیز طاقت اور ناممکن کو ممکن بنانے والی چیز اس ہستی کا وجود ہے جو عزم و ایمان کی خارق عادت طاقت سے سرشار، صورت حال کو یکسر بدل دینے کے لیے ہمہ تن تیار اور اس کی راہ میں ہر طرح کی قربانی و جاں نثاری، خطر پسندی، مہم جوئی کے لیے مضطرب و بے قرار ہو، تاریخ کی شہادت ہے کہ اس موقع پر یہ ٹھوس اعداد و شمار اور مشکلات و مخالفتوں کے پہاڑ برف اور موم کی طرح پگھل کر پانی ہو جاتے ہیں، اور فتح کا آفتاب رات کے اندھیرے اور سردی کے کبر کو چیرتا اور آنکھوں کو خیرہ کرتا ہوا طلوع ہوتا ہے۔ یہی سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی سرگزشت اور جنگ صلیبی کی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ اقبال نے اسی حقیقت کو اپنے خاص انداز میں اس طرح

بیان کیا ہے۔

مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لا تحف
 صحبت پیر روم مجھ پر ہوا یہ نکتہ فاش لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف“ (۱)
 امیر حسن کی اعداد و شمار پر مشتمل تقریر کے بعد جس سے کسی قدر مایوسی ہونے لگی تھی، اس تقریر نے دلوں میں جوش و ولولہ پیدا کر دیا۔ خود امیر موصوف پر اس کا گہرا اثر پڑا۔
 اس سفر کے بعد عرصہ تک حضرت مولانا اردن تشریف نہیں لے جاسکے۔ اگست ۱۹۹۸ء میں عمان میں ”عالمی رابطہ ادب اسلامی“ کی مجلس امناء کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں حضرت مولانا بحیثیت صدر رابطہ تشریف لے گئے۔ ایرپورٹ پر خلاف معمول بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا، پاکستان سے ڈاکٹر ظہور احمد اظہر بھی تشریف لائے تھے، وہ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”عالم عرب میں ہر جگہ جانے پہچانے مفکر اسلام اور عربی داں کو اتنی دیر ہوئی اڑھ پر بٹھائے رکھنا اور وہ بھی اس ضعیف العمری اور کمزور صحت کے ساتھ، انتہائی سنگدلی، اور بے دانشی تھی، مگر بایں ہمہ مولانا کے چہرے پر کوئی ملال نہ تھا۔ لوگ اس جفاکاری کے شکوے کر رہے تھے اور مولانا مسکرا مسکرا کر سنتے جا رہے تھے۔ بدسلوکی کرنے والوں کے بارے میں انہوں نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا، وہ حقیقت میں سلف صالح کی زندہ نشانی تھے، اور پتھر کھا کر دعائیں دینے والی ہستی کے آل و اولاد ہونے کا عملی ثبوت دے رہے تھے۔ مگر جب صبح ہوئی تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی، شہزادہ حسن نے اس سخت گیر وزیر اعظم کی کابینہ ہی درخواست کر دی تھی اور راتوں رات نئی کابینہ نے حلف اٹھالیا تھا، سویرے سویرے اوقاف اور اسلامی امور کے نئے وزیر صاحب حاضر ہوئے اور کہا کہ مولانا اور ان کے ساتھ مجلس امناء کے تمام ارکان سرکار کے مہمان ہیں اور اسی وقت پانچ ستاری ہوٹل میں منتقل ہو جائیں مگر مولانا کی طرف سے شکریہ کے ساتھ جواب دیا گیا کہ درویش اپنی درویشی میں خوش اور مطمئن رہتے ہیں“ (۱)

یہ وہ زمانہ تھا کہ زمام اقتدار امیر حسن کے ہاتھ میں تھی اور ملک حسین مرض الموت میں گرفتار تھے، علاج کے لیے امریکہ گئے ہوئے تھے۔ امیر موصوف عرصہ سے حضرت مولانا کے عقیدت مند تھے۔ دوسرے دن انہوں نے سرکاری سطح پر حضرت مولانا اور ان کے رفقاء کی دعوت کی جس میں وزیر اعظم سمیت پوری کابینہ کو بھی مدعو کیا۔ کھانے کے ساتھ اس میں باقاعدہ مذاکرات کی نشست بھی ہوئی، نئے وزراء اور پھر امیر حسن نے فاضلانہ تقریریں کیں۔ اخیر میں حضرت مولانا کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ حضرت مولانا نے فرمایا :

”بڑی مدت کے بعد زعمائے عرب کی ایک چیدہ جماعت سے مخاطب ہوں۔ آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ عرب اسلام سے پہلے بھی کچھ نہ تھے، اور اسلام کے بغیر بھی کبھی کچھ نہ ہوں گے۔ ریگستان میں بھٹک رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے اپنے

پاک بندہ کو حق کے غیر فانی پیغام کے لیے جن لیا۔ کتاب اللہ کے معارف نے ایک پسماندہ اور نور علم و تمدن سے محروم قوم کو علوم و معارف کا مالک بنا دیا۔ روم و ایران جن خانہ بدوشوں کو چرواہوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے وہ نہ صرف ان کے سامنے سرنگوں ہو گئے اور اقتد اور دولت کی چابیاں ان کے سپرد کر دیں، بلکہ ان کے پیروکار اور خوشہ چیں بن گئے۔ آج پھر ایک مرتبہ وہی صورت پیدا ہو رہی ہے، تاریخ خود کو دہرا رہی ہے، حرص کے جڑے پھاڑے لوگ اسی عرب قوم کو اس کی روحانی و مادی دولت دونوں سے محروم کر کے پھر صحرا میں بھٹکنے کے لیے پھینک دینا چاہتے ہیں۔

کل بھی تمہیں عزت و طاقت اسلام نے دی تھی اور آج بھی تمہاری عزت و طاقت کا حقیقی سرچشمہ اسلام ہی ہے۔ یہ میں نہیں کہتا بلکہ یہ تو امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمایا ہوا ہے۔ عرب قومیت نے نہ تمہیں پہلے کچھ دیا ہے، اور نہ پھر کچھ دے سکے گی۔“ (۱)

ڈاکٹر ظہور احمد صاحب جو اس مجلس میں شریک تھے لکھتے ہیں :

”تھوڑی دیر کے لیے میں بالکل بھول گیا کہ ہم کسی شاہ کے دربار میں ہیں۔ سب خاموشی سے مولانا کی باتیں سن رہے تھے۔ جب وہ خاموش ہوئے تو سب کی زبانیں سراپا تحسین ہو گئیں اور امیر موصوف نے اس تقریر سے خاص اثر لیا۔“ (۲)

ولی عہد کا حضرت مولانا سے تعلق بڑھتا گیا، انہوں نے حضرت مولانا کی تصنیفات سے بھی فائدہ اٹھایا، اس سے ان کی فکر و رجحان میں بہتر تبدیلی پیدا ہوئی اور یہ امید ہو چلی کہ وہ برسر اقتدار آنے کے بعد بہتر اصلاحی اقدامات کریں گے۔ لیکن شاہ حسین نے اپنے مرض وفات میں اچانک ان کو ولی عہدی سے معزول کر کے اپنے فرزند کو ولی عہد مقرر کر دیا ”وکان امر الله قدراً مقدوراً۔“

وزیر اوقاف کی طرف سے ملک عبد اللہ ہال میں میں خصوصی خطاب کا نظم کیا گیا جس

(۱) مجلہ قافلہ ادب اسلامی (پاکستان) ۱/۱۵۲، ۱۵۱

(۲) مجلہ قافلہ ادب اسلامی (پاکستان) صفحہ ۱۵۱-۱۵۲

میں حکام اور عمائدین ملک شریک ہوئے۔ حضرت مولانا نے اس میں دعوت کی اہمیت پر روشنی ڈالی، اور اس سلسلہ میں کوتاہی کے خطرات سے متنبہ کیا۔ مولانا کا خطاب ”إلا تفعלוہ تکن فتنة فی الارض و فساد کبیر“ والی آیت کی روشنی میں تھا۔ حکومت کی طرف سے اردن کی مختلف یونیورسٹیوں میں مولانا کے خطاب اور اساتذہ سے ملاقات کا نظم کیا گیا۔ واپسی کے وقت حضرت مولانا کو ان کے مخصوص رفقاء کے ساتھ شاہی ایر پورٹ سے بڑے اکرام کے ساتھ رخصت کیا گیا۔

لبنان

رابطہ عالم اسلامی کے زیر انتظام اس دورہ میں جو افغانستان سے شروع ہوا تھا حضرت مولانا لبنان بھی تشریف لے گئے۔ اور وہاں وزیراعظم، وزرائے مملکت اور اہم علماء و عمائدین کے سامنے بڑی پر جوش اور بصیرت افروز تقریر فرمائی جس میں ملک کو درپیش خطرات کا تذکرہ فرمایا اور ان سے بچنے کی تدابیر ذکر فرمائیں، اور ہر ایک کو اس کی ذمہ داریاں یاد دلانیں۔

مراکش

۱۹۷۶ء میں حضرت مولانا ”رابطۃ الجامعات الاسلامیہ“ کی دعوت پر مراکش تشریف لے گئے۔ وہاں دو ہفتہ کے قیام کے آخری دنوں میں شاہ حسن ثانی شاہ مراکش کی جانب سے دعوت کا اہتمام کا گیا۔ حضرت مولانا کو وہ پہلے بھی مراکش آنے کی دعوت دے چکے تھے، مگر اس وقت حضرت مولانا نے معذرت فرمائی تھی۔ اب اس سفر میں ان سے ملاقات اور گفتگو کی نوبت آئی۔ مہمانوں کی طرف سے حضرت مولانا نے ہی ان سے خطاب کیا اور فرمایا :

”آپ کو عالم اسلام کی جانب سے ایک بہت عزیز پیغام پہنچانے کی سعادت حاصل کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ آج دنیا کے مسلمان بے چینی سے اس کے منتظر ہیں کہ عالم اسلام کے افق سے کوئی نیا ستارہ طلوع ہو۔ مسلمان اس وقت ایسے غیر معمولی حالات سے گزر رہے ہیں جن میں کوئی غیر معمولی قائدانہ شخصیت ہی ان کی مشکل کشائی کر سکتی ہے، جو غیر معمولی قوت ایمانی، عزم راسخ،

اور اخلاص کامل سے متصف ہو، اور جو سیاسی اغراض و مفادات سے بلند ہو کر رضائے الہی اور خدمت اسلام کا عہد کرے۔ اس کے لیے آپ کے والد نامدار سلطان محمد الخامس پر لوگوں کی نگاہیں پڑنے لگی تھیں۔ لیکن ان کو جلد پیغام رحیل آ گیا۔ کیا عجب اللہ تعالیٰ آپ سے یہ کام لینا چاہتا ہو!۔“ (۱)

مولانا محمد رابع حسنی ندوی صاحب مدظلہم اس ملاقات کی تفصیل یوں بیان فرماتے ہیں :

”اجلاس کے اختتام پر شاہ مراکش سے ملاقات کا موقع ملا۔ مولانا نے مہذب اور شائستہ انداز میں لیکن پر جوش اور مؤثر خطابت کے اسلوب میں ملک کی اخلاقی ضرورت اور دینی حالت اور عصری تقاضوں کی رعایت اور اس میں اخلاص عمل کی طرف صاف طریقہ سے توجہ دلائی۔ موقع بہت نازک تھا۔ بادشاہ کی ملاقات کے لیے سب شرکائے کانفرنس آئے تھے اور موضوع صرف ملاقات کا تھا۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو سب کی طرف سے بولنے کا موقع دیا گیا جو عام طور پر صرف تہنیت اور شکریہ کا موقع سمجھا جاتا ہے، جس کا ایک الگ مہذب طریقہ ہوتا ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی کامیابی کے ساتھ اس کی رعایت رکھی اور اپنی پوری بے باکانہ رائے کا اظہار کیا۔ اس میں وہ باتیں بھی تھیں جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ملک کے حالات کے تناظر میں بتائی گئی تھیں۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر بہت کامیاب تقریر سمجھی گئی۔“

اس کے بعد ایک بہت بڑے عرب عالم نے خواہش ظاہر کی کہ وہ بھی کچھ بولیں گے چنانچہ ان کو موقع دیا گیا، وہ اہل زبان ہونے کے باوجود موقع کی نزاکت اور ضرورت کا پورا لحاظ نہ کر سکے بعد میں ارکان نے جو تقریریں سب علماء اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر تھے اپنے تبصروں میں مولانا کی کامیاب تقریر اور ان عرب عالم کی کمزوری کا تذکرہ کیا، میں اس موقع پر موجود تھا۔ مولانا کی عربی زبان میں وہ عالمانہ اور مبصرانہ ترجمانی تھی کہ مجھے بھی حیرت ہوئی اور یہ محسوس ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی مدد کا نتیجہ ہے جو مولانا کے اخلاص اور

داعیانہ جذبہ کی وجہ سے ان کو حاصل ہوا۔ اور مجھے اس طرح کے دوسرے متعدد موقعوں پر بھی یہ بات محسوس ہوئی اور یہ خیال ہوا کہ اس طرح کی باتیں جو با اقتدار مخاطب کے لیے کچھ تکلیف دہ ہو سکتی ہیں اور عام حالات میں رد عمل پیدا کر سکتی ہیں، ہر ایسے موقع پر میں نے دیکھا کہ مولانا کی قدردان کی نظر میں بڑھ گئی۔ چنانچہ اس موقع پر شاہ مراکش دروازہ تک مولانا کو پہنچانے آئے اور شکوہ کیا کہ آپ کو کئی مرتبہ آنے کی دعوت دی گئی آپ نہ آ سکے، آپ آیا کیجئے۔“ (۱)

حضرت مولانا جس ملک میں گئے بڑی حکمت اور خوبصورتی سے وہاں کے اہل سلطنت و حکومت کو خدمت دین کے لیے متوجہ فرمایا۔ بہت سے ملکوں میں اس کے بہترین نتائج سامنے آئے۔

یمن

۱۹۸۴ء میں حضرت مولانا نے یمن کا پہلا سفر کیا۔ وہاں ہر طبقہ کی جانب سے ان کا عظیم الشان استقبال ہوا۔ ذمہ داران حکومت نے تشریف آوری کو بڑی اہمیت دی اور فوج کے سامنے بھی دو مرتبہ خطاب کا موقع دیا۔ صدر، نائب صدر، وزیر اعظم، اور اہم وزراء و عمائدین سے ملاقاتیں ہوئیں۔ صنعاء یونیورسٹی میں خطاب ہوا۔ ریڈیو اور ٹی وی پر خطاب کا موقع دیا گیا۔ ملک کے مختلف شہروں میں عوامی جلسوں میں خطاب ہوا۔ اس کے علاوہ دانشوروں کے خصوصی اجتماع میں خطاب ہوا اور حضرت مولانا نے ان کے سامنے یمن کی وہ خصوصیات بیان کیں جو زبان نبوت سے ارشاد ہوئی ہیں اور فرمایا کہ ان خصوصیات کو باقی رکھنا اہل یمن کی ذمہ داری ہے۔ مغربی ممالک میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی سازشوں اور مغربی تمدن کو تعلیم و ثقافت کے ذریعہ ملک میں رائج کرنے کے خطرات سے آگاہ کیا۔

امارات

خلیج و امارات کے حکمرانوں میں سے اکثر حضرت مولانا سے نہ صرف واقف بلکہ ان کے قدرداں اور محبت رکھنے والے تھے۔ ان میں حاکم شارقہ شیخ سلطان القاسمی کو حضرت (۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ ایک عہد ساز شخصیت

مولانا سے خاص تعلق تھا، حضرت مولانا ان کی دعوت پر شارقہ بھی تشریف لے گئے۔ ایک مرتبہ وہ از خود حضرت مولانا سے ملنے لکھنؤ تشریف لائے۔ دارالعلوم میں اس موقع پر ایک نشست ان کے استقبال کے لیے رکھی گئی، اس میں حضرت مولانا نے اپنی تقریر میں ان کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا، ”نعم الامیر علی باب الفقیر و بنیس الفقیر علی باب الامیر“ اور فرمایا آپ قابل تعریف ہیں کہ فقیر کے دروازے پر آئے۔

۱۹۷۶ء کے خلیج کے ایک سفر میں حضرت مولانا نے ابوظہبی کے دیوان امیری میں ایک پر مغز تقریر فرمائی، جس کا عنوان تھا۔ ”ایک صاحب شعور مسلمان موجودہ تہذیبوں کو کس نظر سے دیکھتا ہے؟“

حضرت مولانا کا آخری بیرونی سفر بھی دہلی کا ہوا، جس کی تقریب یہ ہوئی کہ حضرت مولانا کو ”اعلیٰ عالمی اسلامی شخصیت ایوارڈ“ کے لئے منتخب کیا گیا۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا، ضعف بھی بہت تھا، اس لیے حضرت مولانا کو سفر سے بڑا تردد ہو رہا تھا، کئی مرتبہ معذرت بھی فرمائی لیکن کمیٹی کے ذمہ داروں نے بے حد اصرار کیا۔ مولانا تقی الدین صاحب نے امید دلائی کہ حضرت کے خطاب اور وہاں کے کچھ قیام سے بہتر تبدیلی پیدا ہونے کی توقع ہے۔ حضرت مولانا اسی امید پر راضی ہو گئے اور اپنے رفقاء کے ساتھ خصوصی جہاز سے دہلی تشریف لے گئے۔ پروگرام میں حضرت کے لیے ایوارڈ کا اعلان ہوا اور فوراً ہی حضرت مولانا نے دینی تعلیمی اداروں کے لئے اس کو تقسیم کرنے کا اعلان فرما دیا۔ تقریب میں مملکت کے وزراء اور اہم عہدہ داران بھی موجود تھے۔ حضرت مولانا کا ضعف انتہا کو پہنچا ہوا تھا مگر اس کے باوجود خطاب فرمایا اور اقبال کا یہ شعر پڑھا :

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا

محمدؐ عربی سے ہے عالم عربی

عربی میں حضرت مولانا نے جب اس کی ترجمانی فرمائی تو پورا ہال جو کچھ بھرا ہوا تھا تاثر میں ڈوب گیا۔

بقول کسی عارف کے ”جب مقررین نوازے جاتے ہیں تو سراپا فیض بن جاتے ہیں۔“

حضرت مولانا نے اپنی کمزور تواناؤں آواز میں جو کچھ فرمایا وہ دلوں میں اترتا چلا گیا۔
 حاکم شارقہ شیخ سلطان القاسمی اور ابو ظہبی کے نائب وزیر اعظم شیخ سلطان بن زائد خود ملاقات کے لیے آئے۔ کہنے والوں کا کہنا ہے کہ اس مختصر مدت قیام میں پورے دہائی کی فضا بدل گئی۔ حکام و امراء پر اس کا اثر پڑا۔ تین روز کے قیام کے بعد ہندوستان واپسی ہوئی اور یہی حضرت مولانا کی زندگی کا آخری بیرونی سفر ثابت ہوا۔

ایران

۱۹۷۳ء میں حضرت مولانا پہلی مرتبہ ایران تشریف لے گئے، وہاں اہم لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ وزیر تعلیم سے گفتگو کے دوران حضرت مولانا نے ان سے ایک ایسا چبھتا ہوا سوال کیا جس میں سمجھنے والے کے لیے پورا پیغام موجود ہے، اس سوال کا تعلق تاریخ اور فلسفہ تاریخ سے ہے، جس کو اقبال نے اپنے اس شعر میں ادا کیا ہے۔
 نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
 یہی آب و گل ایران وہی تبریز ہے ساقی

حضرت مولانا نے سوال کیا کہ ایران کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کو بعض اوقات محسوس ہونے لگتا ہے کہ جس ایران میں بجز Genius اور عبقری انسانوں کے اور کوئی پیدا نہیں ہوتا تھا اب اس دہائی و علمی زوال اور قحط الرجال کی کیا توجیہ ممکن ہے؟ صدیاں گذرتی چلی جا رہی ہیں اور متوسط سطح سے بلند اور عالمی شہرت کا کوئی آدمی سننے میں نہیں آتا؟ مولانا فرماتے ہیں کہ اس کا کسی نے تشفی بخش جواب نہیں دیا۔ پھر خود ہی مولانا نے اس کے دو اسباب تحریر فرمائے ہیں، ایک اپنے خاص مسلکی موقف میں متعصبانہ رویہ اور دیگر مسلکوں کے معاملہ میں عدم رواداری۔ اور دوسرے تصوف سے بعد جس نے ساز دل کو چھیڑنے اور روح کے چشموں کو جاری کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں پر وہ دلچسپ واقعہ بھی ذکر کر دیا جائے جو ایرانی انقلاب کے قائد آیت اللہ خمینی کے ساتھ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ حضرت مولانا ”رابطہ عالم اسلامی“ کے اجلاس میں شرکت کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تھے۔ اجلاس میں شرکت کے لیے عراق

سے ایک وفد آیا، خمینی صاحب ہی اس کی قیادت کر رہے تھے۔ خمینی صاحب اس وقت انقلاب ایران سے قبل عراق میں ایک طرح سے جلاوطنی کا وقت گزار رہے تھے۔ حضرت مولانا اور خمینی صاحب کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا گیا تو خمینی صاحب نے کہا ”نعم! اعرفہ من خلال کتابہ ردة ولا ابابکر لها یا لیتہ سماہ ردة ولا ابا حسن لها“ (ہاں! ہم مولانا سے اس کتاب کے ذریعہ سے واقف ہیں جس کا نام انہوں نے ردة ولا ابابکر لہا رکھا ہے۔ اس کا نام ردة ولا اباحسن لہا ہو سکتا تھا۔) حضرت مولانا فرماتے ہیں۔ ہم نے کہا: تعبیر یہ ہے کہ ”ردة ولا ابابکر لها وقضية ولا ابا حسن لها“۔

اس موقع پر اگلے روز رابطہ کے ارکان کو بیت اللہ میں داخلہ کے لیے مدعو کیا گیا۔ لیکن ہجوم کی وجہ سے ان حضرات کو ذرا انتظار کرنا پڑا۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ ہم مطاف میں ایک کنارے جا کر بیٹھ گئے، وہیں مولانا مودودی بھی آ گئے۔ کچھ دیر کے بعد خمینی صاحب آ کر کہنے لگے ”ہنا علمان من اعلام العالم الاسلامی فلندع اللہ“ (یہاں عالم اسلام کے دو قائد تشریف رکھتے ہیں ہمیں دعا کرنی چاہیے۔) اس کے بعد ہاتھ اٹھا کر خود ہی دعا شروع کر دی۔ ”اللہم اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان“ اس جملہ کو دہراتے رہے۔ بقیہ آیت نہیں پڑھتے تھے، تو ہم نے آیت کو مکمل کرتے ہوئے کہا ”ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا ربنا انک رؤوف رحیم“ (اے اللہ ہمارے دلوں میں ان کے لیے کوئی کھوٹ باقی نہ رکھ جو ایمان لا چکے۔) اس پر مولانا مودودی نے کہا آپ نے لقمہ دے ہی دیا۔ مولانا کے اس عمل کو وہ زیادہ سمجھ سکتا ہے جو شیعوں کے عقائد سے واقف ہو کہ وہ صحابہ سے کس درجہ بدگمانی رکھتے ہیں اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ سوائے دو تین صحابہ کے باقی سارے حضرات (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے۔

خمینی صاحب ایرانی انقلاب کے بعد اس کے قائد اور روح رواں بنے۔ ایسے متعدد مواقع ہیں کہ جہاں حضرت مولانا نے پوری جرأت اور قوت کے ساتھ حق کا اظہار فرمایا اور مصلحت آمیزی کے بجائے بالکل دو ٹوک انداز میں بات کہی۔ یہی حضرت مولانا کا وہ توازن فکر و عمل ہے جو ان کو تمام معاصر داعیوں اور مصالحین سے ممتاز کرتا ہے۔ ضرورت سمجھی تو

مصلحت کا خیال فرمایا، اگر کھل کر بات کرنا مناسب ہو، تو کسی کی بھی رعایت نہیں کی، نہ ان کو کسی کی ملامت کا ڈر ہوا اور نہ کسی قید و بند کا۔

ایک موقع پر ”رابطہ عالم اسلامی“ کے اجلاس میں (جب کہ سعودی حکومت عیسائیوں کے بارے میں نرم رویہ رکھتی تھی اور صرف یہودیوں کو ہی ہر غلط اقدام کا الزام دیا جاتا تھا) حضرت مولانا نے بڑی پر جوش اور مٹی برحقانق تقریر کی۔ اور اس میں صاف کہا کہ جس طرح یہودی مجرم ہیں اسی طرح عیسائی بھی ان کے جرم میں شریک ہیں، ان کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ تقریر بالکل دو ٹوک اور جرأت و قوت سے بھرپور تھی، اور اس میں کھل کر اس نظریہ کی تردید کی گئی تھی جو اس وقت سعودی حکومت نے اختیار کر رکھا تھا، اور رابطہ حکومت ہی کا ایک ادارہ تھا۔ مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ بھی حضرت مولانا کے ہمراہ تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مولانا کو بھی تقریر کے جوش کا احساس تھا مگر فرمانے لگے: ”الحمد للہ تجاز مقدس بار بار آچکا ہوں اب اگر حکومت پابندی بھی عائد کر دے تو مجھے پرواہ نہیں، حق بات یہی ہے کہ اس کو یہاں کے ذمہ داروں کو سمجھنا چاہیے۔“ اس واقعہ کے بعد ہی شاہ نے ملاقات کے لیے مولانا کو دعوت دی، اور بڑا اکرام کیا اور اس واقعہ کا تذکرہ تک نہیں کیا، اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ طبقہ خوب جانتا تھا کہ حضرت مولانا عام لوگوں کی طرح نہیں جو اپنی شہرت اور عزت کی خاطر بھی ضرورت بے ضرورت سلاطین و امراء کو برا بھلا کہتے رہتے ہیں اور اس کو کلمۃ حق عند سلطان جاشر کا عنوان دیتے ہیں۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ مولانا ایک مخلص اور دردمند داعی ہیں۔ مولانا کی شفاف زندگی ان کے سامنے تھی، اس لیے عام طور پر یہ طبقہ حضرت مولانا کے برملا اظہار حق اور نکیر پر متاثر ضرور ہوا لیکن دل گیر نہیں ہوا۔

ترکی

ترکی خلافت اسلامیہ کا آخری مستقر رہ چکا تھا۔ ترکوں نے حفاظت دین اور دفاع اسلام کا بڑا کام کیا تھا۔ یہ قوم دینی حمیت اور اسلامی غیرت میں ہمیشہ ممتاز رہی تھی۔ خلافت اسلامیہ کے سقوط بکمال اتنا ترک کے اقتدار میں آ جانے اور اسلامی شعائر کو مٹا دینے کی تمام تر کوششوں کے باوجود غیرت اسلامی کی چنگاری ان کے سینوں میں دبی ہوئی تھی، عرصہ کے

بعد جب پہلی مرتبہ عربی میں اذان دی گئی تو قوم خوشی میں بے قابو ہو گئی، لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور سجدہ میں گر گئے۔ لیکن اس عرصہ میں ان کو عربی رسم الخط سے نا آشنا کر دیا گیا، اور اسلامی تہذیب کی جگہ مغربی تہذیب نے اپنی تمام بے حیائیوں اور بے شرمیوں کے ساتھ وہاں کے پورے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہاں کی وہ اسلامی فوج جو کبھی مسجد کے میناروں کو دیکھ کر جوش اسلامی سے بھر جایا کرتی تھی، اب وہ اسلام سے نہ صرف نا آشنا بلکہ معاند بنی ہوئی تھی، اس کے ذہن و دماغ کو پوری طرح مسخ کیا جا چکا تھا۔ لیکن عوام کے دلوں میں ایمان کا بیج موجود تھا، اور اس کی اس طرح آبیاری کی ضرورت تھی کہ وہ برگ و بار لا سکے۔ غیرت دینی کی دبی ہوئی چنگاری کو اس طرح ہوا دینے کی ضرورت تھی کہ وہ شعلہ جوالہ میں تبدیل ہو سکے، اور ترک قوم دوبارہ اپنا کھویا ہوا وقار واپس لا سکے۔

حضرت مولانا وہاں کی تاریخ سے صرف واقف ہی نہیں بلکہ اس کے رمز شناس تھے۔ اس قوم سے مولانا کو بڑی امیدیں تھیں۔ اپنے سفروں میں وہاں کے مختلف طبقوں کو خطاب کر کے حضرت مولانا نے صاف صاف فرمایا تھا :

جب ناچیز اس آیت کی تلاوت کرتا ہے: ”وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ

إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرُؤُوفٌ رَحِيمٌ“ (البقرہ-۱۳۳)

(اور خدا ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو یونہی ضائع کر دے، خدا تو لوگوں پر بڑا مہربان اور صاحب رحمت ہے) تو اس کا ذہن ترکی قوم کی طرف جاتا ہے اور ذہن میں یہ آتا ہے گویا اللہ تعالیٰ ترکوں کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے کہ تمہارے پاس جو ایمان کی دولت تھی اور تمہارے اسلاف نے حمایت و حمیت اسلامی کا جو شاندار ثبوت دیا، جہاد کا جھنڈا بلند کیا، بازنطینی شہنشاہی کا دار السلطنت قسطنطنیہ فتح کیا، خلافت اسلامیہ کی ذمہ داریاں قبول کیں، مقامات مقدسہ کی حفاظت کی، اور یورپ پر بھی اسلام کی دھاک بٹھادی۔ اللہ تعالیٰ ان کارناموں کو ضائع نہیں کرے گا۔“ (۱)

حضرت مولانا نے ترکی کے متعدد سفر کیے۔ لیکن ذمہ داران حکومت میں سے کسی اہم

آدمی سے ملاقات کی نوبت نہیں آسکی، تاہم رفاہ پارٹی کے سربراہ نجم الدین اربکان خود کوئی مرتبہ حضرت مولانا سے ملے اور مولانا نے ان کو ترکی کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اہم مشورے دیئے۔ انہوں نے بڑی حکمت سے اسلامی عنصر کو حکومت میں داخل کرنے کی کوشش کی اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے، خود وہ نائب وزیر اعظم اور پھر وزیر اعظم مقرر ہوئے اور انہوں نے بتدریج بعض اہم اقدامات کیے، بعد میں وہ خود اگرچہ اس عہدہ پر فائز نہ رہ سکے لیکن انہوں نے بعض ایسے افراد تیار کر دیئے جو قدرے اسلامی ذہن رکھنے والے تھے، اور ان کے لیے اس کے مواقع تھے کہ وہ حکومت میں رہ کر کچھ اصلاحات کر سکیں۔

حسن اتفاق کہ حضرت مولانا جب ۱۹۹۶ء میں ترکی تشریف لے گئے تو وہاں وہ وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر فائز ہو چکے تھے۔ لیکن سوئے اتفاق کہ وہ اس وقت وہاں موجود نہ تھے بلکہ کسی ضروری بیرونی سفر پر گئے ہوئے تھے۔ اس وقت حضرت مولانا سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی، لیکن حضرت نے ان کے نام مشوروں پر مشتمل ایک خط تحریر فرما کر ایک ذمہ دار شخص کے حوالہ کیا جو بعد میں ان کو پہنچا دیا گیا۔

خط میں حضرت مولانا نے سب سے پہلے ترکوں کے کارناموں کا ذکر کیا، ان کی حفاظت دین اور دفاع اسلام کی کوششوں کا تذکرہ فرمایا پھر فرمایا :

”سب سے پہلا بنیادی اقدام (جو پر عزم اور جرأت مندانہ ہو اور ایسا انقلاب انگیز ہو جس کی اس ملک اور اس محبوب قوم کو ضرورت ہے) یہ ہونا چاہیے کہ اس قوم کو یورپ و امریکہ کی غلامی سے آزاد کرایا جائے، خاص طور پر اس طبقہ کی فکر کی جائے جو یونیورسٹیوں کا ساختہ پر داختہ ہے، جس کے ہاتھ میں زمام اقتدار آنے والی ہے، اس کو لادینیت اور مغربی مسیحیت کے پھندے سے نکالا جائے اور اس پر جو عقلی، تمدنی، تہذیبی اور تنظیمی مغربی چھاپ ہے اس کو زائل کیا جائے۔ یہ اسی تہذیب جدید کا نتیجہ ہے کہ نئی تعلیم یافتہ نسل اپنی باطنی قوت، جوش و جذبہ اور قربانی کی روح سے عاری ہو گئی ہے۔ اس کے اندر مادی آرائش و زیبائش سے مقابلہ کرنے اور سیاحت کی عقلی و تمدنی سازشوں سے نبرد آزما

ہونے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے۔ نوجوانوں میں اسلام پر اعتماد بحال کیا جائے، خاص طور پر تعلیم یافتہ اور مشفق نوجوانوں کی فکر کی جائے جو اسلام کے خلود و بقا اور ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اسلامی قیادت کی صلاحیت اور اس پر اعتماد بحال کرنے میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں اور جو عقلی و جذباتی اثر و نفوذ رکھتے ہیں۔

اس نئی نسل میں صحافت اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ سے اسلامی عقائد اور اسلامی نظام انسانیت و اجتماع کے بارے میں جو احساس کمتری پیدا ہو گیا ہے اس کو ایسے اسلامی لٹریچر کے ذریعہ سے دور کیا جائے جو دین پر اعتماد بحال کر سکے۔ یہ احساس ایک ایسا مہلک مرض ہے جو اس امت کو روگ کی طرح لگ گیا ہے، وہ امت جس کو اپنے دین پر ناز ہے اور اپنے عقائد و شعائر پر فخر ہے، وہ ایک معنوی ارتداد کا شکار ہو رہی ہے اور یورپ کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی ہے۔

..... اس کے لیے تعلیم و تربیت، تہذیب، ذرائع ابلاغ، اور صحافت کے نظام کو بدلنا ہوگا اور اس نصاب تعلیم کو رواج دینا ہوگا جو نئی نسل اور تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہنوں کی اسلامی تشکیل کر سکے۔

ان تمام کاموں میں جلد بازی اور جوش کے بجائے حکمت و تدبیر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔..... الحمد للہ آپ کے اندر اس کی صلاحیت موجود ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو قیادت کا موقع عطا فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی رہنمائی فرمائے اور امت اعدائے اسلام کی جن سازشوں کا شکار ہو گئی ہے آپ کے ذریعہ وہ اس شکنجے سے نکل سکے۔“ (۱)

حضرت مولانا کے فیض یافتہ اور ان کی فکر کی نمائندہ شخصیت شیخ یوسف صالح قارا جابا مسلسل حضرت مولانا کی اس فکر کے مطابق تعلیم یافتہ طبقہ کی ذہن سازی کی کوشش کرتے رہے۔ موجودہ وزیر اعظم موصوف کے فیض یافتہ ہیں اور قدرے دینی ذہن رکھتے ہیں اور حکمت کے ساتھ دین کے احیاء میں مصروف ہیں۔ لعل اللہ بحدث بعد ذلک أمرا۔

پاکستان

مملکت خداداد پاکستان سے حضرت مولانا کا تعلق خاندانی بھی تھا اور روحانی بھی۔ خاندان کا ایک بڑا حصہ پاکستان میں سکونت پذیر تھا، جن میں حضرت مولانا کے حقیقی پھوپھا اور استاد مولانا سید محمد طلحہ صاحب اور پھوپھی صاحبہ کے علاوہ متعدد قریبی اعزہ اور اہل تعلق بھی تھے۔ حضرت مولانا کے شیخ اول حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب دینپوریؒ اور مربی و استاد حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کا تو وہ مستقل مسکن اور وطن تھا۔ ان حضرات کے علاوہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کا بھی وہ وطن تھا، وہاں حضرت کا طویل طویل قیام ہوتا رہتا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد سے ۱۹۷۸ء تک بار بار مولانا پاکستان تشریف لے گئے۔ لیکن کبھی حکومت کے کسی ذمہ دار سے نہ حضرت مولانا نے ملنے کی کوشش کی اور نہ ہی دوسری طرف سے تحریک ہوئی۔ سب سے پہلے صدر جنرل ضیاء الحق صاحب مرحوم ہیں جنہوں نے حضرت مولانا سے ملاقات کی۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ ”رابطہ عالم اسلامی“ کی جانب سے جون ۱۹۷۸ء کے اواخر میں کراچی میں ایشیائی کانفرنس منعقد ہوئی۔ پاکستان کے وزیر قانون اور امور مذہبی جناب اے۔ کے۔ بروہی صاحب نے کانفرنس کی صدارت کی اور صدر پاکستان نے افتتاح کیا۔ بروہی صاحب حضرت مولانا سے عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کے اختتام پر انہوں نے خود جنرل صاحب کو حضرت مولانا سے ملوایا، وہ حضرت مولانا سے پہلے سے واقف تھے، بہت تعلق و عقیدت سے ملے اور حضرت مولانا سے درخواست کی کہ وہ ان کے لیے کسی خاص دعا کی تلقین فرمادیں۔ حضرت مولانا نے ان کے سامنے درود شریف کی اہمیت بیان فرمائی اور فرمایا کہ آپ اسی کو مضبوطی سے پکڑ لیجئے یہی سب ضرورتوں کے لیے کافی ہے۔ اس کے علاوہ حضرت مولانا نے ان کو خاص طور پر حجاز مقدس اور حرمین شریفین کے بارے میں ان کی ذمہ داری یا دلدائی اور ان کی حفاظت کے لیے اپنی خدمات اور مساعی صرف کر دینے کی طرف متوجہ کیا۔ جنرل صاحب نے ان ہدایات کا بڑا اثر قبول کیا، اور درود شریف کا اپنی زندگی میں خاص اہتمام کیا۔ اس کے علاوہ بار بار حجاز مقدس

حاضری کو بھی اپنی زندگی کا ایک وظیفہ بنالیا۔ وہاں کی حکومت سے بہت ہی قریبی دوستانہ تعلقات قائم کیے اور ہر طرح ان کے تعاون کی فکر رکھی۔

اسی سفر میں انہوں نے اسلام آباد کے صدارتی محل میں حضرت مولانا کو تشریف آوری کی دعوت دی اور ملاقات کے دوران کہا کہ ”حضرت میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ اس کے جواب میں حضرت مولانا نے بڑی حکیمانہ بات فرمائی کہ

”آپ ہندوستان سے تعلقات بہتر رکھیں تاکہ ہم اطمینان سے معتدل اور پرسکون ماحول میں اپنے تعمیری و تعلیمی ورفاہی کام کر سکیں۔“

صدر صاحب نے اس کی پوری تائید کی اور ساری زندگی اسی پالیسی پر گامزن رہے، نازک موقعوں پر بھی انہوں نے ضبط نفس اور حقیقت پسندی کا دامن نہیں چھوڑا۔ سفر سے واپسی کے بعد حضرت مولانا نے ان کو ایک مفصل مکتوب اور اپنی اہم تصنیفات مطالعہ کے لیے بھیجیں۔ مکتوب میں حضرت مولانا نے پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے بعض تجاویز پیش کی تھیں۔ صدر موصوف نے کتابوں کا مطالعہ بھی کیا اور اپنے شکریہ کے خط میں اپنے تاثر کا اظہار کیا۔

۱۹۸۰ء میں حضرت مولانا پاکستان تشریف لے جانے والے تھے مگر بعض مجبور یوں کی بنا پر سفر ملتوی ہو گیا۔ حضرت مولانا نے اس مناسبت سے صدر صاحب کو ایک مفصل مکتوب تحریر فرمایا جس میں ان کو بطور خاص پاکستان میں اسلامی نظام نافذ کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ صدر صاحب نے اس کا جو جواب دیا اس کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے :

”نظام اسلام کے متعلق آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے میں ان سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ ہماری کوشش ہے کہ ہم نظام اسلامی کو جلد از جلد تمام زندگی کے شعبوں میں نافذ کریں، کیوں کہ اسلام کو عملی زندگی میں اپنانا ہمارا صرف دینی تقاضا ہی نہیں بلکہ ہمارے ملک کا دار و مدار بھی اسی پر ہے۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کار خیر کو مکمل کرنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔“ (۱)

۱۹۸۴ء میں حضرت مولانا نے شرق اردن، یمن اور حجاز کا سفر کیا۔ واپسی میں چند روز

(۱) نذرانہ عقیدت مرتب فضل ربی ندوی مطبوعہ کراچی

کے لیے پاکستان میں قیام فرمایا۔ صدر صاحب کو جب معلوم ہوا تو کراچی میں بڑے اہتمام سے حضرت مولانا سے ملے۔ حضرت مولانا نے ان کو مسجد اقصیٰ کا وہ خوبصورت مرمری ڈھانچہ پیش کیا جو عمان میں حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ اس میں زبان حال سے یہ اشارہ بھی تھا کہ مسجد اقصیٰ کی بازیافت ایک صاحب ایمان مسلم صدر مملکت کی ذمہ داری ہے۔

۱۹۸۶ء میں صدر صاحب کی حضرت مولانا سے آخری ملاقات ہوئی، اس کی تقریب یہ ہوئی کہ حضرت مولانا نے استنبول سے واپسی میں تین روز کے لیے کراچی میں قیام فرمایا، صدر صاحب کو کسی طرح حضرت کی تشریف آوری کی خبر ہوئی تو انہوں نے فون پر رابطہ کر کے اسلام آباد آنے کی دعوت دی۔ حضرت مولانا نے معذرت فرمائی تو وہ خود صرف ملاقات و زیارت کے لیے کراچی تشریف لائے۔

صدر صاحب حضرت مولانا سے بڑی قدردانی کا تعلق رکھتے تھے اور حضرت مولانا کی ہدایات و مشوروں کی بڑی قدر کرتے۔ حضرت مولانا کی بعض کتابیں انہوں نے بڑے شوق سے پڑھیں اور ان سے فائدہ اٹھایا۔ ”جب ایمان کی باد بہاری چلی“ (جس میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے بڑے مؤثر واقعات بڑی دلکش زبان میں بیان کیے گئے ہیں) انہوں نے فوج کے نصاب میں داخل کی۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی کتاب ”سیرت النبی“ (جلد ہفتم) کا انہوں نے خود مطالعہ کیا جو معاملات اور اسلام کے نظام حکومت اور سیاست کے موضوع پر مشتمل ہے۔ حضرت مولانا کا اس پر بڑا پر مغز اور مبسوط مقدمہ ہے۔ اس کتاب سے وہ بہت متاثر ہوئے اور حضرت مولانا کے لیے انہوں نے حکومت پاکستان کی جانب سے ایک لاکھ روپیہ کے عطیہ کا اعلان کیا۔ حضرت مولانا نے یہ رقم بجائے خود قبول کرنے کے اس کا نصف دارالمصطفین اعظم گڑھ کو بھیج دینے کی ہدایت کی جہاں سے یہ کتاب شائع ہوئی تھی۔ اور نصف سید صاحب کے پسماندگان کو دے دینے کے لیے فرمایا۔ اس کے بعد جنرل صاحب سے حضرت مولانا کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ ”آپ قبول فرمالیتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔“ حضرت مولانا نے فرمایا ”میرا یہ طرز عمل پہلے بھی نہیں رہا۔“ صدر صاحب فیصل

ایوارڈ کے بارے میں حضرت مولانا کے طرز عمل سے واقف تھے، وہ اس پر خاموش ہو گئے۔ حضرت مولانا کو صدر صاحب سے بڑی امیدیں تھیں۔ جب بھی ان سے ملاقات ہوئی تو ضرور ان کو ہدایات اور مشورے دیتے۔ ایک ملاقات میں حضرت مولانا نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ فوج میں ”فتوح الشام“ جیسی کتابیں بھی باقاعدہ پڑھوائی جائیں تاکہ ان کے اندر جذبہ جہاد پیدا ہو اور اسلاف کے مجاہدانہ کارناموں سے واقفیت ہو سکے۔ وہ بھی بہت سنجیدہ اور ٹھوس فکر کے حامل تھے اور ان کے ذہن سے اعلائے دین کے بہت سے خاکے تیار رکھتے تھے اور وہ بڑی حکمت سے ان میں رنگ بھرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ اچانک وہ حادثہ پیش آیا جس نے سارے منصوبے زیر و بر کر کے رکھ دیا۔

عالم اسلام کے حکمرانوں میں شاہ فیصل مرحوم (فرماں روا مملکت سعودیہ) اور جنرل ضیاء الحق مرحوم (صدر پاکستان) کا نام سب سے نمایاں ہے جنہوں نے اعلاء دین اور اتحاد اسلامی کی فکر کی۔ حضرت مولانا کو ان دونوں سے خاص تعلق تھا اور یہ دونوں بھی حضرت مولانا کی ہدایات کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان پر عمل کی کوشش بھی کرتے تھے۔

کسی سفر پاکستان کے موقع پر حضرت مولانا سے انٹرویو کے دوران یہ سوال کیا گیا کہ صدر پاکستان بہت دنوں سے نفاذ شریعت کی بات کر رہے ہیں لیکن اس پر عمل کرنے کی نوبت ابھی تک نہیں آئی۔ اس سلسلہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟ حضرت مولانا نے اس کا جو جواب دیا وہ دعوت کا ایک زریں اصول ہے اور اس میں دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والوں کے لئے بڑی رہنمائی ہے اور اس سے حضرت مولانا کے طبقہ حکمران میں دعوت کا طریقہ کار بھی وضاحت سے سامنے آتا ہے۔ اس لیے اس جواب کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ حضرت مولانا نے فرمایا :

”ایسے موقع پر دو رویے ہو سکتے ہیں؛ ایک یہ کوئی مسلمان جو صورتاً بڑا

مشرع نظر نہ آتا ہو آپ سے کہے میں ایک مسجد تعمیر کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اس سے کہیں کہ یہ صورت اور خانہ خدا کی تعمیر! آپ کو کبھی مسجد میں جانے کی توفیق بھی ہوئی، اور آپ کے ’اپ دادا نے بھی کبھی یہ کام کیا ہے؟! تو اگر وہ مسجد بنانے کا ارادہ بھی رکھتا ہے تو کان پکڑ لے گا اور اس ارادہ سے باز آ جائے گا۔

دوسری شکل یہ ہے کہ آپ کہیں سبحان اللہ ارادہ مبارک ہو آپ ہی جیسے لوگوں نے مسجدیں بنائی ہیں، ہم بھی اس کار خیر میں شریک ہیں اور آپ کا ہاتھ بٹائیں گے۔ تو اگر اس کو اس کام میں تردد تھا، تو وہ اس کا عزم کر لے گا اور مسجد کی تعمیر کی سعادت حاصل کرے گا۔“ (۱)

سردار فاروق احمد لغاری پاکستان کے وہ آخری رہنما ہیں جن کو حضرت مولانا سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ پاکستان میں عرصہ سے ”رابطہ ادب اسلامی“ کا دفتر قائم ہو چکا تھا۔ وہاں کے ذمہ داروں کو خیال ہوا کہ سرزمین پاکستان پر رابطہ کا ایک عالمی اجلاس بلایا جائے جس میں صدر رابطہ کو بھی دعوت دی جائے۔ اکتوبر ۱۹۹۷ء کی تاریخیں اس کے لیے طے کی گئیں اور حضرت مولانا نے اپنے ضعف کے باوجود سیمینار کی دعوت قبول فرمائی۔ اس وقت کے صدر مملکت فاروق احمد لغاری کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تو حضرت مولانا کی تشریف آوری کی خبر سن کر وہ فوراً ہی شرکت کے لیے تیار ہو گئے۔ جناب مصطفیٰ صادق خاں بیان کرتے ہیں کہ دعوت نامے میں انہوں نے جب حضرت مولانا کا نام پڑھا تو پوچھا کہ

”یہ وہی علی میاں تو نہیں ہیں جن کا تعلق لکھنؤ شہر سے ہے اور اہل عرب بھی ان کا بے حد احترام کرتے ہیں؟ برسوں کی بات ہے کہ سویٹزر لینڈ میں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ایک مصری عرب سعید رمضان بھی ہمارے ساتھ تھے۔ وہاں سیر کرتے کرتے نماز کا وقت ہوا تو میں نے اور اس عرب نے مولانا کے پیچھے نماز پڑھی تھی، ان کا حسن قرأت جذب و شوق اور خشوع و خضوع کے ساتھ دعا کا منظر آج بھی مجھے یاد ہے۔ میں اور میرے عرب دوست اس ناقابل فراموش منظر سے بہت محظوظ ہوئے تھے۔ اگر یہ وہی علی میاں ہیں تو پھر اس دن کی میری تمام مصروفیات و معمولات منسوخ ہیں۔ اس افتتاحی اجلاس میں ضرور شریک ہوں گا۔“ (۲)

(۱) پرانے چراغ حصہ سوم صفحہ : ۱۳۳

(۲) مجلہ قافلہ الادب الاسلامی ۱/ ۱۳۸

صدر موصوف نے حضرت مولانا کا سرکاری سطح پر استقبال کیا، لاہور کے الحمراء ہال میں افتتاحی اجلاس ہونے والا تھا، جب صدر صاحب تشریف لائے تو تنظیمین نے ان کا شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے۔“

یہ تو میرا فرض تھا، مولانا تشریف لائیں اور میں نہ آؤں یہ کیسے ممکن ہے؟! شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا چاہیے کہ مجھے اس خدمت کا شرف بخشا گیا۔“ (۱)

بڑے احترام و عقیدت سے وہ حضرت مولانا سے ملے۔ پورے اجلاس میں شریک رہے۔ وہ جمعہ کا دن تھا۔ حضرت مولانا کو جمعہ کی نماز جامعہ اشرفیہ کی مسجد الحسن میں پڑھنی تھی اور خطاب بھی کرنا تھا۔ صدر موصوف نے بھی وہیں نماز پڑھی اور خطاب سنا اور دعا میں بھی شریک رہے۔ اس موقع پر متعدد مرتبہ حضرت مولانا نے یہ دعا بھی فرمائی کہ ”یا اللہ! پاکستان کو صحیح معنی میں ایک اسلامی ریاست بنادے۔“ صدر موصوف کی موجودگی میں حضرت مولانا کی اس دعا میں موصوف کے لیے ایک پیغام بھی تھا اور دعوت فکر و عمل بھی۔

تیونس

حبیب بورقبیہ کے بعد تیونس میں جب زین العابدین برسر اقتدار آئے تو حضرت مولانا نے ان کو خط لکھ کر مساجد و مدارس اور دینی تعلیمی اداروں کی آزادی کی طرف متوجہ کیا اور ملک کے مفاد کے لئے ضروری قرار دیا۔ انہوں نے اس خط سے روشنی حاصل کی اور ابتداء میں بڑی حد تک آزادی دے دی لیکن افسوس کی بات ہے کہ بعد میں کچھ عجلت پسندوں کی وجہ سے انہوں نے دوبارہ سختی شروع کر دی۔

اکثر مسلمان ملکوں کے سربراہان کو حضرت مولانا نے مشورے دیئے اور فہنی و فکری رہنمائی کا سامان کیا اور بہت سے ملکوں میں اس کے بہتر نتائج بھی سامنے آئے۔



﴿ باب سوم ﴾ ادب اسلامی کی تشکیل ایک تجدیدی کارنامہ

زبان و ادب کی اہمیت ہر جگہ اور ہر زمانہ میں تسلیم کی گئی ہے، انسانی معاشرہ پر اس نے گہرے نقوش چھوڑے ہیں، بعثت نبوی ﷺ سے پہلے عربوں میں اس کی اہمیت مسلم تھی، شعر اور نثر میں وہ اپنی زبان دانی کے جوہر دکھلاتے تھے، قومی مفاخر بڑی شان سے بیان کیے جاتے اور اس کے لیے خاص خاص موقعوں پر محفلیں سجائی جاتی تھیں، ان کے شعر و ادب میں اگرچہ رزمیہ شاعری اور جوش و جذبات یا مفاخرت کا عنصر غالب تھا مگر غزل میں (اس لیے کہ اس کی ایک قسم نسیب ہے جو فحش گوئی کے اثر سے پاک ہے، یا حب عذری ہے جو عام غزل سے مختلف ہے) شرافت ملحوظ رکھتے تھے۔ عفت کی ان کے یہاں ایک اہمیت تھی، جن شعراء نے اس کی پابندی نہیں کی ان کے لیے الگ تعبیرات استعمال کی گئی ہیں، اسی طرح حکمت اور ادب و مکارم حیات اور حلم و جود و سخا کے بھی ان کے یہاں کثرت سے اشعار ہیں، عربوں کی ادبی تاریخ جب بیان کی جاتی ہے تو عام طور پر ان موضوعات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور ان کو صرف درندہ صفت اور بے حیا بنا کر پیش کیا جاتا ہے، جب کہ یہ خیال صحیح روش سے ہٹا ہوا ہے۔ عربوں کی قومی صفات میں فروسیت، حقیقت پسندی اور اولوالعزمی کو خاص درجہ حاصل ہے، یہ صحیح ہے کہ ان میں بعض افراد ایسے بھی تھے جو اپنی درندگی اور بے حیائی میں انسانی حدود کو تجاوز کر گئے تھے لیکن یہ ان افراد کی اپنی انفرادی صفت تھی، قومی سطح پر ان چیزوں کو بہر حال معیوب سمجھا جاتا تھا۔

بعثت نبوی ﷺ کے بعد جب زبان و ادب کے شناساؤں نے کلام الہی سنا تو مسحور ہو گئے، اس کی اعجاز بیانی کے سامنے انہوں نے گھٹنے ٹیک دیے، خود نبی اکرم ﷺ کا تعلق قبیلہ قریش سے تھا جس کو ”افصح القبائل“ سمجھا جاتا تھا اور اس میں بنو ہاشم فصیح تر قرار پائے پھر ان میں بھی آپ ﷺ کی زبان معجز بیان کو ہر ایک نے تسلیم کیا۔ خود آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”أوتيت جوامع الكلم“ (مجھے اعجاز بیان سے مالا مال کیا گیا ہے)۔ یہیں سے زبان و ادب کی باگ ڈور اسلام کے ہاتھ میں آئی۔ اسلام نے نہ صرف یہ کہ اس کی خوبیوں کو باقی رکھا بلکہ اس کو اس کی بلندی تک پہنچایا۔ تمام مذاہب میں یہ صرف اسلام کی خوبی ہے کہ اس نے علم کو فروغ دیا، ورنہ دوسرے مذاہب میں عام طور پر علم سے کشاکش نظر آتی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ آج جو کچھ بھی علم کی روشنی ہے وہ صرف اسی ذات نبوی ﷺ کا فیض ہے جس کے دم سے اس کی شمع روشن ہوئی پھر ساری دنیا نے اس سے روشنی حاصل کی۔

مسلمانوں نے اور علوم کی طرح زبان و ادب پر بھی توجہ کی، قرآن و حدیث کے ساتھ ادب و لغت کی طرف بھی توجہ دی گئی، جس طرح ادب و لغت سے دلچسپی رکھنے والوں نے قرآن و حدیث کے الفاظ کی تحقیق اور ان کی ادبی خصوصیات پر توجہ دی اور کتابیں لکھیں۔ اسلام نے ادب میں مقصدیت پیدا کی اور عام طور پر ادباء نے یہ اصول تسلیم کیا کہ کسی شعر کی ادبی رفعت کے لیے یہی کافی نہیں ہے کہ اس میں صرف زبان کا چٹخارہ ہو بلکہ اس میں افادیت کا پہلو بھی ہونا چاہیے۔ ادب عربی کے چند تسلیم شدہ مصادر میں سے ”ادب الکاتب“ اور ”الشعر والشعراء“ کے مصنف ابن قتیبہ نے خاص طور پر اس پر زور دیا ہے۔ ان کے معاصر جاحظ نے ”البيان والتبيين“ میں زبان دانوں کے اقوال نقل کیے ہیں جن میں کلام میں آیت یا حدیث کا شامل کرنا کلام کی ادبی شان کو بڑھانے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ ادب کے محقق ابن الانباری نے بھی ادب میں اخلاق کی رعایت پر زور دیا ہے۔

تقریباً چار صدیوں تک ادب اسلامی ثقافت کے زیر اثر رہا یہاں تک کہ غیر مسلم ادیبوں کے یہاں جیسے الصابی، اسلامی محاورے اور اسلامی اقدار کے نمونے ملتے ہیں، لیکن مسلمانوں نے اس پر کوئی سائن بورڈ نہیں لگایا، بعض بڑے بڑے عیسائی اور غیر مسلم ادباء نے بھی اپنے جوہر دکھائے اور ان کو تسلیم کیا گیا، تاہم اسلامی ثقافت کا اثر اس پر اتنا گہرا تھا کہ غیر

مسلم بھی اس کو اختیار کر کے فخر محسوس کرتے تھے۔

الصّابی (۱) خود صابی تھا مگر روزے رکھتا، افطار کی دعوت کرتا اور دوسرے اسلامی مظاہر اختیار کرتا۔ اس کی صرف یہ وجہ تھی کہ مسلمانوں نے ادب و زبان کو عروج دیا تھا، اس کے ساتھ اسلامی ثقافت بھی اس میں شامل ہو گئی تھی اور کسی ادیب کے لیے بلندی اسی وقت ممکن تھی کہ وہ اس کے تمام اجزاء سمیٹ لے۔

قدامہ ابن جعفر (۲) وہ پہلا شخص ہے جو یونانی ادب سے متاثر ہوا اور اس نے اباحت پسندی کو ترجیح دی اور یہ نظریہ پیش کیا کہ ادب کی بلندی کے لیے صرف زبان اور الفاظ کی بندش اور اس کی ترکیب کا حسن کافی ہے، اس کی ضرورت نہیں کہ اس میں کوئی مقصدیت بھی ہو، آدمی جس طرح چاہے بہتر طریقہ پر اپنی بات کہہ سکتا ہے، خواہ اس میں معنویت ہو یا نہ ہو، اگر وہ بات اچھے الفاظ اور خوبصورت پیرایہ میں کہی گئی ہے تو وہ ادب کا نمونہ ہے۔ اس کے نتیجے میں آزادی کے ساتھ بے راہ روی کا وہ رجحان پیدا ہوا کہ بے حیائی و فحاشی کو ادب میں شامل کر دیا گیا، اس کے بعد کے اشعار میں ایسی فحش گوئی نظر آتی ہے کہ شریف آدمی کے لیے اس کا سننا اور بیان کرنا بھی مشکل ہے، زمانہ جاہلیت کے شعراء بھی وہاں تک نہ جاسکے جہاں تک اس دور کے شعراء نے اپنے اشعار میں بے حیائی سے کام لیا۔

قدامہ کے اس مسلک کو جو اس نے نقد شعر میں ارسطو کے نظریہ سے متاثر ہونے کی وجہ سے اختیار کیا اکثر عرب ناقدین نے ناپسند کیا، اور اس کو عربی مزاج کے خلاف قرار دیا۔ (۳) اس کی کتاب کے نقد میں متعدد ناقدین ادب نے کتابیں لکھی ہیں۔ اس سے عربی ادب کے مزاج کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ (۴)

پانچویں صدی کے آغاز سے زبان و ادب پر اسلام پسندوں کی رسی ڈھیلی پڑتی چلی گئی

(۱) ابواسحاق ابراہیم بن ہلال (۳۸۴ھ) عباسی دور کا بڑا شاعر ہے۔ ”الصّابی“ کے لقب سے مشہور ہی اسی لیے ہوا کہ بے دین تھا، عربی زبان میں صابی اسی کو کہتے ہیں جو دین سے نکل گیا ہو۔

(۲) قدامہ بن جعفر متوفی ۳۳۵ھ وہ پہلا شخص ہے جو یونانی ادب سے متاثر ہوا اس نے ارسطو کی کتابیں عربی میں منتقل کیں اور عربی نقد کو یونانی نقد سے ہم رشتہ کرنے کی کوشش کی۔

(۳) اگرچہ عربی ادب میں اس کو ایک الگ صنف قرار دیا گیا، اور ان شعراء کو خلعاء و ماجنین کے نام سے یاد کیا گیا

(۴) دیکھئے تاریخ النقد الادبی عند العرب ۱۸۹-۲۱۴

اور بالآخر اس کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آئی جو اسلامی معاشرت اور اسلامی ثقافت سے بہت دور تھے۔ انہوں نے آہستہ آہستہ ادب پر اجارہ داری قائم کر لی۔ پھر انظر الیٰ من قال پر عمل شروع ہو گیا کہ اگر کوئی روایتی ادیب شاعر یا نثر ہوتا تو اس کا کلام ادب شمار کیا جاتا، علماء کی کتابوں میں خواہ کتنے ہی بہتر سے بہتر ادب کے نمونے ہوں مگر چونکہ ان پر ادب کا سائن بورڈ لگا ہوا نہیں ہوتا اس لیے ان کی تحریروں کو ادب کی صنف میں داخل نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ادب میں لادینیت اور الحاد

بیسویں صدی کے آغاز تک اگرچہ ادب میں فحش گوئی و بے حیائی کا بہت بڑا عنصر شامل ہو چکا تھا تاہم وہ الحاد و لادینیت سے بڑی حد تک پاک تھا، جب مغربی تہذیب نے اسلامی ملکوں میں نیچے گاڑنے شروع کیے تو وہاں کے ادبی رجحانات بھی آہستہ آہستہ ان ملکوں میں منتقل ہونا شروع ہو گئے۔

یورپین ادب کی اپنی ایک تاریخ ہے، وہ یونان کے فلسفیانہ خیالات، مشرکانہ روایات اور ادبی نظریات کا ساختہ پر داختہ ہے، جس کی بنیاد ہی ماضی سے بغاوت، مذہب بیزاری اور مادیت سے وابستگی پر پڑی اور واقعہ یہ ہے یورپ کی ترقی کلیسا سے بغاوت اور پھر کلیسا کی شکست کے بعد شروع ہوئی۔ دین و دنیا کو الگ کر دیا گیا اور یہ اصول زبان زد ہو گیا کہ ”جو اللہ کا ہو وہ اللہ کو دو جو قیصر کا ہو وہ قیصر کو دو۔“ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ادبی رجحانات میں بھی مذہب بیزاری کا عنصر پوری طرح حاوی ہو گیا، اور جب یہ رجحانات اسلامی ملکوں میں پہنچے تو وہاں کے ادب نے بھی ان کا پورا اثر قبول کیا اور اس میں بھی الحاد و لادینیت کا رجحان پیدا ہو گیا۔ خاص طور سے اشتراکیت اور اباحت کے اثرات جو مغربی زبانوں سے عربی ادب میں منتقل ہوئے اس کا یہ نتیجہ تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ عربی ادب پر ایسے ادباء کا اثر غالب آ گیا جن کی تربیت مغرب میں ہوئی یا جنہوں نے مغربی ادب کا زیادہ مطالعہ کیا، خالص دینی دعوتی گفتگو کا ادب و علم سے کوئی تعلق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لوگوں میں اس سے ایک وحشت پیدا ہو گئی۔ سعودی عرب جیسے اسلامی ملک میں بھی اس کا ایسا اثر پڑا کہ اچھے اچھے لوگ

اس رو میں بہنے لگے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ۱۹۴۲ء کے اپنے سفر حجاز میں ایک صاحب کے سامنے ہندوستان میں دعوتی کام کا طریقہ بیان فرمایا۔ وہ صاحب بڑے ادیب، ایک ادبی مجلہ کے مدیر تھے اور ایک دینی مدرسہ کے فارغ بھی تھے۔ برجستہ کہنے لگے یا شیخ خل الدین للہم مولانا دین کو حرم کے لیے چھوڑیے۔ یہ بتائیے کہ ہندوستان میں تقسیم کے کیا اثرات پڑے؟ اس کے اسباب کیا ہوئے اور مسلمانوں نے اس میں کیوں دھوکہ کھایا؟ اس واقعہ سے اس دور کی ذہنیت سامنے آتی ہے۔ یہ سب اسی مغربی تہذیب کا اثر تھا جس نے زبان و ادب کو بھی اپنے دائرہ اثر میں لے لیا تھا۔ یہ ایسی خطرناک صورتحال تھی کہ اس کے بڑے بھیا نک نتائج سامنے آسکتے تھے۔ عربی زبان و ادب نے بڑی حد تک یہ اثرات قبول کر لیے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ اس کی قیادت ایسے طبقہ کے ہاتھ میں تھی جس کو دین سے مناسبت نہیں تھی۔ اس کے برخلاف اردو زبان و ادب پر علماء اور اہل دین حاوی تھے اور اردو کے اساطین ادب سب کے سب اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے اردو ادب پر فرنگی تہذیب کا وہ اثر نہیں پڑا جو عربی زبان و ادب پر پڑا، یہ اور زیادہ خطرہ کی بات تھی۔ حجاز مقدس مسلمانوں کے لیے دل کی حیثیت رکھتا ہے، وہاں کی زبان اسلام کی سرکاری و عالمی زبان ہے، اسی زبان میں کلام الہی نازل ہوا، اس کا متاثر ہو جانا بڑی فکر و تشویش کی بات تھی۔

حضرت مولانا کی فکر و تشویش

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو اللہ تعالیٰ نے بڑا پختہ شعور، بالغ نظر اور بصیرت عطا فرمائی تھی۔ سب سے پہلے مولانا نے اس خطرہ کو محسوس کیا ایک داعی اور مؤرخ کی حیثیت سے ایک جگہ وہ صاف صاف تحریر فرماتے ہیں۔

”جس طرح کبھی فلسفہ کے راستہ سے الحاد اور تشکیک کا سیلاب مسلمانوں کے علمی و فکری طبقہ میں آتا تھا اس کے بعد سائنس (خاص طور پر علوم طبعیہ) کے راستے سے تعلیم یافتہ طبقہ میں آنے لگا اور کہیں کہیں نفسیات (Psychology) اجتماعیات (Socialogy) اور اقتصادیات و سیاسیات کے راستہ سے آتا تھا۔ اب بہت سی جامعات اور درسگاہوں میں ادب کے ذریعہ سے آرہا ہے۔ اور

سب سے زیادہ بلاد عربیہ اس کا شکار ہو رہے ہیں۔“ (۱)

مزید فرماتے ہیں :

”بلاد عربیہ بالخصوص مصر میں تقریباً نصف صدی سے ادب و تنقید اور نوجوانوں کو ذہنی و ادبی غذا پہنچانے کے میدان پر ان ادباء اور اہل قلم کی اجارہ داری قائم ہو گئی تھی جن کے عقائد میں خود تزلزل، ذہن میں انتشار اور تحریروں میں تشکیکی رجحان پایا جاتا تھا۔“ (۲)

ان حالات نے حضرت مولانا کو مضطرب کر دیا، انہوں نے ادب کے گہوارہ میں آنکھیں کھولی تھیں۔ مولانا کے خاندان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دین و ادب کا جامع ہے۔ مولانا کے والد ایک طرف بڑے ادیب و مؤرخ، شعر و ادب کا بلند ذوق رکھنے والے مصنف تھے تو دوسری طرف دین کی فکر، اور دعوتی ذہن رکھنے والے صاحب نسبت بزرگ بھی تھے۔ مولانا میں یہ دونوں نسبتیں کام کر رہی تھیں۔ عربی اور اردو دونوں زبانوں میں حضرت مولانا کو یکساں ادبی قدرت حاصل تھی اور مولانا نے اس کی تاریخ کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ اردو کے بارے میں وہ خود تحریر فرماتے ہیں :

”یہ میری بڑی خوش نصیبی تھی کہ ابتدائے عمر اور عربی تعلیم کے آغاز ہی کے زمانے میں میں نے اردو زبان و ادب کی معیاری کتابیں پڑھ لیں۔ دین کے جن داعیوں اور علماء کو آغاز عمر میں اپنے ملک کی زبان و ادب کے مطالعہ اور اس کا ذوق پیدا کرنے کا موقع نہیں ملتا یا بڑی عمر میں وہ ان کا مطالعہ کرتے ہیں، ان کو دین کی موثر دعوت دینے اور دینی حقائق کی تفہیم و تعلیم میں نیز جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں دینی مقاصد کو دل نشین کرنے میں دقت پیش آتی ہے اور ان کی انشاء و تحریر میں وہ طاقت و دلاویزی نہیں ہوتی جس کی اس عہد میں ضرورت ہے۔“ (۳)

عربی مولانا نے اہل زبان سے پڑھی ہی نہیں گھول کر پی لی تھی اور بعد میں انہوں نے اس زبان کو اپنی دعوت و پیغام کے لیے بنیادی حیثیت دی اور اہم کتابیں اسی زبان میں

(۱) کاروان زندگی جلد دوم صفحہ : ۳۲۸

(۲) ایضاً صفحہ : ۲۲۹

(۳) کاروان زندگی اول صفحہ : ۹۳-۹۴

لکھیں۔ حضرت مولانا عربی زبان و ادب سے صرف واقف ہی نہیں اس کے مرد میدان ہیں، اس کی نوک پلک درست کرنے والے، اس کو باریکیوں کے ساتھ برتنے والے بلکہ اس کو نیا رخ دینے والے ہیں، جب کہ ان کا اصل میدان دعوت و اصلاح اور تجدید ہے، اور اس میدان میں مولانا نے ادب سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

حضرت مولانا نے اس خطرہ کو پوری طرح محسوس کیا اور اس کے لیے سب سے پہلے آواز بلند کی، روایتی ادباء کی اس اجارہ داری کے خلاف تحریک چلائی اور اس کی کوشش کی کہ ادب ایک خاص طبقہ کی گھیر بندی سے آزاد ہو اور پھر وہ اپنی روح اور طاقت کے ساتھ سامنے آئے۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا نے ”الضیاء“ (۱) کے دوسرے دور کے پہلے شمارہ میں ”الادب النبوی“ کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر فرمایا جس میں اس حقیقی اور فطری ادب کی طرف توجہ دلائی جس کی طرف عام طور پر اس وقت نگاہ نہیں پہنچ رہی تھی۔

ادب پر اجارہ داری کے خلاف مولانا کی کوششیں

۱۹۳۷ء میں جب حضرت مولانا نے حجاز کا سفر کیا تو یہ محسوس کر لیا کہ وہاں کے ادبی لٹریچر پر ادبائے مصر کے خالص ادبی، تنقیدی اور تجدید و مغربیت کی دعوت دینے والے ادب کی چھاپ ہے۔ اور مصر اگرچہ کبھی فرنگیوں کا غلام نہیں رہا لیکن مصریوں کے دل و دماغ پر تہذیب فرنگ حاوی تھی اور ان کا ادب فرنگی ادب سے پوری طرح متاثر تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ تجدید پسند بلکہ الحاد پسند ادباء کی وہاں بڑی پذیرائی ہوئی۔ ڈاکٹر طہ حسین کو وزیر تعلیم بنایا گیا اور اسی فکر کے دوسرے ادباء کو بڑی اہمیت دی گئی، صورت حال کچھ ایسی بن گئی کہ یہی طبقہ اپنے تجدید فکر کے ساتھ ادب پر اس طرح حاوی ہو گیا کہ کسی دوسرے کا ان حدود میں داخلہ ممنوع کر دیا گیا۔ حضرت مولانا نے اپنی تدریس کے آغاز میں مصری ادباء کا لٹریچر اس طرح پڑھ لیا تھا کہ اس کی خوبیاں اور خامیاں پوری طرح ان کے سامنے تھیں۔ خود حضرت مولانا نے تحریر فرمایا ہے :

”اس مطالعہ اور فضا کی بدولت ہی مصر و شام کے اہل قلم و صاحب

اسلوب ادیبوں اور اپنا مستقل دبستان فکر رکھنے والا فضلاء و اہل فکر سے اتنا ہی واقف اور مانوس ہو گیا جیسے ہندوستان کے ادباء اور ناقدین و مفکرین سے واقف تھا۔ بلکہ بعض خصوصیات کی بنا پر ان غیر ملکی اہل فکر و قلم سے اس وقت زیادہ واقف تھا، ہم لوگ بے تکلف ان کے محاسن اور ان کی کمزوریوں اور ذہنی بے راہ روی پر تبصرہ کرتے تھے اور ان کے درجوں اور مراتب کا تعین کرتے تھے، وہاں میرے لیے کوئی شخصیت نئی، سحر انگیز اور مرعوب کن نہ تھی، نہ مجھے وہاں کسی نئی حقیقت کا انکشاف ہوا۔“ (۱)

حضرت مولانا نے ادب کی تاریخ پڑھی تھی، اس سے پیدا ہونے والے حالات کا جائزہ لیا تھا، وہ اس کے زیر و بم سے پوری طرح واقف تھے، انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اگر ان ترقی پسند ادباء کو بے محابا چھوڑ دیا گیا تو یہ اسلامی فکر کو بڑا نقصان پہنچا سکتے ہیں اور یہ خطرہ واقعہ بن کر سامنے آ رہا تھا۔ نئی تعلیم یافتہ نسل اسی اسلوب کی گرویدہ تھی اور اس کے ساتھ اس کی تمام خرابیاں اس کے ذہن و دماغ میں رچ بس رہی تھیں۔ اسلامی تعلیمات پر اعتماد ختم ہو رہا تھا اور فکری ارتداد بڑی تیزی کے ساتھ حقیقی ارتداد کی طرف بڑھ رہا تھا۔ حضرت مولانا نے اس مرض کی تشخیص کے بعد دو ابالٹل تجویز کی اور زبان و ادب کی اسی قوت کے ساتھ فکر اسلامی کے موضوع پر ایسا لٹریچر تیار کیا جو نوجوانوں کی پیاس بجھا سکے اور اس کے ذریعہ سے ان کی ادبی ذوق کی بھی تسکین ہو اور دینی و فکری غذا بھی ان کے لیے فراہم ہو سکے۔ دین و ادب کے جامع اس طرح کے لٹریچر سے ابھی تک عرب دنیا بڑی حد تک ناواقف تھی جس میں دل کا ساز چھیڑنے اور دماغ کو متاثر کرنے کی یکساں صلاحیت ہو۔ وہاں یا تو خالص علم کلام یا فقہ کے موضوع پر قدیم علمی زبان میں کتابیں دستیاب تھیں جن سے نئی تعلیم یافتہ نسل اکتا چکی تھی یا پھر مصر کا ادبی تنقیدی تجدید و مغربیت کی دعوت دینے والا یادل بہلانے والا لٹریچر تھا جس کی طرف نئی نسل کا رجحان تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ حضرت مولانا نے پہلی مرتبہ اسی اسلوب میں اسلامی دعوت و فکر کو پیش کیا۔

سفر حجاز سے پہلے ”إلى ممثلي البلاد الإسلامية“ کے نام سے ایک مضمون قلمبند

فرمایا جس میں دعوت کا جوش بھی ہے اور زبان کی روانی بھی۔ اس موضوع پر خالص ادبی زبان میں یہ پہلی کوشش تھی اور روایتی ادباء کی ادب پر اجارہ داری کے خلاف ایک عملی اقدام تھا، رسالہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس سے پہلی مرتبہ تعلیم یافتہ طبقہ اور نوجوانوں میں دین کا کام شروع ہوا۔

اس کے بعد عملی طور پر مسلسل یہ کوشش جاری رہی اور حضرت مولانا نے خاصی تعداد میں دعوتی لٹریچر تیار کر دیا جو اپنی زبان اور ادبی چاشنی میں کسی طرح مصری ادباء کے لٹریچر سے کم نہیں بلکہ دعوتی روح اور جوش دروں کی وجہ سے اس سے بدرجہا فائق نظر آتا ہے۔ اس چیز نے عالم عربی میں ایک حلاطم برپا کر دیا اور لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ ادب بہر حال ادب ہے خواہ اس کا مصدر کوئی بھی ہو۔ ۱۹۵۵ء میں حضرت مولانا کو دمشق یونیورسٹی نے استاذ اُمر (Visiting Professor) کی حیثیت سے دعوت دی، حضرت مولانا نے یہ دعوت قبول فرمائی اور وہاں رہ کر ”رجال الفكر والدعوة“ کے موضوع پر لکچرز دیے۔ سفر سے واپسی کے بعد دمشق کی مؤثر ترین علمی و ادبی اکیڈمی ”مجمع اللغة العربية“ کی رکنیت کے لیے حضرت مولانا کا انتخاب ہوا، اس موقع پر حضرت مولانا نے جو مضمون تحریر فرمایا اس میں پہلی مرتبہ پوری قوت کے ساتھ ادب کے سلسلہ میں وسعت نظر کی دعوت دی اور روایتی ادباء کی فہرست سے ہٹ کر اسلامی مصنفین کی کتابوں سے نکال کر وہ ادبی شہ پارے پیش کیے جو اپنی قوت و بلاغت اور تاثیر میں بدرجہا ان ادبی نمونوں سے بہتر ہیں جس کو ادبی سرمایہ قرار دیا جاتا ہے۔ جن میں کلام نبوی ﷺ کے بعد سرفہرست بعض صحابہ کرام اور قرون اولیٰ کے بعض اسلامی مصنفین کا کلام یا ان کی تحریریں ہیں۔

مضمون کے آغاز میں مولانا تحریر فرماتے ہیں :

”عربی ادب اس وقت بڑی آزمائش کے دور سے گزر رہا ہے، ہر ادب کو اس سے دوچار ہونا پڑتا ہے، یہ آزمائش کبھی مختصر ہوتی ہے اور کبھی طویل، اس پر سیاسی اور اجتماعی حالات، نئی بیداری اور اصلاح و تجدید کی تحریکوں کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ جس قوم میں ایسی تحریکیں اٹھتی رہتی ہیں اور بیداری پیدا کرتی رہتی ہیں

اس قوم کا اس آزمائش سے کم واسطہ رہتا ہے اور جہاں ایسی تحریکات کم جنم لیتی ہیں وہاں یہ آزمائش بڑی طویل ہوتی ہے۔

یہ آزمائش روایتی اور پیشہ ور ادباء کی ادب پر اجارہ داری کی شکل میں سامنے ہے جو ادب کو ایک پیشہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اس میں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کانٹ چھانٹ کرتے رہتے ہیں اور اپنا سکہ جمانے کے لیے اس کی نوک پلک درست کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ادب ان کے گھر وندوں میں مقید ہو کر رہ جاتا ہے اور پھر ایسی صورت حال بن جاتی ہے کہ اس مخصوص طبقہ کی جانب سے جو تقلیدی اور جامد ادب سامنے آتا ہے بس اسی کو ادب سمجھا جاتا ہے، اس میں نہ روح ہوتی ہے اور نہ طاقت اور نہ جدت نہ تراوٹ، وہ ایک ڈھالا ہوا اور مصنوعی کلام ہوتا ہے جس میں نہ کوئی تازگی ہے نہ مزہ۔ اس پیشہ ورانہ ادب نے ایسی گھیرا بندی کر رکھی ہے کہ دوسرے طبقہ کی جانب سے کبھی ہی طاقتور نشریا شعر سامنے آئے اگر اس پر ادب کا سائن بورڈ نہیں لگا ہے تو اس کو ادب میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔

فطری طاقتور اور خوبصورت ادب کی بے شمار مثالیں عربی کتب خانوں میں موجود ہیں اور اس کا وجود پیشہ ورانہ اور روایتی ادب سے بہت پہلے ہو چکا ہے۔ حدیث و سیرت کی کتابوں میں فطری ادب کے بہترین نمونے موجود ہیں، اور رسائل و مقامات کے غیر فطری ادب سے بہت پہلے ان کی تدوین ہو چکی ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ روایتی ادباء اور اس فن میں غور و فکر کرنے والوں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، حالانکہ یہی وہ ادب ہے جس سے عربی زبان کی شان ظاہر ہوتی ہے، اسرار و رموز سامنے آتے ہیں اور اہل زبان کی مہارت کا پتہ چلتا ہے، ادب کا یہی سب سے پہلا اور اصل مدرسہ فکر ہے۔“ (۱)

ادب کے دائرہ کو وسیع کرنے کی یہ پہلی آواز تھی جو بلند کی گئی پھر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔

ادبیات اسلامی کے موضوع پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے منعقد کردہ سیمینار میں معروف اسلامی ادیب ڈاکٹر عبدالرحمن رافت الباشا نے اپنے خطبہ میں اس کا اعتراف کیا ہے، وہ کہتے ہیں :

”ہمیں یہ دعویٰ نہیں کہ ہم نے سب سے پہلے اسلامی ادب کی دعوت دی بلکہ ہم نے دراصل چند مسلم مشاہیر و ادباء کی تقلید کی ہے۔ اس موضوع پر سب سے پہلے لکھنے والے عالم باعمل مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہیں جب انہوں نے (دمشق اکیڈمی) کا ممبر منتخب ہونے کے وقت ادب میں اسلام کے تصور کی طرف توجہ دلائی تھی، اس طرح وہ اس ادب کے پہلے داعی اور اس طرف متوجہ کرنے والوں کے سرخیل ہیں۔“ (۱)

حضرت مولانا نے صرف دعوت فکر ہی نہیں دی بلکہ عملی طور پر پہلی صدی سے لے کر موجودہ دور تک کے مختلف اسلامی مصنفین کی کتابوں سے تلاش کر کے ادب عالی کے نمونے پیش کیے۔ ”مختارات من ادب العرب“ کے نام سے یہ کتاب دو حصوں میں شائع ہوئی۔ جس کو علم و ادب کے حلقوں میں بہت سراہا گیا اور مختلف یونیورسٹیوں کے شعبہ ادب عربی میں اس کو داخل نصاب کیا گیا۔

نامور ادیب شیخ علی ططاویؒ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”اگر کسی ادیب کے ذوق کی دلیل اس کا انتخاب ہے تو قارئین کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم نے کچھ عرصہ ہوا ادبی انتخابات اور نمونوں کے مجموعوں کو جمع کیا تاکہ ان میں سے کسی کو ثانویات شرعیہ کے طلباء کے سامنے رکھیں۔ ہماری کمیٹی کے ممبران نے (جو سب کے سب ادباء تھے) علاحدہ علاحدہ تلاش و جستجو شروع کی اور اس موضوع کی کتابوں کا جائزہ لیا، اخیر میں ہم سب متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ درسی انتخابات کے مجموعوں میں سب سے بہتر ابوالحسن علی ندوی کا مرتب کردہ مجموعہ مختارات ہے جو زبان کی اصناف اور ادب کے متنوع نمونوں کا سب

سے جامع مجموعہ ہے۔“ (۱)

مشہور ادیب و شاعر شیخ عبدالعزیز رفاعی لکھتے ہیں :

”میں کعب بن مالکؓ کا ذکر بار بار پڑھ چکا تھا، ان کی عظمت کا قائل اور ان کے صدق و صراحت کو ایک تاریخی مثال سمجھتا ہوں مگر یہ کہ وہ ادیب تھے یا ان کی نثر ایک ادبی مقام رکھتی ہے اس کا مجھے کبھی خیال بھی نہیں تھا، مگر سامعہ الشیخ ابوالحسن علی ندوی نے ان کی طویل کہانی خود ان کی زبانی حدیث سے نقل کر کے میری آنکھیں کھول دیں اور پہلی بار پتہ چلا کہ کعب بن مالکؓ کی کہانی ایک عظیم ادبی ورثہ ہے۔“ (۲)

حضرت مولانا کی یہ فکر اگرچہ چل پڑی تھی اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہو رہے تھے مگر اس کو تحریک کی شکل دینے کے لیے حضرت نے یہ ضرورت محسوس کی ایک ایسا عالمی سیمینار ہونا چاہیے جس میں بلاد عربیہ اور وہاں کی جامعات کے اساتذہ ادب و نقد کو شرکت کی دعوت دی جائے اور علمی مقالات اور تبادلہ خیال کے ذریعہ آئندہ کے لیے کام کا منصوبہ اور نقشہ بنایا جائے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اجلاس کی دعوت دی اور اس کا عنوان ”ادبیات میں اسلامی تصور“ متعین کیا گیا۔ یہ اجلاس بڑی کامیابی کے ساتھ تکمیل کو پہنچا اور اس میں مختلف ملکوں کے تین درجن سے زائد عرب ادباء و فضلاء، شعراء اور فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں حضرت مولانا نے بڑا پر مغز خطبہ صدارت پیش فرمایا جس میں ہندوستانی علماء و فضلاء کی ادب شناسی ہی نہیں بلکہ ادب کی قافلہ سالاری کو تاریخی حوالوں سے ثابت فرمایا۔ اس تاریخی خطبہ کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے :

”وہ ادب جس کو تقلید اور روایت سے سب سے زیادہ انکار اور لکیر کا فقیر بننے سے سب سے زیادہ عار ہونا چاہیے تھا اور جس کے خمیر و سرشت میں جدت و جرأت، ذہانت، ذوق و جمال اور ادب کی زبان میں ”حسن پرستی“ داخل ہے، اور جس کو بلبل کی طرح ہر گل پر شیدا اور مظہر جمال و کمال کا شیفہ و فریفتہ ہونا

(۱) کاروان زندگی اول، صفحہ ۲۱۱، ۲۱۲

(۲) مولانا ابوالحسن علی ندوی - انکار و آثار (جامعہ یدایہ جے پور) صفحہ ۴۰۹

چاہیے، اکثر موقعوں پر روایت پرستی اور تعصب کا شکار رسم و رواج میں گرفتار نظر آتا ہے، ادب و انشاء کی جو تعریف استادِ اوّل نے کردی اور اس کے جو حدود، خطوط کھینچ دیئے، بہت کم ادیبوں اور نقادوں کو ان سے سرتابی کرنے اور اس کے دائرہ سے باہر قدم رکھنے کی جرأت ہوتی ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ ہر بعد میں آنے والا اپنے پیش رو کے قدم پر قدم رکھتا ہوا اپنا سفر طے کرتا ہے، اور ادبی نمونوں کے ذخیروں میں کسی اضافہ، کسی تغیر اور کسی ترمیم کی جرأت نہیں کرتا، ادب و انشاء کی چند مثالی شخصیتیں منتخب کر لی جاتی ہیں، اور ہر آنے والا اسی سبق کو دہراتا ہے، اقبال کا یہ مصرعہ اس دبستانِ ادب پر پوری طرح صادق آتا ہے

ع کند مکتب رہ طے کردہ راطے

ندوہ نے پہلی مرتبہ عربی ادب کے خزانوں کو از سر نو کھنگالنے اور اس کا علمی جائزہ لینے کی دعوت دی اور مشورہ دیا کہ اس کے اور عربی ادب و انشاء کے دلفینہ سے وہ موتی نکالے جائیں جو دین و ادب کے ایوانوں کو سجانے اور ان میں نئے چراغ جلانے کا ذریعہ بنیں۔ اس کے فضلاء اور کارکنوں نے ادب کے شہ پارے ان جگہوں سے نکالے جہاں عام طور پر ادب و انشاء کی تلاش نہیں کی جاتی اور اسی کو بنیاد بنا کر ایسا نصاب تعلیم تجویز کیا جس نے دین و ادب کو شیر و شکر کر دیا۔ اس نصاب نے عربی زبان و ادب کی قوت اور ہمہ گیری پر یقین میں اضافہ کیا اور طالب علم کے اندر چھپی ادبی صلاحیت کو ابھارنے اور ذوق کو جلا دینے کی صلاحیت پیدا کی اور یہ بتایا کہ عربی ادب میں یہ قوت ہے کہ وہ زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات میں ضروریات کا ساتھ دے سکتا ہے۔“ (۱)

اردو شعبہ کا اجلاس سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کی صدارت میں ہوا۔ اس میں حضرت مولانا نے اپنی اختتامی تقریر میں بڑے جوش کے ساتھ فرمایا :

”ادب ادب ہے خواہ وہ کسی مذہبی انسان کی زبان سے نکلے، کسی پیغمبر کی زبان سے ادا ہو، کسی آسمانی صحیفہ میں ہو، اس کی شرط یہ ہے کہ بات اس انداز

سے کہی جائے کہ دل پر اثر ہو، کہنے والا مطمئن ہو کہ میں نے بات اچھی طرح کہہ دی، سننے والا اس سے لطف اٹھائے اور اس کو قبول کرے۔ میں نے کل عربی سیمینار میں کہا تھا کہ حسن پسندی تو یہ ہے کہ حسن جس شکل میں ہو اسے پسند کیا جائے، بلبل کو آپ پابند نہیں کر سکتے کہ اس پھول پر بیٹھے، اس پھول پر نہ بیٹھے، لیکن یہ کہاں کا حسن مذاق ہے اور یہ کہاں کی حق پسندی ہے کہ اگر گلاب کا پھول کسی مے خانے کے صحن میں اس کے زیر سایہ کھلے تو وہ گلاب ہے اور اس سے لطف اٹھایا جائے اور اگر کسی مسجد کے چمن میں کھل جائے تو پھر اس میں کوئی حسن نہیں، کیا یہ جرم ہے کہ اس نے اپنے نمود اور اپنی جلوہ نمائی کے لیے مسجد کا سہارا لیا۔ اقبال کا شعر تو ان کے سامنے نہیں پڑھ سکا تھا مگر آپ کے سامنے پڑھ سکتا ہوں۔

حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟“ (۱)

”رابطہ ادب اسلامی عالمی“ کی تشکیل

ادبیات اسلامی کے اسی سیمینار میں یہ تجویز بھی پاس کی گئی کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی میں ادبیات اسلامی ہی کے نام سے ایک تنظیم بنادی جائے جو سیمینار کی منظور شدہ تجاویز کے مطابق کام کرنی رہے۔ تجویز کے مطابق دارالعلوم میں اس کا سکریٹریٹ قائم کر دیا گیا۔ حضرت مولانا اس کے سرپرست اور مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب اس کے ناظم قرار پائے اور کام شروع ہو گیا۔

جو عرب ادباء سیمینار میں شریک ہوئے تھے ان کے دماغوں میں اس تحریک کا بیج پڑ گیا تھا، تین ہی سال کا عرصہ گزرا کہ انہوں نے عالمی سطح پر اس تحریک کو فروغ دینے کا ارادہ کیا اور ”رابطۃ الادب الاسلامی العالمیہ“ کے نام سے اس کی تشکیل کرنی چاہی۔ چونکہ یہ تحریک اسلامی تھی، ادبی تھی اور عالمی تھی اس لیے اس کی صدارت کے لیے وہی شخصیت

موزوں ہو سکتی تھی جس کے اندر یہ تینوں صفیں پوری توازن کے ساتھ جلوہ گر ہوں، حضرت مولانا کی شخصیت پر اس کا پورا انطباق ہوتا تھا، وہ اسلام کے ترجمان، ادب کو نیا رخ دینے والے اور دنیا کی ایک جانی پہچانی شخصیت تھے۔ مولانا ہی کے نام پر سب کا اتفاق ہوا۔ اور ۱۷ مئی ۱۹۸۴ء کے حضرت مولانا کے سفر حجاز کے موقع پر یہ حضرات مولانا کی قیام گاہ پر تشریف لائے اور اپنی خواہش کا اظہار کیا اور مولانا سے اس کی صدارت قبول کرنے پر اصرار کیا، ”رابطۃ الادب الاسلامی“ کے نام سے یہ تنظیم باقاعدہ وجود میں آگئی۔ مولانا محمد رابع حسنی کو اس کا جنرل سکرٹری، ڈاکٹر عبدالقدوس ابوصالح کو سکرٹری نامزد کیا گیا اور یہ طے ہو گیا کہ اس کا مرکزی دفتر دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی ہوگا۔

رابطہ ادب اسلامی کی اس بنیادی تشکیل کے بعد اس کا سب سے پہلا عالمی اجلاس ۹ جنوری ۱۹۸۶ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں رابطہ کے دستور اساسی کو آخری شکل دی گئی۔ تنظیمی انتخابات ہوئے اور حضرت مولانا کو تاحیات اس کا صدر منتخب کیا گیا۔

رابطہ کے باقاعدہ قیام کے بعد مختلف ملکوں میں اس کی پذیرائی ہوئی، جگہ جگہ اس کے دفاتر قائم ہوئے اور متعدد اسلامی ملکوں میں اس کا کام شروع ہو گیا۔ اس طرح حضرت مولانا کی فکر کو ایک تحریک کی شکل حاصل ہو گئی اور اس کے بہترین نتائج سامنے آنے لگے۔

تجدیدی کام

حضرت مولانا کی اس فکر و سعی سے عربی ادب کو آزادی ملی، پیشہ و ادباء و شعراء کی اس پر اجارہ داری بڑی حد تک ختم ہوئی اور الحاد و لادینیت کی اس پر جو چھاپ پڑ رہی تھی اس پر روک لگی۔ اس کام میں حضرت مولانا کے شریک اور ادباء و علماء بھی ہیں لیکن اس کی فکر پیش کرنے کی اولیت مولانا ہی کو حاصل ہے، اسی فکر کے نتیجے میں بہت سے ترقی پسند ادباء کی سوچ میں تبدیلی پیدا ہوئی اور ان کے ذہنوں کی اسلامی تشکیل ہوئی اور خاص طور پر نوجوانوں اور نئی تعلیم یافتہ نسل میں جو الحاد و لادینیت کا شکار ہو رہی تھی بہتر تبدیلی پیدا ہوئی۔

حضرت مولانا کی اس محنت اور فکر کا باقاعدہ آغاز ۱۹۵۰ء سے ہوتا ہے جب سفر حجاز کے

موقع پر شیخ احمد عبدالغفور عطاء کی دعوت پر بستان بخاری میں ادباء اور صحافیوں کی ایک مجلس منعقد ہوئی جن میں شیخ سعید المعامودی، شیخ عبدالقدوس انصاری، سید علی حسن فدعق، سید محسن باروم اور شیخ حسین عرب خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اسی مجلس میں حضرت مولانا نے ادب کے صحیح استعمال کی طرف توجہ دلائی تھی۔ یہ لوگ مولانا کی فکر و ادب کی بلندی سے متاثر ہوئے اور یہیں سے ان کے دلوں میں دین اور اہل دین کی عظمت کا نقش قائم ہو گیا۔ اس سے پہلے ان کو کسی عالم دین سے اس طرح کی گفتگو کا سابقہ نہیں پڑا تھا، یہ ان کا پہلا تجربہ تھا، اس کے بعد وہ حضرت مولانا کو لے کے شیخ صالح قزاز کے پاس گئے اور ریڈیو پر مولانا کی تقریروں کی خواہش ظاہر کی۔ اس سے پہلے مولانا کے شیخ صالح قزاز سے کوئی مراسم نہ تھے لیکن ان ادباء و فضلاء کی خواہش کے احترام میں انہوں نے اس کو منظور کیا اور حضرت مولانا کی تقریریں ریڈیو پر نشر ہوئیں۔

”اس واقعہ کے بعد ہی حضرت مولانا اپنے ایک مکتوب میں جو ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے نام لکھا گیا ہے ان ادباء سے توقعات ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”اگر یہ ادباء اور ان کی طاقتیں صحیح رخ پر پڑ گئیں اور انہوں نے ادب سے نوجوانوں میں دینی روح پیدا کرنے اور دین کا پیغام پہنچانے کا کام لینا شروع کر دیا۔ مصری ادبیات کی تقلید ترک کر کے صحیح معنی میں ”حجازی ادب“ کی بنیاد رکھی تو نوجوانوں میں انشاء اللہ بڑے اچھے انقلاب کی توقع ہے اور اس کی وجہ ہے اس طبقہ کے تاثر کی اصلاح جو پوری زندگی پر حاوی ہے۔ آپ دعا فرمائیں یہ ایک بڑی اچھی علامت ظاہر ہوتی ہے۔“ (۱)

اسی مکتوب میں آگے حضرت مولانا کے قلم سے برجستہ چند جملے اور نکل گئے ہیں جو مولانا کی تواضع اور انکار ذات کا مظہر ہیں تحریر فرماتے ہیں :

”جو کچھ ہوا اس کی اپنے میں ہرگز اہلیت نہ تھی، کجا ایک ہندی نژاد عجی کجا چیدہ ادبائے حجاز اور کہنہ مشق انشاء پر داز!! مگر اللہ تعالیٰ جب کسی کام کا ارادہ فرماتا

ہے تو جمادات تک سے کام لے لیتا ہے۔“ (۱)
 بستان بخاری کی تقریب میں شریک ادباء میں سے ایک بڑے فاضل ادیب و صحافی
 استاذ عبدالقدوس انصاری نے کچھ ہی عرصہ بعد حضرت مولانا کو ایک خط میں لکھا :
 ”آپ نے خاص طور پر ان بلاد مقدسہ میں ادب کو صحیح اور صالح رخ
 دینے اور غلط رجحانات سے اس کو بچانے کی جو تحریک فرمائی تھی ہم اس میں
 مشغول ہیں اور اس سلسلہ میں آپ سے دعا کی امید کرتے ہیں۔“ (۲)

حضرت مولانا کے دعوتی و فکری رسائل و کتب نے جو بہترین ادبی زبان و اسلوب کے
 قالب میں ڈھلے ہوئے ہوتے تھے عالم عربی پر گہرا اثر ڈالا، پھر ”رابطہ ادب اسلامی“ کی
 تحریک نے اس کو منظم شکل میں اس طرح پیش کیا کہ مختلف عرب ممالک کے ادباء کی بڑی
 تعداد میں اسلامیت پیدا ہوئی، اور ادب پر الحاد پسندوں کی لگام ڈھیلی پڑی، اور ادب کے
 راستہ سے جس طرح نوجوانوں اور جدید تعلیم یافتہ نسل میں دین سے دوری بڑھتی جا رہی تھی
 اس پر روک لگی اور صحیح اور صالح ادب کے ذریعہ ان کے اندر بہتر تبدیلی کے آثار شروع ہوئے۔
 اسی سلسلہ میں حضرت مولانا کے دو بڑے اہم اور تجدیدی کام ہیں: ایک تو یہ کہ انہوں
 نے خالص ادبی ذوق رکھنے والے ادباء کے اندر جن کو دین سے دور کا واسطہ نہیں تھا دینی فکر
 پیدا کی، دین کو ایسے ادبی قالب میں ڈھال کر پیش کیا کہ اس کو دیکھ کر کوئی بھی ادبی ذوق رکھنے
 والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور واقعہ یہ ہے کہ ادب صرف الفاظ کے الٹ پھیر کا نام نہیں
 ہے جب تک اس میں اندر کا جوش شامل نہ ہو۔ حضرت مولانا کی ادبی تحریریں خون جگر سے
 لکھی گئی ہیں، اس لیے ان میں وہ زور پیدا ہو گیا ہے جس سے خالص ادباء کی تحریریں عمومی
 طور پر خالی ہیں۔

عام طور پر تعلیم یافتہ طبقہ پر ادب کی حکمرانی ہوتی ہے اور اس راستہ سے جو چیز بھی پیش
 کی جائے وہ اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہتی اور تعلیم یافتہ طبقہ ہی کے ہاتھ میں زمام قیادت ہوتی
 ہے، وہ جس فکر کو قبول کر لیں پورا معاشرہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ ادباء اور شعراء کے ذہنوں

(۱) مکتوبات حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جلد اول صفحہ ۵۹

(۲) رسائل الاعلام صفحہ ۱۳۹

کی تبدیلی اور اسلام پسندی کا مختلف ملکوں پر اثر پڑا اور عمومی طور پر وہاں دینی رجحان پیدا ہوا۔ حضرت مولانا کا دوسرا اہم کام یہ ہے کہ انہوں نے خالص دینی ذوق رکھنے والوں کے اندر ادبی ذوق پیدا کیا تا کہ وہ اس راستہ سے فائدہ اٹھائیں اور اس کو اپنی دعوت کو موثر بنانے کے لیے استعمال کریں۔ ہندوستان میں عربی زبان صرف اس لیے پڑھی جاتی تھی کہ اس کے ذریعہ سے قدیم دینی کتابیں سمجھی جاسکیں۔ حضرت مولانا نے اہل مدارس کو متوجہ کیا کہ وہ زبان کو زبان کی طرح پڑھائیں، خاص طور پر ندوۃ العلماء میں اس کا ذوق پیدا کیا، طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے بارہا فرمایا کہ عربی زبان میں ایسی قادر الکلامی اور اسلوب و بیان کی ضرورت ہے کہ عربوں کو براہ راست دین کی صحیح دعوت دی جاسکے اور اس کی صحیح ترجمانی ممکن ہو سکے۔ حضرت مولانا کی اس فکر نے یہاں کے مدارس پر گہرا اثر ڈالا اور آج الحمد للہ اکثر مدارس میں عربی کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے پڑھا جا رہا ہے۔

معاصر عرب ادباء کا اعتراف و تحسین

حضرت مولانا کی ان ادبی کتابوں میں جنہوں نے ذہنوں کو تبدیل کیا، الطريق الی المدینۃ، روائع اقبال اور اذا هبت ریح الایمان کے علاوہ، الی الاسلام من جدید، نظرات فی الادب، روائع من ادب الدعوة اور وہ ادبی و دعوتی رسائل ہیں جنہوں نے نوجوان نسل کو متاثر کیا، عالم عربی کے معاصر ادباء اور اہل قلم نے حضرت مولانا کے طرز نگارش کو تسلیم کیا۔ مشہور ادیب اور اہل قلم شیخ علی طنطاویؒ نے جب الطريق الی المدینہ (کاروان مدینہ) کا مطالعہ کیا تو اپنے ایک مکتوب میں ان الفاظ کے ساتھ اپنے تاثر کا اظہار کیا :

”میر اپنے بارے میں اعتماد متزلزل ہو گیا تھا برادر ام ابوالحسن! جب میں نے آپ کی کتاب الطريق الی المدینہ پڑھی تو مجھے محسوس ہوا کہ شوق پھر میرے اندر انگڑائی لینے لگا ہے اور میرے سینے میں پھر وہی تپش ہے۔ اس طرح پھر مجھے اطمینان ہوا کہ میرا دل جو ہر محبت سے بالکل خالی نہیں ہوا ہے لیکن افکار زمانہ اور وقت نے اس کو گرد آلود کر دیا تھا، ان کی کتاب نے اس گرد کو ایک بار

پھر صاف کر دیا۔

ادب کی طرف سے بھی میرا اعتماد اٹھنے لگا تھا چونکہ ادیبوں میں وہ آسانی نغمہ نظر نہیں آیا جس کی لئے میں شریف رضی کے وقت سے لے کر عبدالرحیم برعی تک شعراء گاتے رہے، جب میں نے ان کی کتاب پڑھی تو میرا کھویا ہوا نغمہ پھر مجھے مل گیا، یہ نغمہ مجھے ان کی اس نثر میں ملا جو حقیقتاً شاعری ہے لیکن بے ردیف و قافیہ کی شاعری۔ برادر ام ابو الحسن! آپ کا صد ہزار شکریہ کہ آپ نے دوبارہ

میرے اندر اپنی ذات اور اپنے ادب پر اعتماد بحال کر دیا۔“ (۱)

معروف ادیب و مفکر شیخ محمد الحجدوب لکھتے ہیں :

”علامہ ندوی کی تحریر کو پڑھنے والا محسوس کرے گا کہ ان کی عبارت میں غیر معمولی اثر ہے جو کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں کو پڑھنے والا مسحور سا ہو جاتا ہے۔ وہ ان خاص اہل دل افراد میں سرفہرست ہیں جو اپنے جذبات کی شدت و وفور اور جولانی و روانی کو قسطاں تک منتقل کر دیتے ہیں۔ یہ وہ جو ہر ہے جو خاص روحانی ذوق رکھنے والے ادباء کے یہاں ملتا ہے۔“ (۲)

شیخ علی طنطاوی فرماتے ہیں :

تمام داعیان دین کے اسالیب میں ان کے اسلوب سے بہتر کوئی اسلوب میرے علم

میں نہیں ہے۔“ (۳)

ڈاکٹر منجد مصطفیٰ بہجت اپنے مضمون میں لکھتے ہیں :

”علامہ نے ایسے عمومی قواعد و ضوابط وضع کیے ہیں جن سے ادب کے اثر اور دائرہ کار پر اچھی روشنی پڑتی ہے، اکثر مصنفین اور ناقدین نے اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ ادبی نظریات سب کے سب مغرب کی دین ہیں لیکن علامہ ندوی کے ادبی نظریات کی بنا پر ہم اس پر فخر کر سکتے ہیں کہ انہوں نے ادب

(۱) مقدمہ کاروان مدینہ صفحہ ۱۱۱

(۲) فکر اسلامی نمبر (جامعہ اسلامیہ ہستی) صفحہ : ۲۶۸

(۳) ایضاً صفحہ : ۲۶۸

اسلامی کی قائدانہ صلاحیت و اہمیت کو ادب و نقد دونوں میدانوں میں پیش کیا ہے اور عربی زبان کی شان کو دوبالا کیا ہے اور ایسے وقت میں کیا جب ہمارے درمیان عربی زبان کی شان کو اسلامی وقار کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت تھی۔“ (۱)

ادیب و شاعر ڈاکٹر عبدالباstr رقم طراز ہیں :

”آپ کی بلند نگاہی اور مسائل و مشکلات سے واقفیت نے ہمیں ششدر کر دیا، اس وقت آپ کی گفتگو کا موضوع مغربیت زدہ عربی ادب تھا جس نے ایک طویل مدت سے مشرق کے دیار میں اپنا پنچہ جما رکھا ہے۔ اس دن مجھے اور سامعین کو معلوم ہوا کہ یہ وہ ادیب ہے جو اپنی تصنیف و تالیف اور بات چیت میں اسلامی ادب کا خاص رنگ بھر دیتا ہے اور یہاں بیٹھ کر عربی زبان کے دور دراز نخلستانوں کے عربی سرمایہ کی حفاظت کر رہا ہے۔“ (۲)

اردو زبان و ادب کے میدان میں

سطور بالا میں حضرت مولانا ہی کا یہ اقتباس گزر چکا ہے کہ ”میری خوش نصیبی تھی کہ میں نے عربی تعلیم کے آغاز ہی میں اردو زبان و ادب کی معیاری کتابیں پڑھ لیں تھیں۔“ بعد کے وسیع مطالعہ اور اہل زبان کی صحبتوں نے اس ذوق میں نکھار پیدا کر دیا۔ حضرت مولانا نے اپنی دعوت کا اصل محور عربوں کو بنایا تھا اور عربی میں وہ کمال پیدا کیا تھا کہ اہل زبان بھی رشک کرتے۔ یہاں یہ لطیفہ بھی شاید فائدہ سے خالی نہ ہو کہ ایک مرتبہ مولانا عبد الباری ندویؒ (سابق صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد) نے فرمایا کہ ”علی میاں! کیا آپ کو ہندوستان میں رہ کر چین کے حملے کو روکنا ہے؟ آپ کو تو عالم عربی میں ہونا چاہیے۔“ ان کا اشارہ حضرت مولانا کی کوششوں اور ان کے بہتر نتائج کی طرف تھا جو حضرت مولانا عالم عربی میں فرما رہے تھے، لیکن اردو مولانا کے گھر ہی کی زبان تھی اور اس کا ذوق مولانا کو ورثہ میں ملا تھا اور پھر اپنے مطالعہ و محنت سے اس میں حضرت مولانا نے کمال پیدا کیا۔ محمد حسین آزاد کی

کتاب ”آب حیات“ بار بار پڑھی ”گل رعنا“ گھر کی کتاب تھی حضرت مولانا نے نہ معلوم اس کو کتنی بار پڑھا اور موازنہ و تنقید کا فن سیکھا۔

معروف ادیب، مؤرخ اور نقاد خورشید رضوی صاحب اپنے مضمون میں لکھتے ہیں :
 ”اردو ادب اور اس کی تاریخ پر مولانا علی میاں کی دقیق نگاہ کا اندازہ کرنا ہو وہ بیس بائیس صفحہ دیکھ لینا کافی ہوگا جو انہوں نے اپنے والد ماجد کی تصنیف ”گل رعنا“ پر بات کرتے ہوئے اور مولانا محمد حسین آزاد کی ”آب حیات“ سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے حیات عبدالحی میں شامل کیے ہیں، یہ تجزیہ دیکھ کر ذرا دیر کو یہی خیال ہونے لگتا ہے کہ مولانا کی عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزری ہے اور وہ اسی کوچے کے آدمی ہیں، ساتھ ہی امام شافعی کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

ولولا الشعر بالعلماء یزری

لکنت الیوم أشعر من لبید

(اگر یہ بات نہ ہوتی کہ شاعری اہل علم کے شایان شان نہیں ہے تو آج میں لبید سے بھی بڑا شاعر ہوتا۔)“ (۱)

اردو زبان و ادب سے بھی حضرت مولانا نے اپنے دعوتی سفر میں بھی فائدہ اٹھایا تاہم عربی زبان و ادب کے برخلاف اردو کی خصوصیت یہ تھی کہ روز اول سے اس کی قافلہ سالاری علماء کے ہاتھوں میں رہی، اس کے نتیجہ میں بڑی الحاد و لا دینیت کے اس عنصر سے پاک رہی جس سے عربی ادب محفوظ نہ رہ سکا۔ حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں :

”علمائے ہند کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے برصغیر ہند

کی زبان و ادب و ترقی میں قائدانہ حصہ لیا اور ۱۸۵۷ء کے بعد اس تحریک کی سربراہی اور رہنمائی کی، اردو کا قصر ادب جن مضبوط اور بلند ستونوں پر قائم ہے ان میں بیشتر طبقہ علماء سے تعلق رکھتے ہیں، انہوں نے اردو کو نیا رنگ و آہنگ، نیا اسلوب اور وہ سنجیدگی اور پختگی عطا کی جو اس وقت تک اردو کا سرمایہ فخر

ہے۔“ (۱)

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی حیات و افکار کے چند پہلو، صفحہ ۲۱۵

اردو میں بھی حضرت مولانا نے ادب کی سرحدوں کو وسیع کیا ہے۔ اور اس کی دعوت دی ہے کہ ادب کو صرف روایتی ادباء ہی کی تحریروں میں تلاش نہ کیا جائے بلکہ زبان دل سے گفتگو کرنے والوں اور خون جگر سے لکھنے والوں نے ادب کے سرمائے میں جو اضافہ کیا ہے وہ ادب عالی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کو وہاں بھی تلاش کرنا چاہئے۔

”تاریخ دعوت و عزیمت“ کے حصہ سوم میں شیخ شرف الدین تہجدی منیریؒ کے ملفوظات کا انتخاب کرتے وقت حضرت مولانا نے اس کی تمہید کے طور پر جو مضمون تحریر فرمایا ہے وہ بجائے خود ادب کا بہترین شاہکار ہے، اور اس میں کھل کر ادب کی سرحدوں کو وسیع کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں :

”دنیا کی اکثر زبانوں اور علم و ادب کے بارہ میں یہ زیادتی کی گئی ہے کہ صرف ان شخصیتوں کو ادیب، صاحب اسلوب اور انشاء پرداز تسلیم کیا گیا ہے اور انہیں کی تحریر اور نتائج فکر کو ادب کے نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جنہوں نے ادب و انشاء کو ایک پیشہ یا ذریعہ اظہارِ کمال کے طور پر انتخاب کیا، جو قدیم زمانے میں سرکاری دربار سے متعلق تھے، اور کوئی تحریری خدمت ان کے سپرد تھی، یا جنہوں نے انشاء میں صناعی اور تکلف سے کام لیا، اس کا نتیجہ ہے کہ عربی ادب کی تاریخ میں انشاء پرداز صاحب اسلوب کی حیثیت سے ہمیشہ عبدالحمید الکاتب، ابو اسحق الصابی، ابن العمید، صاحب ابن عباد، ابو بکر خوارزمی، ابو القاسم حریری اور قاضی فاضل کا نام لیا جاتا ہے، حالانکہ ان تحریروں میں امام غزالی، ابن جوزی، ابن شداد، شیخ محی الدین بن عربی، ابو حیان توحیدی، ابن قیم، ابن خلدون کہیں بڑھ کر انشاء پرداز کہلانے کے مستحق ہیں، اور ان کی تصنیفات میں صحیح اور طاقتور انشاء، خیالات و جذبات کے اظہار اور انسانی تاثرات و احساسات کی تصویر کے نہایت دلکش اور دل آویز نمونے ہیں لیکن ان بے گناہوں کا گناہ یہ ہے کہ انہوں نے کبھی ادب و انشاء کو اپنا مستقل پیشہ یا اظہارِ کمال کا ذریعہ نہیں بنایا اور ان کی اکثر تحریروں کا موضوع دینی یا علمی ہے۔“

ہندوستان کے فارسی ادب کی تاریخ کا جائزہ لیجئے تو یہاں کے ادب و انشاء پر ظہوری، ابوالفضل اور نعمت خان عالی چھائے ہوئے نظر آتے ہیں حالانکہ اگر انشاء کے لیے جذبات و حقائق کے مؤثر اظہار کو معیار قرار دیا جائے تو ان کی تحریروں کا بڑا حصہ جن میں لفاظی، صنائع و بدائع اور لفظی رعایتوں کا زور ہے، اپنی قیمت کھودیتا ہے اور بہت تھوڑا حصہ ادب و انشاء کے فطری معیار پر پورا اترتا ہے، ان کے مقابلہ میں ایسی بہت سی تصنیفات لائق اعتناء ٹھہرتی ہیں جن کو عام طور پر مؤرخین ادب اور خوشگوار تقلید ناقدین نے ہمیشہ نظر انداز کیا۔ حضرت شیخ شرف الدین تکی منیریؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ، شیخ احمد فاروقیؒ کے مکتوبات کا بڑا حصہ عالمگیر کے ”رقعات“ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی ”ازالۃ الخفاء“ اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی ”تحفۃ اثنا عشریہ“ کے بہت سے ٹکڑے فارسی ادب و انشاء کا کامیاب نمونہ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر زبان میں ادب کا جو دائرہ کسی پیش رو نے کھینچ دیا، اس کے حدود و اربعہ سے باہر نکلنے، دوسرے علوم و فنون کے ذخیرے کو کھنگالنے اور نئے ادبی شاہکاروں کو دریافت کرنے کی دوسری عام طور پر گوارا نہیں کی گئی اور اس طرح صدیوں تک ان ادبی جواہرات پر خاک پڑی رہی۔

ادب و انشاء کے سلسلہ میں عام مؤرخ و نقاد اکثر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ تحریر کی قوت کلام کی تاثیر اور قبول عام و بقائے دوام کے لیے سب سے زیادہ معاون عنصر لکھنے والے کی اندرونی کیفیات، اس کا یقین، دلی جذبہ، کسی حقیقت کے اظہار کے لیے اس کی بے چینی اور بے قراری ہے، ایسے کسی شخص کو جو اس اندرونی کیفیت سے سرشار اور اس کو دوسروں میں پیدا کرنے کے لیے مضطرب و بیقرار ہو، جب قدرت کی طرف سے ذوق سلیم بھی عطا ہو، الفاظ و اسالیب بیان پر ضروری حد تک قدرت بھی حاصل ہو اور اس کی تحریر میں علم و ادب، عقل و استدلال اور حسن بیان کے ساتھ سوز و دروں اور خونِ جگر بھی شامل ہو تو اس کی تحریر میں ایسا اثر اور ایسا زور پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانے

میں ہزاروں دلوں کو جی کرتی ہے اور سیکڑوں برس گزر جانے کے بعد بھی اس کی تازگی و زندگی اور اس کی تاثیر و قوتِ تسخیر قائم رہتی ہے۔“ (۱)

حضرت مولانا اس قافلہ میں اپنی ایک شان رکھتے ہیں اور صاحب طرز ادیب و انشاء پرداز ہیں، مولانا کی تصنیفات اور رسائل و خطبات میں ان کا یہ ادبی ذوق جلوہ گر ہے، اندر کے جوش، روحانی قوت و تاثیر اور مقصدیت نے اس میں اور رعنائی پیدا کر دی ہے۔ مولانا بامقصد ادب کے داعی ہیں، کسی نے تفریحی ادب کے بارے میں سوال کیا تو تحریر فرمایا کہ :

”محض تفریحی ادب کے مطالعہ سے ذہن میں سطحیت علم اور فکر میں بے مغزی اور معلومات میں تہی مانگی پیدا ہو جاتی ہے اور ایسا آدمی کوئی وقیع اور موثر کام نہیں کر سکتا، تفریحی ادب کا وہی حصہ ہونا چاہیے جو نمکیات اور فواکہ کا ہوتا ہے۔“ (۲)

معاصر ادباء و مصنفین کا خراج تحسین

حضرت مولانا کے ادبی امتیاز و تفوق اور خصوصیت کا اعتراف معاصر ادباء و مصنفین نے کیا ہے۔

حضرت مولانا کی مشہور اور اولین تصنیف ”انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر“ مشہور ادیب و ناقد پروفیسر رشید احمد صدیقی کے پاس پہنچی تو ان الفاظ میں انہوں نے اپنے تاثر کا اظہار کیا :

”سید سلیمان صاحب مرحوم کی تصانیف کے بعد آپ کی اس کتاب پر پہلی مرتبہ نظر پڑی جو میری نظر میں اردو کی مذہبی اور علمی تصانیف میں اعلیٰ پایہ رکھتی ہے۔“ (۳)

کاروانِ مدینہ کے متعلق اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :

”پڑھتا گیا اور رائے قائم کرتا گیا کہ یہ تقریر سب سے اچھی ہوگی، دوسری

(۱) تاریخِ دعوت و عزیمت حصہ سوم صفحہ ۲۳۱-۲۳۳

(۲) سیارہ ڈائجسٹ اشاعت ۱۹۶۵ء ماخوذ خطبات علی میاں ۶/۶۶

(۳) پرانے چراغِ دوم ۱۷۲

کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ چھپلی سے اونچی ہے، تیسری پڑھی تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں سے بہتر ہے۔ اس طرح خوب سے خوب تر تک سفر کرتا چلا گیا۔ آپ کے لیے ذہن میں جو تحسین کا دفتر کھلا وہ فی الحال قابو میں نہیں آتا کہ لکھ کر آپ تک پہنچاؤں۔ کتنے محدود صفحات میں آپ نے بصائر و معارف کا کیسا گراں بہا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے۔ پھر آپ کا جامع فکر انگیز اور دل نشین لب و لہجہ و پیرایہ بیان!!“ (۱)

حضرت مولانا کے سفر ناموں میں ”دریائے کابل سے دریائے یرموک تک“ ان کو بہت پسند تھا۔ اپنے تعلق والوں کو اشتیاق کے ساتھ پڑھنے کی تلقین کرتے تھے، ایک خط میں حضرت مولانا کو لکھتے ہیں :

”آپ کی یہ تصنیف اس طرح کی تصانیف سے جو دوسروں نے اب تک پیش کی ہیں نمایاں طور پر ممتاز ہے، اسلوب اور اظہار مطالب کے اعتبار سے جتنی سنجیدہ اور مؤثر ہے اتنا ہی دلکش بھی۔“ (۲)

ایک خط میں لکھتے ہیں :

”آپ کی تصانیف میں انشاء پر دازی کا جو حسن، جامعیت اور ”موافق احوال“ ہونے کی صفت پائی جاتی ہے اس کا اعتراف مجھ سے بہتر لوگ کر چکے ہیں، مختلف تقریبوں میں آپ کی تقریریں بڑی عالمانہ شگفتہ، شائستہ اور بر محل ہیں (۳)

مشہور شاعر ادیب و نقاد ماہر القادری صاحب ”پرانے چراغ“ پڑھ کر لکھتے ہیں:

”آپ کی تحریروں میں اخلاص اور ادبیت کی کوئی حد و نہایت نہیں۔“ (۴)

نقوش اقبال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”فاضل مصنف نے جس نزاکت اور دیدہ وری کے ساتھ اقبال کے اشعار کی تشریح و ترجمانی کی ہے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

(۲) پرانے چراغ دوم صفحہ: ۱۸۳

(۱) پرانے چراغ دوم صفحہ: ۱۷۴-۱۷۵

(۳) پرانے چراغ دوم صفحہ: ۲۰۹

(۴) پرانے چراغ دوم صفحہ: ۲۸۲

کتاب پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے شبلی کا قلم، غزالی کی فکر اور ابن تیمیہ کا جوش و اخلاص اس تصنیف میں کارفرما ہے۔ اقبال پر بڑی اچھی کتابیں آئی ہیں مگر یہ کتاب اس مجاہد عالم کی لکھی ہوئی ہے جو اقبال کے مرد مؤمن کا مصداق ہے۔“ (۱)

سولانا غلام رسول مہر، جگر مراد آبادی، شفیق جون پوری، خواجہ احمد فاروقی اور نہ جانے کتنے ادباء و شعراء نے مولانا کو بحیثیت ادیب کے خراج تحسین پیش کیا۔ شفیق جون پوری نے حضرت مولانا کے فکر و ادب سے متاثر ہو کر ایک نظم مولانا کی نذر کی جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

سچ تو یہ ہے آج کی تاریکی الحاد میں
تیری ہستی کو چراغ رہ گزر پاتا ہوں میں
آج لادینی کی دنیا میں رہے تیرا وجود
شب کی تاریکی میں پیغام سحر پاتا ہوں میں
تیری تقریروں سے جاگ اٹھتا ہے میرا ذوق عشق
تجھ سے گویا کوئے سلیمی کی خبر پاتا ہوں میں
منزل جاناں کی جانب ہے تری پرواز شوق
تجھ میں کچھ آثارِ مرغِ نامہ بر پاتا ہوں میں

لیکن بہر حال ان میں اکثر ادباء و شعراء وہ ہیں جن پر ”اسلامیت“ کی چھاپ ہے، اور بقول ڈاکٹر محسن عثمانی صاحب کے ان پر ستم ظریفوں نے وعظ کہنے کا یا اسلامیت کا الزام لگایا ہے۔ اس لیے اخیر میں ایک ایسے قلم کار کا اعتراف نقل کیا جا رہا ہے جن کا نام اس خود ساختہ تہمت سے محفوظ ہے، یہ نام قاضی عبدالستار صاحب کا ہے جو ایک اچھے ناول نگار ہیں وہ لکھتے ہیں :

”ہمارے طاق بے نیازی پر سب سے ہوئے کچھ نگار جیسے سید سلیمان ندوی،

سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایسے مشاہیر روزگار ہیں اور

ان کے نقش پائے رنگ رنگ اتنے جلی اور اتنے روشن ہیں کہ معمولی تفہیم و تحسین کے لیے بھی جلدیں درکار ہیں۔“ (۱)
جدید ادب کے علمبردار ماہنامہ ”شب خون“ نے بھی مولانا کی ادبی حیثیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔

”وہ اردو کے صاحب طرز نثر نگار بھی تھے، کلاسیکی اردو، فارسی ادب سے ان کی شناسائی صرف چند مشہور ناموں تک محدود نہ تھی، ”نقوش اقبال“ لکھ کر انہوں نے جدید ادب کی تنقید میں بھی ایک مقام حاصل کر لیا تھا اردو شعر و ادب کے ارتقاء اور تاریخ دونوں پر مولانا کی گہری نظر تھی۔“ (۲)

واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے اردو ادب میں بھی دعوت و فکر اسلامی کی کمان سنبھالی، اور بہت سے ترقی پسند، ادباء و اہل قلم مولانا کے اسلوب و فکر سے متاثر ہوئے۔ اور بہتوں کا قلم جو کبھی دین اور اہل دین کے تذکرہ کو بھی ادب کے لیے بے ادبی سمجھتا تھا وہ اکثر و بیشتر دین کی ترجمانی کرنے لگا۔ مولانا نے اپنی دعوت و فکر کا اصل میدان عربی زبان و ادب کو بنایا تھا تاہم اردو میں بھی مولانا کا شمار اس کے باکمال انشا پردازوں اور اس کو نیا رخ دینے والوں میں ہوتا ہے۔ یہ مولانا کا ایک نہایت اہم تجدیدی کام ہے جس کے نتیجہ میں نئی تعلیم یافتہ نسل کی ایک بڑی تعداد الحاد و لادینیت سے بچ سکی اور اس کو دینی بنیادوں پر قائم ایسا ادبی لٹریچر مل سکا جس نے اس کے لیے فکری غذا فراہم کی اور ذہن کی صحیح تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔



(۱) مولانا ابوالحسن علی ندوی - افکار و آثار صفحہ: ۴۰۷

(۲) تعمیر حیات نمبر صفحہ: ۵۳

﴿باب چہارم﴾

تعلیم عملی جدوجہد، طریقہ کار اور افکار و آثار

تعلیم کے میدان میں حضرت مولانا کی خدمات

تعلیم کے میدان میں بھی مولانا کی نمایاں خدمات ہیں، وہ ایک کامیاب معلم، مجتہد مدرس اور عرصہ تک ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم رہے ہیں۔ نصاب تعلیم مولانا کی توجہات کا مرکز رہا ہے، اس سلسلہ میں ان کی کوششیں بہت بار آور ہوئیں۔ ہندوستان میں مدارس کے قیام اور ”دینی تعلیمی کونسل“ کے پلیٹ فارم سے مولانا کی دعوت و فکر کے جوتانج سامنے آئے وہ بڑے دور رس اور گہرے ہیں۔ مولانا کی انہی خدمات کو اس باب میں قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے گا :

تدریس

حضرت مولانا ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جس کے خیر میں علم اور دین کی آمیزش تھی، حضرت مولانا کے اجداد میں نامور علماء و مشائخ پیدا ہوئے، والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب بڑے مؤرخ، عالم اور طبیب تھے، علوم شرعیہ سے ان کو خاص اشتغال تھا، کچھ عرصہ تدریس میں بھی گذارا۔ علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے تھے کہ ”مولانا سے مجھے شرف تلمذ حاصل ہے۔“ اخیر دور میں خاندان کے متعدد افراد نے مغربی تعلیم حاصل کی اور ان میں بعض بڑے عہدوں تک پہنچے، خود حضرت مولانا کے برادر اکبر مولانا ڈاکٹر سید عبدالحی صاحب نے مکمل دینی تعلیم کے ساتھ M.B.B.S. کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا تھا۔ اور

حضرت مولانا کی تعلیم میں بھی انہوں نے اس کا لحاظ رکھا تھا کہ عربی کی پختہ تعلیم کے ساتھ انگریزی کی ضروری تعلیم کا بھی انتظام ہو، خود دار العلوم ندوۃ العلماء کا بھی یہی تخیل تھا۔ حضرت مولانا کے ذہن نے اس کو پورے توازن کے ساتھ قبول کیا، درمیان میں ایک وقفہ ایسا آیا تھا کہ انگریزی کی طرف رجحان کچھ زیادہ بڑھنے لگا تھا، لیکن خاص طور پر والدہ صاحبہ کی توجہ و فکر سے جلد ہی اس میں اعتدال پیدا ہو گیا، بقدر ضرورت انگریزی کی بھی تحصیل فرمائی، تاہم اصل موضوع عربی کو بنایا اور علوم دینیہ میں مہارت پیدا کی۔

تعلیم سے فراغت کے کچھ ہی دنوں کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت مدرس تفسیر و ادب حضرت مولانا کا تقرر ہوا، یہ ۱۹۳۴ء کی بات ہے۔ ۱۹۴۴ء تک باضابطہ تدریس کا یہ سلسلہ جاری رہا۔

اس پورے عرصے میں مولانا نے عربی زبان و ادب کی متوسط کتابوں سے لے کر حدیث کی آخری کتابوں تک کا درس دیا۔ قرآن مجید مولانا کا خاص موضوع تھا، ذاتی فہم و ادراک کے علاوہ قدیم و جدید تفسیروں کی مدد سے مولانا نے اس کا درس دیا اور ذہنوں کو غذا فراہم کی۔ اس میں حضرت مولانا کی زیادہ تر کوشش یہ ہوتی تھی کہ طلبہ براہ راست متن قرآن سے آشنا ہوں اور اس کا فہم پیدا کریں، ان کے اندر پختگی پیدا کرنے کے لیے ان کو براہ راست تفسیروں سے مراجعت کرنے کا مشورہ دیتے۔

زبان و ادب کی تدریس کے طریقہ کار کے بارے میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہم فرماتے ہیں :

”مولانا کے تعلیمی طریقہ کے اجراء میں عمل عربی زبان و ادب کی تعلیم میں طالب علم پر زیادہ بوجھ ڈالنے کا تھا، وہ طالب علم کو صرف اسی حد تک بتانے کے قائل تھے جس حد تک طالب علم کے لیے خود سمجھ لینا کسی طرح ممکن نہ رہ جاتا، وہ طالب علم ہی سے عبارت پڑھواتے اور اسی سے ترجمہ کرواتے، اور اس کو اس بات کا پابند کرتے کہ وہ پڑھنے سے پہلے لغت کی مدد سے اور اپنی سابقہ معلومات کے لحاظ سے خود مطلب نکالے، اس سلسلہ میں اس کی کوتاہ فہمی یا بے توجہی سے

ہونے والی غلطی کو برداشت نہیں کرتے تھے اور اس کو سخت تنبیہ کرتے تھے، عبارت کو صحیح پڑھوانے کی عادت ڈلواتے۔ مذکورہ باتوں میں طالب علم کی کوتاہی پر سخت تنبیہی الفاظ استعمال کرتے، چنانچہ طالب علم ذاتی محنت پر مجبور ہو جاتا اور اس طرح اس کے اندر عبارت کو صحیح پڑھنے کی اور عبارت سے مطلب اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی۔“ (۱)

درس میں دو چیزوں کی طرف حضرت مولانا کی خاص توجہ تھی، ایک تو طلبہ کی ذہنی سطح کو سامنے رکھتے ہوئے تفہیم کے نئے نئے طریقے دریافت کرنا، ان کے اندر تعلیمی لیاقت پیدا کرنے کی کوشش۔ اور دوسرے ان کے اندر مقصدیت پیدا کرنا، قربانی کی روح بیدار کرنا، اور خاص منزل کے لیے ان کو تیار کرنا۔

تدریس کے آغاز ہی میں حضرت مولانا نے زبان کی براہ راست تعلیم (Direct Method) کا تجربہ کیا تھا جو بڑا کامیاب رہا۔ بعض دوسرے علوم و فنون کی تدریس میں بھی مولانا نے تطبیقی نظام کو ترجیح دی۔ فلسفہ، منطق کی کوئی کتاب ایک سال زیر درس رہی، اس میں بھی مولانا کا دستور یہ تھا کہ گھسی پٹی مثالوں کے بجائے روزمرہ کی مثالیں دے کر سمجھانے کی کوشش فرماتے۔

حدیث کے درس میں تقابلی فقہ پر سارا زور صرف کرنے کے بجائے اس کے اخلاقی اور معاشرتی پہلو پر زیادہ زور دیتے، اس کی روشنی میں معاشرہ کی خامیاں اجاگر فرماتے، نفس کی تلخیصات کھول کھول کر بیان فرماتے، اور اصلاح کی دعوت دیتے۔

حضرت مولانا کا معمول تھا کہ ہر سال تدریس کے آغاز پر تمہیدی تقریر فرماتے تھے جس میں دینی تعلیم کی اہمیت و افادیت، اس کے آداب اور تقاضوں کا تذکرہ ہوتا اور اس کے مقصد کا بیان۔

حضرت مولانا کے اولین دور کے شاگرد مولانا عبداللہ عباس ندوی اسی تقریر کے حوالہ سے ایک اقتباس تحریر فرماتے ہیں :

”دینی تعلیم کے لیے کسی مدرسہ میں آنا ایک طرح کی قربانی ہے، سرکاری

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ ایک عہد ساز شخصیت،

اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو جو دنیاوی منافع کی توقع رہتی ہے، وہ مدرسوں میں پڑھنے والے طلبہ کو نہیں ہوتی، زمانہ کارخ جس بہاؤ پر ہے اس کے مخالف رخ پر چلنا آسان نہیں ہے، اس کے لیے عزم کی ضرورت ہے اور سب سے پہلے نیت کی تصحیح ضروری ہے۔ مدرسے قربانی کی چھاؤنیاں ہیں، اگر کوئی ان مدرسوں میں بغیر عزم و نیت اور بغیر جذبہ ایمانی کے آتا ہے، اور اس کے نزدیک ترقی کا معیار وہی ہے جو سرکاری کالجوں کے طلبہ کے نزدیک ہے تو اس کے لیے خسارہ کا بڑا خطرہ ہے۔“ (۱)

حضرت مولانا کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کو اپنے شاگردوں سے بڑا گہرا تعلق تھا، طلبہ و اساتذہ کے ارتباط کو مولانا تعلیم و تربیت کے لیے بہت ضروری قرار دیتے تھے۔ اپنی ایک تقریر میں مغربی نظام تعلیم میں ٹیوٹرل (Tutorial) نظام پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ”در اصل یہ مشرقی طریقہ تعلیم تھا جو بہت مفید اور کارگر ہے، لیکن افسوس ہے کہ آج مشرقی قوموں نے اس کو چھوڑ دیا ہے۔“

حضرت مولانا کے شاگردوں کو بھی مولانا سے خاص تعلق تھا، اس میں حضرت مولانا کے خلوص و محبت، درد دل کے ساتھ تدریس کے سلیقہ اور اس پر محنت کو بھی خاص دخل تھا۔ حضرت مولانا کے شاگرد مولانا عبد اللہ عباس صاحب اس زمانہ کا حلیہ اور تاثیر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”میرے مولانا اس وقت ۲۵-۲۶ کی لپیٹ میں تھے، جسم اکہر اماں لہ لاغری تھا، لباس وہی تھا جو آج ہے، عینک اس وقت بھی لگاتے تھے، شخصیت میں جاذبیت تھی، جمال باطنی کے انوار جمال ظاہری کو دوبا لا کر رہے تھے، طلبہ کو اس وقت بھی آپ سے عقیدت و محبت تھی، اخلاص و للہیت کا اثر کہیے یا ذکر و ریاضت کی نورانیت اس درجہ ہویدا تھی کہ کوئی شخص قریب بیٹھتا تو اثر لے کر اٹھتا۔“ (۲)

باضابطہ تدریس کا سلسلہ تو دس سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد مسلسل دعوتی اسفار،

تصنیف و تالیف کی مشغولیت اور ضعف بصارت کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا، تاہم مختلف مناسبتوں سے اس کے مواقع آتے رہے، اور تشنگان علوم حضرت سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے منتہی طلباء کے لیے دائرہ شاہ علم اللہ (رائے بریلی) کے وہ دس پندرہ دن یادگار ہیں جو ان کو حضرت مولانا سے استفادہ کے لیے ملتے تھے، عرصہ سے یہ نظام قائم ہے اور حضرت کے وطن میں قائم دعوتی ادارہ ”دار عرفات“ کی جانب سے اس کا ہر سال انتظام کیا جاتا ہے، جس میں دارالعلوم کے آخری درجات کے طلبہ شریک ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا نے اپنے مرض الوفا میں بھی یہ سلسلہ جاری رکھا، اور اپنی فکر و دعوت سے طلبہ کو فائدہ پہنچایا۔

حضرت مولانا کا اس میں شروع سے معمول رہا ہے کہ اپنی اہم تالیفات کے مقدمات یا منتخب ابواب کا درس دیتے تھے، یہی ایک موقع ایسا ہوتا تھا کہ طلبہ کو براہ راست شاگردی کی نسبت حاصل ہوتی تھی، جس میں ان کی فکر کی تشکیل بھی ہوتی اور ان کی تربیت دہنی بھی، کتنے ایسے طلبہ ہیں کہ اسی درس سے ان کے ذہنوں میں تبدیلی پیدا ہوئی، خدمت دین کی فکر پیدا ہوئی، قربانی دینے کا جذبہ پیدا ہو۔

دارالعلوم کے ”المعهد العالی للدعوة والفکر الاسلامی“ کے افتتاح کے موقع پر بھی حضرت مولانا نے طلبہ کے سامنے باقاعدہ کئی روز تک محاضرات دئے، جو بڑے مفید اور قیمتی ثابت ہوئے، یہ محاضرات ”تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب“ کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

تعلیم کے میدان میں حضرت مولانا کی خدمات کا آغاز تدریس سے ہوا، پھر نصاب تعلیم میں مناسب تبدیلیاں، مدارس و مکاتب کے قیام اور دینی تعلیمی تحریک سے اس میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی۔

نصاب تعلیم میں تبدیلیاں

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بنیادی تخیلات میں نصاب تعلیم کی تبدیلی کا مسئلہ بڑا اہم تھا،

یہ ایک طبعی ضرورت تھی۔ تغیر پذیر دنیا میں وسائل دعوت اور وسائل تعلیم کے تغیرات ہر جگہ تسلیم کیے گئے ہیں، ان سے صرف نظر ایک بالغ نظر معلم و داعی کے لیے ممکن نہیں، لیکن افسوس کی بات ہے کہ دارالعلوم کے ابتدائی دور میں باقاعدہ یہ عمل ممکن نہ ہو سکا، صرف جزوی طور پر ہی اس میں تبدیلی کی جاسکی، یہ دارالعلوم کے ذمہ داروں پر ایک فرض تھا، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنے دور معتمدی میں اس پر توجہ فرمائی۔ ۱۹۴۹ء میں سید صاحب نے حضرت مولانا کو اپنا نائب منتخب کیا، اور یہ کام حضرت مولانا کے حوالہ کیا، مولانا نے پورے نصاب کا جائزہ لے کر ایک خاکہ مرتب فرمایا اور سید صاحب کو ارسال کر دیا، سید صاحب حضرت مولانا کی نگاہ انتخاب کے قائل ہو چکے تھے، جواب میں فرمایا :

”میں منتظر رہا کہ آپ نصاب کا مسودہ بھیج رہے ہیں یا بھیجا ہے، مگر وہ اب تک مجھے نہیں ملا، اب انتظار کے بعد جواباً لکھتا ہوں کہ میرا دور اور میرا عصر عمل گذر چکا، لکل عصر و حال۔ اب اس دور کے لیے آپ کا خاکہ موزوں ہوگا، مجھے چونکہ آپ پر اعتبار و اعتماد ہے، اس لیے دیکھے بغیر میں اس کو پسند کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ نافع فرمائے۔“ (۱)

مسئلہ اب صرف انتخاب کا نہیں رہ گیا تھا بلکہ عربی زبان و ادب کے لیے نئے نصاب کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ عربی کی ریڈروں میں عام طور پر مصر کی شائع شدہ کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، جن پر مصری ثقافت کی چھاپ تو ضرور تھی لیکن اسلامی ثقافت کا ان پر کوئی اثر نہ تھا، نو عمر طلبہ کے ذہنوں کی اسلامی تشکیل میں ان سے مدد ملنے کی کوئی توقع نہیں تھی، اور اس کام کے لیے مستقل ان کو سبق دینے کی ضرورت پڑتی تھی۔ مولانا عبد الماجد دریا آبادیؒ نے ان ریڈروں کو دیکھ کر اپنے ایک مکتوب میں حضرت مولانا کو تحریر فرمایا :

”حال میں ندوہ کی ایک ابتدائی درسی کتاب، محض اتفاق سے نظر پڑ گئی، بڑا ہی دل دکھا، تصویروں کی وہ بھرمار کہ شاید عبارت بھی اتنی نہ ہو..... اللہ اور رسول کا شروع سے آخر تک نام نہیں، لغو قیسے، حیرت ہوئی کہ ایسی کتاب اور سید صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے زمانہ میں!!؟“ (۲)

حضرت مولانا بھی اس ضرورت کو محسوس فرما رہے تھے، جس کا اظہار مولانا نے ”قصص النبیین“ کے مقدمہ میں کیا ہے، اپنے برادر زادے مولانا سید محمد الحسنیؒ کو خطاب کر کے فرماتے ہیں :

”میرے عزیز بھتیجے! میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں قصے کہانیوں کا بڑا شوق ہے، اور تمہاری عمر میں یہ ہر بچہ کا شوق ہوتا ہے، تم بڑے شوق سے قصے پڑھتے ہو، کہانیاں سنتے ہو، لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ہاتھ میں صرف کتے، بلی اور جانوروں کی کہانیاں دیکھتا ہوں، اس کی بھی وجہ یہ ہے کہ تمہیں اسی طرح کی کہانیاں چھپی ہوئی ملتی ہیں، ہمیں افسوس ہے کہ عربی میں سوائے خرافاتی کتابوں کے ایسی کتابیں نہیں جو تمہارے لائق ہوں، میں سوچتا ہوں کہ تمہارے اور تمہارے جیسے مسلمان بچوں کے لیے ایسی کتابیں تیار کروں جس میں نبیوں کے قصے ہوں۔“ (۱)

حضرت مولانا نے عربی کی ریڈریں تیار فرمائیں، ”قصص النبیین للأطفال“ پانچ حصوں میں اور ”القرأة الراشدة“ تین حصوں میں۔ ان دونوں کتابوں میں حضرت مولانا نے طلبہ کی نفسیات کا خاص خیال رکھا ہے، اور زبان بھی اسی سطح کی بڑی خوبصورت استعمال فرمائی ہے، یہ کتابیں دارالعلوم کے نصاب میں داخل کی گئیں اور آہستہ آہستہ ہر عربی مدرسہ میں ان کو جگہ دی گئی، ”القرأة الراشدة“ کے بارے میں خود حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں :

”کتاب میں اس کا التزام ہے کہ حتی الامکان کوئی سبق دینی موعظت سے خالی نہ ہو اور آخر میں اس کا کوئی اخلاقی و دینی نتیجہ نکلتا ہو یا کسی دینی تعلیم یا آداب کی طرف رہبری ہوتی ہو، لیکن اس طرح کہ طالب علم کو محسوس نہ ہو کہ کوئی چیز اوپر سے یا باہر سے لائی جا رہی ہے یا اس کو کوئی خارجی انجکشن دیا جا رہا ہے۔“ (۲)

”قصص النبیین“ پر مولانا دریا بادیؒ نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ”یہ بچوں کا علم

(۱) مقدمہ قصص النبیین (اول)

(۲) کاروان زندگی اول صفحہ ۲۱۴

کلام ہے۔“ ان کتابوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اسلامی عقائد اور اسلامی ثقافت کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو اس کا کوئی بار محسوس نہیں ہوتا، اور تحت الشعور میں وہ حقائق آہستہ آہستہ خود بخود منتقل ہوتے جاتے ہیں۔

مشہور اسلامی مفکر، ادیب و انشاء پرداز سید قطبؒ تحریر فرماتے ہیں :

”میں نے کثرت سے وہ کتابیں پڑھی ہیں جو بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں اور جن میں انبیاء کرام کی حکایات و قصص بھی شامل ہیں، خود ایک سلسلہ کتب کی ترتیب میں میں نے شرکت کی جو ”القصص الدینی للأطفال“ کے نام سے مصر میں مرتب ہوا، اور جس کے لیے مواد قرآن مجید سے اخذ کیا گیا تھا، لیکن میں تکلف اور خوشامد کے بغیر اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ ”قصص النیین للأطفال“ کے مصنف کا کام ہمارے وضع کیے ہوئے سلسلہ سے زیادہ کامیاب اور مکمل ہے، اس لیے کہ اس میں ایسی لطیف رہنمائیاں، قصے کے مقاصد پر روشنی ڈالنے والی تشریحات اور بین السطور میں ایسے اشارات آگئے ہیں جو بیش قیمت ایمانی حقائق کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔“ (۱)

عربی ادب کی تعلیم کے لیے حضرت مولانا نے چودہ سو سالہ عربی زبان و ادب کے خزانے سے قیمتی موتی تلاش کیے، اور ”مختارات من أدب العرب“ کے نام سے اس کا بہترین انتخاب عربی دنیا کے سامنے پیش کیا، سہولت و صعوبت کے اعتبار سے اس کو دو حصوں میں تقسیم فرمایا اور عربی ادب کے نصاب میں ایک قابل قدر اضافہ فرمایا، عربی ادب کے ماہرین نے اس کو دیکھ کر سب سے بہتر انتخاب قرار دیا۔

قصص النبیین، القراءة الراشده اور مختارات کے درمیان ایک ایسی کتاب کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو دونوں کے درمیان سیڑھی کا کام دے۔ حضرت مولانا ہی کے اشارے پر مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی مدظلہم نے یہ ضرورت ”منشورات من أدب العرب“ سے پوری کی۔ اس طرح عربی زبان و ادب کا ایک ایسا نصاب تیار ہو گیا، جس کو ہر معتبر عربی مدرسہ اور دانش گاہ میں قبول کیا گیا اور ہر جگہ اس سے فائدہ اٹھایا گیا۔

عربی ادب کی تاریخ حضرت مولانا نے اپنے فاضل خواہر زادگان مولانا محمد راج ندوی صاحب اور مولانا واضح رشید ندوی صاحب سے از سر نو مرتب کروائی اور تخصص ادب کے درجات میں اس کو داخل نصاب کیا گیا، اس کے علاوہ فقہ، صرف و نحو، اور انشاء کے لیے بھی بہتر کتابیں حضرت مولانا کی سرپرستی و نگرانی میں تیار کی گئیں، اور ایک مکمل نصاب تعلیم مرتب ہوا، جو آج سیکڑوں مدارس میں پڑھایا جا رہا ہے اور اس کے بہتر نتائج سامنے آرہے ہیں۔

مولانا محمد راج صاحب مدظلہم اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں :

”نصاب کے سلسلہ میں مولانا کا تصور ”الجمع بین القديم الصالح والجدید النافع“ تھا، یعنی قدیم کی اچھی باتوں اور جدید کی مفید باتوں کو جمع کرنا، چنانچہ ندوہ کے نصاب میں حدیث و قرآن کی تعلیمات اور مقتدر اسلاف کے اچھے علمی و ادبی ورثہ کے ساتھ تجرباتی علوم و ادب کا وہ حصہ جو ہماری زندگی کے لیے ضروری اور مفید ہے، شامل کرنا نصاب کے اصول میں داخل کیا، چنانچہ ندوۃ العلماء کے نصاب میں حتی الوسع اس کی رعایت رکھی گئی ہے۔ مولانا اس کو صرف ندوہ ہی کے لیے ضروری نہیں سمجھتے تھے، بلکہ تمام مسلم درس گاہوں کو اسی اصول پر چلانے کا مشورہ دیتے تھے۔ مولانا کے نزدیک نصاب کی کتابوں اور مضامین میں یہ خصوصیت ہونی چاہیے کہ وہ مقصد تعلیم کو پورا کرتے ہوں۔“ (۱)

تعلیم کے میدان میں حضرت مولانا کی ہمہ جہت کوششیں

تعلیم کے میدان میں حضرت مولانا کی کوششیں بڑی ہمہ جہت، بھوس اور مفید نظر آتی ہیں، ایک طرف وہ دینی تعلیم کی ضرورت و افادیت کے داعی ہی نہیں بلکہ اس کے قافلہ سالار ہیں۔ دوسری طرف عصری تعلیم کی افادیت سے بھی ان کو انکار نہیں، بلکہ کسی حد تک وہ اس کو ضروری سمجھتے ہیں، مگر وہ نظام تعلیم جس غلط رخ کی طرف جا رہا تھا، مولانا کو اس کی بھی بڑی فکر تھی، اور اس کو صحیح رخ دینے کے لیے انہوں نے اپنی طاقتور تحریروں، مؤثر تقریروں اور باہمی مذاکرت کا سہارا لیا ہے۔

دینی تعلیم

دینی تعلیم کے سلسلہ میں حضرت مولانا کی کوششوں کا سب سے بڑا محور دارالعلوم ندوۃ العلماء ہے، جس کے آب و گل سے مولانا کا خمیر تیار ہوا، وہ حضرت مولانا کے طائر فکر کا نشین اور ہم فکر و ہم خیال احباب کی سب سے بڑی انجمن رہی ہے۔ ادھر چالیس سال سے حضرت مولانا ہی اس کے میر انجمن تھے تعلیمی و تنظیمی اعتبار سے حضرت مولانا نے اس کو جس طرح بام عروج تک پہنچایا یہ اس کی تاریخ کا سب سے روشن باب ہے۔ نصاب تعلیم، نظام تعلیم کی پختگی، ماہر اساتذہ فن کا تقرر، عالم عربی سے دعوتی و فکری ارتباط اور مختلف فنون کے ماہرین کے محاضرات سے دارالعلوم کی شہرت عالم اسلام میں پھیلی اور اسلامی دنیا میں اس کو ایک نہایت معتبر اور موقر دینی تعلیمی دانش گاہ کے طور پر تسلیم کیا گیا، اس طرح حضرت مولانا کے ذریعہ سے بانیان دارالعلوم ندوۃ العلماء کا دیرینہ خواب شرمندہ تعبیر ہوا۔

دارالعلوم کے نصاب تعلیم میں ہمیشہ یہ خیال رکھا گیا کہ ٹھوس دینی تعلیم کے ساتھ ضروری عصری تعلیم بھی دی جاتی رہے، جس میں عصر جدید کے تقاضوں کا لحاظ ہو، تاکہ یہاں کے فارغین جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلامی فکر کی صحیح ترجمانی کر سکیں۔ حضرت مولانا کے دور میں یہ کام مزید وسعت کے ساتھ انجام پاسکا، خود حضرت مولانا اسی نصاب سے مستفید اور ندوہ کے تحلیل کی عملی تفسیر تھے، ان کی تحریروں سے نئی نسل میں دین پر اعتماد بحال ہوا اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں علماء کی قدردانی پیدا ہوئی۔

ندوہ کا یہ نظام و نصاب تعلیم صرف دارالعلوم کی چہار دیواری تک محدود نہیں رہا بلکہ پورے ملک کے طول و عرض میں جا بجا اسی نظام کے مطابق مدارس قائم ہوئے اور متعدد قدیم مدارس نے یہ نظام اختیار کیا۔ اس وقت ملک میں دوسو سے زائد ایسے مدارس قائم ہیں جہاں سے ندوۃ العلماء کی فکر کی ترجمانی ہو رہی ہے، یہ وہ فکر ہے جس میں دین کو پورے توازن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ صاحب بصیرت علماء اور دانشوروں نے اس کو وقت کی سب سے بڑی ضرورت قرار دیا ہے۔

حضرت مولانا نے ندوۃ العلماء کے استحکام و ترقی کے علاوہ دوسرے اہم دینی مدارس و

جامعات کے تحفظ و بقاء اور ترقی کی بھی فکر رکھی۔

دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے حضرت مولانا تاحیات رکن رہے اور اس پورے عرصہ میں دارالعلوم کی ترقی و استحکام کے لیے مفید مشورہ دیتے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں طلبہ کی انجمن کی دعوت پر دیوبند تشریف لے گئے اور ایک بیش قیمت تقریر فرمائی، جس میں طلبہ کو ان کے مقام اور ذمہ داریوں سے آگاہ فرمایا۔ اجلاس صد سالہ کے موقع پر حضرت مولانا کے قیمتی مشورے شامل رہے، عالم عربی کے بعض ممتاز علماء حضرت مولانا ہی کی دعوت پر تشریف لائے، اس موقع پر مولانا نے جو تقریر کی وہ خود مولانا کی شاہکار تقریروں میں سے ہے، جس میں انہوں نے ”دیوبند“ کی خصوصیات بیان فرما کر ان کو باقی رکھنے کی تلقین فرمائی۔ تقریر کے معا بعد مفتی محمود صاحب (سابق وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد پاکستان) کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ مولانا نے دیوبندیت کے بارے میں جو بھی فرمایا میں اس سے پورا اتفاق کرتا ہوں، دیوبندیت کی اس سے بہتر تعریف ہو نہیں سکتی۔“

دارالعلوم ندوۃ العلماء اور اس سے ملحق دوسرے مدارس جس طرح حضرت مولانا کو عزیز تھے، اسی طرح ان تمام مدارس کی بھی مولانا کو فکر رہتی تھی جو خدمتِ تعلیم دین میں مصروف ہیں، ان کے تعاون اور رہنمائی سے کبھی گریز نہ فرماتے، مالی تعاون کے سلسلہ میں بارہا ایسا ہوا کہ دوسرے کسی ادارہ کے لیے مولانا نے پرزور سفارش فرمائی، جب کہ ندوہ اور اس سے متعلق کسی دوسرے ادارے کے لیے احتیاط فرماتے تھے۔

حضرت مولانا کی نظر میں یہ دینی مدارس ہی ہندوستان میں دین کے تحفظ و بقاء کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں، مدارس کی اہمیت و افادیت پر حضرت مولانا نے اپنے بعض مضامین کا مجموعہ اشاعت کے لیے دیا تو اس کا نام ہی ”دین کے قلعے“ رکھا۔ ایک تقریر میں فرمایا کہ ”یہی مکاتب ہیں جو ملت کی نوجوان نسل کو ایمان و اسلام سے وابستہ رکھیں گے۔“ ۱۹۵۳ء میں دیوبند میں دیئے گئے ایک لکچر میں فرمایا :

”دوستو! ہم سب کے معلوم ہونا چاہیے کہ دینی مدرسہ کا مقام اور منصب

کیا ہے؟ مدرسہ سب سے بڑی کارگاہ ہے جہاں آدم گری اور مردم سازی کا کام ہوتا

ہے، جہاں دین کے داعی اور اسلام کے سپاہی تیار ہوتے ہیں، مدرسہ عالم اسلام

کا بجلی گھر ہے جہاں قلب و نگاہ اور ذہن و دماغ ڈھلتے ہیں، اس کا تعلق براہ راست نبوت محمدی ﷺ سے ہے جو عالم گیر بھی ہے اور زندہ جاوید بھی۔“ (۱)

دینی مدارس کے سلسلہ میں حضرت مولانا کا یہ نظریہ تھا کہ ان کو آزاد رہ کر کام کرنا چاہیے۔ اس نظریہ کو حضرت مولانا نے اپنی ایک تقریر میں بڑی وضاحت سے بیان فرمایا ہے اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے :

”آخر میں بڑی معذرت کے ساتھ ایک تلخ حقیقت کی طرف بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ان مدارس و مکاتب کے سرکاری الحاق اور سرکاری امداد قبول کر لینے کے بعد یہ اندیشہ ہے کہ ان مدارس کا عوام سے رابطہ بھی ٹوٹ جائے اور وہ مقصد بھی حاصل نہ ہو جس کے لیے سرکاری امداد اور ایڈ قبول کی گئی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے پٹنہ کے ایک جلسہ میں شرکت کے موقع پر جو امارات شرعیہ بہار کے قائم کردہ مولانا ابوالحسن محمد سجاد صاحبؒ کی یادگار میں اسپتال کے افتتاح کے لیے منعقد کیا گیا تھا، اور جس میں بہار کے چیف منسٹر بھی شریک تھے، ایک عربی مدرسہ کے ذمہ دار نے تقریر میں کہا کہ ”چھ مہینے سے ہم کو سرکاری امدادی رقم نہیں ملی، ہمارے بچے فاقہ کر رہے ہیں۔“ یہ بہار کا حال تھا جہاں اکثر مدارس عربیہ سرکاری امداد قبول کر چکے ہیں۔ ابھی چند ہی دن پہلے ۱۳ مئی کے ”قومی آواز“ (لکھنؤ) میں جھانسی کے ایک دینی مدرسہ کے صدر مدرسین یا مہتمم صاحب کا مراسلہ شائع ہوا ہے، اس میں صاف لکھا گیا ہے کہ ”پانچ مہینے سے ہم کو سرکاری امداد نہیں ملی اور ہمارے بچے فاقہ کر رہے ہیں۔“ ایسی حالت میں بڑے ٹوٹے کا سودا ہوگا کہ ہمارا رشتہ عوام سے بھی ٹوٹ جائے اور ہم ان کی ہمدردی اور اعانت سے بھی محروم ہو جائیں اور حکومت کے تغافل یا اس کے نظم و نسق کی طوالت کا بھی شکار ہوں، اس طرح (بہت معذرت کے ساتھ) صرف اس مصرعہ پر اکتفا کروں گا کہ

ع نہ خدا ہی ملانہ وصال صنم“ (۲)

عصری تعلیم

حضرت مولانا جدید علوم کی ضرورت و افادیت کے پوری طرح قائل تھے، لیکن اس کے ساتھ ایسی بنیادی دینی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے جو اسلامی عقیدہ و عمل کو تحفظ فراہم کر سکے، ایک تقریر میں فرماتے ہیں :

”میں یہ نہیں کہتا کہ آپ اپنے بچوں کو جدید علوم نہ سکھائیے، ان کو اس کی ضرورت تعلیم دیجیے مگر پہلے ان کے دلوں میں ایمان و یقین کی بنیاد کو مضبوط و مستحکم کر دیجیے تاکہ کوئی طوفان ان کے ایمان و یقین کی بنیاد کو ہلانہ سکے۔“ (۱)

اپنی دسیوں تقریروں میں حضرت مولانا نے یہ حقیقت بباغ دہل بیان فرمائی کہ ”تنہا علم مفید ہونے کے بجائے مضر ہوتا ہے، جب تک اس کو اسم الہی کے ساتھ جوڑ نہ دیا جائے۔“ مولانا فرماتے تھے کہ آج دنیا کے انتشار کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ”علم تو ہے لیکن اسم الہی کی روشنی سے وہ محروم ہے۔“

جدید علوم کی درس گاہوں کی مولانا کے یہاں پوری قدر تھی، وہ اس کی ضرورت کو پوری طرح سمجھتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اس میدان میں بھی آگے بڑھیں اور قائدانہ کردار ادا کریں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) اور جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد) کو وہ اسی لیے اہمیت و قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ یہ مسلمانوں کے نمائندہ ادارے ہیں۔ ان کا اقلیتی کردار جب بھی متاثر ہوا تو حضرت مولانا پر اس کا اثر پڑا اور جب بھی ضرورت پڑی وہ اس کے لیے آگے آئے۔

سرسید کے بعض معتقدات سے حضرت مولانا کو اختلاف تھا، یونیورسٹی کے بعض نظریات بھی ان کو ناپسند تھے، تاہم وہ اس کو ملت کا اثاثہ سمجھتے تھے اور اس کی حفاظت ملت کی ذمہ داری گردانتے۔

مسلم یونیورسٹی میں دیے گئے اپنے ایک خطبہ میں وہ فرماتے ہیں :

”میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو ایک ایسا قیمتی اثاثہ سمجھتا ہوں جس پر مرفہ الحال اور با اثر ہندوستانی مسلمانوں کی بہترین ذہنی صلاحیتیں اور توانائیاں

صرف ہوئی ہیں۔“ (۱)

تقسیم کے بعد سے کمیونسٹ لابی نے پوری کوشش کی کہ یونیورسٹی کا اقلیتی کردار ختم ہو جائے، ترقی پسند یہاں تک دعویٰ کرنے لگے کہ یونیورسٹی کو عنقریب ایک مثالی کمیونسٹ ادارہ بنادیں گے، اس کے لیے انہوں نے پوری تحریک چلائی۔ اس کے مقابلہ میں دیندار طبقہ جس کی قیادت ڈاکٹر عابد حسین صاحب کر رہے تھے کوشش کرتا رہا، اس زمانہ میں بھی یونیورسٹی میں حضرت مولانا کے کئی پروگرام ہوئے، جس میں انہوں نے دین کی حقانیت مدلل طریقہ پر ثابت کی۔ جب بدرالدین طیب جی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنائے گئے تو حضرت مولانا نے چاہا کہ ان کو حالات سے آگاہ کیا جائے، قبل اس کے کہ حضرت مولانا ان سے ملاقات کرتے ان کو خود حضرت مولانا سے ملنے کی ضرورت پیش آگئی۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ حضرت مولانا اور ان کے مہتمبین نے ”قومیت عربیہ“ کے ترجمان، مصری صدر جمال عبدالناصر کے خلاف جو قلمی جہاد چھیڑ رکھا تھا، اس پر قدغن لگانے کے لیے نہرو نے (جن کی ناصر سے بڑی دوستی تھی) طیب جی کو مامور کیا۔ انہوں نے حضرت سے مل کر اپنا مدعا بیان کیا۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ ”یہ میرے ضمیر کی آواز ہے، اگر نہرو جی کوئی غلط فیصلہ لے رہے ہوں تو ہماری آپ کی ذمہ داری ہے کہ ان کو اس غلط کام سے روکیں، یہی صحیح نیشنلزم ہے۔“ حضرت مولانا کی اس صاف گوئی سے طیب جی بہت متاثر ہوئے۔ حضرت مولانا نے ان سے یونیورسٹی سے متعلق بھی گفتگو فرمائی اور ایک تحریری یادداشت بھی ان کو ارسال کی جس میں یونیورسٹی کی اہمیت و افادیت کا تذکرہ کرنے کے بعد حضرت مولانا نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ یہ بات لکھی ہے:

”کسی بھی ادارہ کو زمانہ کے تقاضوں اور عام نعروں کے مطابق ڈھال لینا کوئی خاص بات نہیں ہے، بڑی بہادری اور غیر معمولی قابلیت کی بات یہ ہے کہ ادارہ کی انفرادیت و افادیت کا تحفظ ہو اور بے جا مطالبوں کا مضبوطی سے مقابلہ کیا جائے۔“ (۲)

(۱) کاروان زندگی ۱۳۹/۲

(۲) یہ اقتباسات حضرت مولانا کے اس اصل مکتوب سے لیے گئے ہیں جس کا انگریزی ترجمہ جناب بدرالدین طیب جی کو بھیجا گیا تھا۔ راقم پروفیسر خالد صدیقی صاحب کا شکر گزار ہے جنہوں نے ڈاکٹر غیاث الدین ندوی (مقیم علی گڑھ) کے توسط سے خط کا ٹکس براؤر معظم مولانا سید عبدالجبار سے استفادہ ممکن ہو سکا۔

حضرت مولانا لکھتے ہیں :

”آپ کا پہلا کارنامہ یہ ہوگا کہ آپ اس کی اسلامی شخصیت کی حفاظت کریں، قریبی زمانہ میں پیش آنے والے حالات کی وجہ سے وہاں کے مسلمان اساتذہ اور طلبہ میں احساس کمتری اور مایوسی شدت سے پیدا ہو رہی ہے۔ آپ کی تشریف آوری اگر اس چیز کو زائل کر سکے تو یہ آپ کا بڑا کارنامہ اور ایک انقلاب انگیز خدمت ہوگی۔

بحیثیت وائس چانسلر کے آپ کا طلبہ اور اساتذہ کا جو پہلا تعارف اور تاثر ہو وہ اس پہلو کو نمایاں کرے، آپ اپنی پہلی تقریر میں اس چیز کو واضح کر دیں کہ یہ ایک ایسا تعلیمی ماحول ہے کہ جس میں مسلمان اساتذہ و طلبہ کو اپنے پورے اسلامی کیریئر اور اعتماد کے ساتھ رہنے کا موقع ہے اور ان کو اس یونیورسٹی کو اپنی عزیز درس گاہ اور صحیح اسلامی تہذیب کا ایک مرکز سمجھنا چاہیے۔“ (۱)

مزید فرماتے ہیں :

”میں یہ بھی عرض کروں گا کہ آپ کا یہ اعلان اور یقین دہانی آپ کی کامیابی کے لیے راستہ صاف کرے گی اور ایک ایسے عنصر کو آپ کا معاون، رفیق اور مطیع بنادے گی جو زیادہ مخلص، گرم جوش اور قابل اعتماد ہے۔ اس کے لیے وہاں اسلامی روایات کم سے کم اسی درجہ میں نمایاں کرنے کا موقع دینا چاہیے جیسا کہ بغیر کسی تعصب اور تلخی کے وہ پہلے نمایاں تھیں۔“ (۲)

اخیر میں یونیورسٹی کی ذمہ داریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”دوسری اور آخری بات یہ ہے کہ اس وقت بڑی ضرورت ہے کہ یونیورسٹی میں علمی و تحقیقی فضا پیدا کی جائے، لوگ اندرونی سیاست اور پارٹی پالیٹکس سے علاحدہ ہو کر مفید عنوانات پر اور تکنیکل اور تحقیقی کام کریں جس سے یونیورسٹی کا نام روشن ہو اور دنیا کو یہ بھی معلوم ہو کہ مسائل حاضرہ پر اسلام کی کیا رہنمائی ہے۔ اس یونیورسٹی سے بجا طور پر مسلمانوں کو یہ توقع ہے کہ وہ

اسلامیات پر وقیع اور موثر لٹریچر تیار کریں۔ لیکن اس طویل مدت میں اس نے

یہ کام نہیں کیا، شاید آپ کی رہنمائی میں یہ کام ہو سکے۔“ (۱)

اس موثر اور پر مغز مکتوب سے طیب جی کی فکر میں تبدیلی پیدا ہوئی اور انہوں نے اس کے بعد اسٹریپچی ہال میں جو تقریر کی وہ ان ہی نکات پر مبنی تھی جو ان کو حضرت مولانا نے لکھ کر دیے تھے۔ اس کے بعد ہی سے کمیونسٹ لابی کمزور ہونے لگی۔

۱۹۶۵ء میں ایک سازش کے تحت یونیورسٹی کا اقلیتی کردار ختم کیا گیا تو حضرت مولانا نے اس کے خلاف آواز اٹھائی، اور اس کو صرف مسلمانوں ہی نہیں بلکہ ملک کے لیے سخت مضر فرمایا۔

اسی موقع پر ایک اجلاس میں اپنی افتتاحی تقریر میں انہوں نے فرمایا تھا:

”اگر ہماری تعلیم گاہیں کلتیہ حکومت کے اختیار اور اقتدار میں آجائیں، وہاں ایک ہی طرح کا فلسفہ پڑھایا جانے لگے، ایک ہی طرح کے ماڈل تیار ہوں، ایک ہی سیاسی پارٹی اور اس کے مقاصد کا ان کو نقیب اور نقارچی بنادیا جائے، وہاں کے اساتذہ اور تعلیمی منتظم سرکار دربار کے چشم وابرو کے اشارے کو دیکھنے والے ہوں تو پھر اس ملک کو تباہی سے بچایا نہیں جاسکتا۔“ (۲)

مولانا نے ایک لطیف چٹکی لیتے ہوئے تحریر فرمایا تھا:

”بعض غیر مسلم دانشوروں اور پروفیسروں کو اس پر تعجب ہوا کہ ایک

مولوی کی کمزور اور مریض آنکھ نے اس خطرہ کو اتنی دور سے کیسے دیکھ لیا؟!“ (۳)

یہ تحریک کئی سال چلتی رہی اور اس کے مختلف جلسوں میں حضرت نے خطاب فرمایا، یہاں تک کہ ۱۹۸۰ء میں حکومت نے تحریک کے اکثر مطالبات تسلیم کر لیے، اور اس کے مطابق پارلیمنٹ میں بل پاس کرایا، اس وقت سے یونیورسٹی اسی ایکٹ کے تحت چل رہی ہے۔

حضرت مولانا کا مطالعہ بہت وسیع اور عمیق تھا، مختلف ادوار میں انہوں نے تعلیم کی تاریخ کا جائزہ لیا تھا، عصری اداروں کے نشیب و فراز سے وہ خوب واقف تھے، ان کے نظام تعلیم کی

خوبیاں اور خامیاں مولانا کے سامنے تھیں، خوبیوں کے پورے اعتراف اور ان اداروں کے استحکام و ترقی کی پوری فکر کے ساتھ حضرت مولانا نے اس نظام تعلیم کی خامیوں کو بھی ان کے سامنے ہمیشہ اجاگر کیا، اور ان کو دور کرنے کی دعوت دی اور اس کا طریقہ کار بھی بتایا۔
عام عصری درس گاہوں اور یونیورسٹیوں کے اخلاقی دیوالیہ پن پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک تقریر میں فرماتے ہیں :

”آج حال یہ کہ جتنا پڑھا لکھا انسان ہے اتنا ہی وہ ڈرنے کے قابل ہے، آج پوری دنیا میں پڑھے لکھے بھیڑیوں کا راج ہے، ایسے بھیڑیوں کا جو دوسرے کے جسموں سے کپڑے اتار لیتے ہیں تاکہ اپنی دیوار کو پہنائیں، جو دوسروں کے بچوں اور یتیموں کے آگے سے کھانا اس لیے کھینچ لیتے ہیں کہ ان کے کتوں کا پیٹ بھر سکے۔ بددیانتی، خود غرضی، مطلب پرستی، نفس پرستی پر آج کے پورے نظام تعلیم کی بنیاد ہے۔“ (۱)

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اساتذہ و طلبہ کو خطاب کر کے انہوں نے فرمایا :

”میں سمجھتا ہوں کہ ان کی (سرسید) نظر اور ان کی توقعات اس میں ہرگز محدود نہ تھیں کہ اس تعلیم گاہ سے وہ لوگ نکالے جائیں جو سامیوں کے قابل ثابت ہوں، ان کو عہدے دیے جائیں اور وہ اپنے محدود خاندانوں کی پرورش کریں اور اچھی طرح کھائیں پئیں اور زندگی گزاریں، وہ ایسی نسل پیدا کرنا چاہتے تھے جو قیادت کرے۔“ (۲)

یونیورسٹی کی ذمہ داریوں کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

”لیکن مسلمانوں کے جدید نازک ثقافتی و فکری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اس ادارہ نے وہ کردار ادا نہیں کیا جس کی توقع تھی، یہ مغرب کے علمی و عملی تجربوں اور مؤرخین کو مسلم معاشرہ اور ملت اسلامیہ کے حالات و ضروریات کے مطابق ڈھالنے کا عظیم اور مجتہدانہ کام تھا، یہ ایک نئی اسلامی نسل کا پیدا کرنا تھا جو

(۱) کبیر مسلسل صفحہ ۳۱۳

(۲) کاروان زندگی صفحہ ۴۲

عقیدہ اور اصول میں مستحکم اور مضبوط اور اس اہم کردار سے واقف ہو جو اس کو تہذیب عالم کی قیادت میں ادا کرنا ہے، اس کی نظر میں وسعت اور فکر میں چلک ہو، جدید علوم اور مغربی ثقافت سے اس نے اس کے اچھے پہلو اور اس کا مغز لے لیا ہو اور اس کی کمزوریوں اور غیر ضروری اجزاء سے احتراز کیا ہو، جس کے نتائج فکر و تحقیقات اپنے دماغ کا نتیجہ ہوں اور ان میں اسلامی ذہانت اور خود اعتمادی صاف جھلکتی ہو، اور جن کے فکر و عمل میں ”لذت کردار“ اور ”جرات اندیشہ“ پہلو بہ پہلو ہوں۔ یہ وہ نئی نسل تھی جس کا عالم اسلام بڑی بے چینی اور اشتیاق کے ساتھ عرصہ سے منتظر اور اس کے لیے چشم براہ تھا۔“ (۱)

دینی تعلیمی تحریک

حضرت مولانا کو احساس تھا کہ آزادی کے بعد سے ہندو یو مالائی تہذیب نے آہستہ آہستہ اپنے پنجے گاڑنے شروع کر دیے ہیں، یہاں کا نصاب تعلیم بھی اس سے متاثر ہونے لگا تھا، یہ نئی مسلمان نسل کے لیے نہایت خطرناک صورتحال تھی، اس سے اس نسل کا ایمان خطرہ میں پڑ گیا تھا، اور اس کا ڈر پیدا ہو چلا تھا کہ دوسری قوموں کی طرح یہ مسلمان قوم بھی اپنی شناخت کھو بیٹھے اور قومی دھارے میں ضم ہو جائے۔

اس خطرہ کو دور کرنے کے لیے حضرت مولانا نے بڑے ٹھوس اقدامات فرمائے، ان میں ایک بڑا اہم قدم مدارس و مکاتب کا جابجا قیام ہے، جن کا مقصد ہی مسلمان بچوں کے ذہنوں کی تشکیل اور عقیدہ و ایمان کی جڑوں کو ان کے دلوں اور دماغوں میں پیوست کرنا تھا۔ اس کو باقاعدہ تحریک کی شکل ۱۹۵۹ء میں حاصل ہوئی، جب بستی کی صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس میں ”دینی تعلیمی کونسل“ کی تشکیل ہوئی اور حضرت مولانا کو اس کا تاحیات صدر منتخب کیا گیا۔

یہ کانفرنس قاضی محمد عدیل عباسی (بانی تحریک دینی تعلیمی کونسل) کی دعوت پر بستی میں منعقد ہوئی تھی، اس سے پہلے قاضی صاحب نے اپنے رفیق مولانا محمود الحسن صاحب کے ساتھ ”انجمن تعلیمات دین“ کے نام سے ضلعی سطح پر یہ تحریک شروع کر رکھی تھی۔ حضرت مولانا

اور مولانا محمد منظور نعمانی کی تحریک پر صوبائی سطح پر اس کو وسعت دینے کی تجویز منظور ہوئی، یہ کانفرنس اسی کے افتتاح کے لیے بلائی گئی تھی جو بڑی کامیاب ہوئی اور پورے صوبے کے ہر مکتب فکر کے معزز قائدین اس میں شریک ہوئے اور پوری تائید کی۔

اس تحریک کے تین بنیادی مقاصد طے پائے: ایک نصاب تعلیم کا مسلسل جائزہ اور اس میں سے ان نامناسب اجزاء کو نکلوانے کی کوشش جو عقیدہ و ایمان کے منافی ہوں۔ دوسرے مسلمان بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے مکاتب کا قیام جس میں درجہ پانچ تک تعلیم کا انتظام ہو اور تیسرے یہ کہ جو نچے عصری اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کے عقیدہ و ایمان کی تعلیم کا اردو میں الگ سے انتظام اور اس کے لیے صابجی و مسائی مکاتب کا قیام۔

ان ہی مقاصد کے پیش نظر حضرت مولانا نے اس تحریک کے بارے میں فرمایا تھا: ”اس تحریک کو ہم اسلام کے احیاء اور ہندوستان کے خاص حالات میں اسلامی شعور کی بیداری کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔“ (۱)

بستی کے افتتاحی اجلاس کے لیے حضرت مولانا ہی کو صدر منتخب کیا گیا تھا، اس کے لیے مولانا نے جو خطبہ صدارت تحریر فرمایا اس سے مولانا کی بصیرت، وسعت مطالعہ اور دور رس صاف ظاہر ہوتی ہے۔

خطبہ اگرچہ سفر کے دوران ٹرین میں لکھا گیا ہے لیکن اس میں حضرت مولانا نے ہندوستان کی تاریخ و ہرادی ہے۔

حضرت مولانا اس میں تحریر فرماتے ہیں :

”اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت و تہذیب کا ایک دور گزرا ہے، جو چھ سات سو برس کی طویل مدت ہے، یہ ہندوستان کی تہذیب و ترقی کا شاندار دور ہے۔ اس دور میں ملک کی ترقی و شادابی کے بہت سے ایسے کام ہوئے جن سے ہمارا ملک ابھی تک فائدہ اٹھا رہا ہے اور صدیوں تک فائدہ اٹھائے گا، اس زمانہ کے بہت سے ایسے نقش ہیں جو ہمارے ملک کی خوبصورتی اور ناموری کا باعث ہیں۔ اس دور میں سلاطین و وزراء کے حلقہ میں بھی اور شعراء و ادباء کی

محفل میں بھی اور فقراء و صوفیاء کے دائرہ میں بھی ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں جن پر ساری دنیا اور پوری انسانیت کے سامنے اس ملک کو فخر کرنے کا حق ہے، اور جن سے ساری دنیا میں اس ملک کی عظمت قائم ہے، ہم ان کی سیرت و محاسن اخلاق پیش کر کے اور ان کے کارناموں اور حالات سے نئی نسل کی تعلیم و تربیت اس کی سیرت کی تشکیل اور اس کے کردار کی تعمیر میں بڑی مدد لے سکتے ہیں، اور ہندوستان کی تاریخی عظمت کے دائرہ میں وسعت اور تنوع پیدا کر سکتے ہیں، یہ ہماری قابل فخر ملکیت ہے، جس سے ہم کو کسی طرح دست بردار نہیں ہونا چاہیے۔“ (۱)

ان تمام چیزوں کے باوجود جس طرح مسلمانوں کو نظر انداز کیا گیا، اور نصاب تعلیم میں صرف ایک ہی فرقہ کے لوگوں کو نمائندگی دی گئی، اس کا شکوہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”یہاں بعض ریاستوں میں ایک ایسا نصاب تعلیم جاری کیا گیا جس میں کھلے طریقہ پر ایسے مذہبی تصورات و روایت کی نمائندگی ہے جس سے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی مذہبی حس مجروح ہوتی ہے بلکہ وہ ان کے بنیادی اعتقادات و مسلمات سے متصادم ہے، اس فلسفہ و مذہبی تصورات و روایات کو ہم ”ہندو علم“ ”الاصنام“ یا ”ہندو میتھالوجی“ کے علاوہ کسی لفظ سے صحیح طور پر تعبیر نہیں کر سکتے۔“ (۲)

تعب اس پر ہے کہ یہ خطبہ ٹرین میں دوران سفر لکھوایا گیا، لیکن اس میں حضرت مولانا نے محکمہ تعلیم کی نصابی کتابوں سے جا بجا اقتباسات دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ یہ خالص ہندو میتھالوجی ہے، جو اس ملک کے حالات اور دستور سے ذرا بھی مطابقت نہیں رکھتی۔

حضرت مولانا نے اپنے خطبہ میں یہ شعر پڑھا
 خار وطن از سنبل وریحان خوشتر
 حب وطن از ملک سلیمان خوشتر

(۱) تکبیر مسلسل صفحہ: ۱۳۶

(۲) تکبیر مسلسل صفحہ: ۱۳۹

پھر بڑے درد کے ساتھ فرمایا :

”لیکن یہاں تو پھولوں کے ساتھ کانٹوں کا معاملہ کیا جا رہا ہے، اپنے ہاتھوں سے اپنی تاریخ کے اوراق کو چاک کیا جا رہا ہے، یا ان پر سیاہی پھیری جا رہی ہے اور اس طرح ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسا خلا پیدا کیا جا رہا ہے جو صدیوں کو محیط ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ہندوستان کے اس دور کو نمایاں اور ان کارناموں کو اجاگر کریں، ہم ہندوستان کی تاریخ کی ترتیب و تدوین میں حصہ لیں، ہم مطالبہ کریں کہ جدید تعلیم و نصاب تعلیم میں عہد قدیم کی تاریخی شخصیتوں کے ساتھ ازمنہ و سطر کی ان تاریخی شخصیتوں کو بھی جگہ دی جائے، جو ہندوستان کے لیے قابل فخر اور نوجوانوں کے لیے قابل تقلید ہیں اور جن سے ناواقفیت ایک بڑا نقص اور محرومی کی بات ہے۔“ (۱)

خطاب کے اخیر میں مسلمانوں کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلاتے ہوئے فرماتے ہیں :

”آج جس چیز کی ہم کو سب سے زیادہ ضرورت ہے اور جو تمام موانع اور رکاوٹوں پر غالب آسکتی ہے اور جس کے سامنے حالات کو سپر ڈالنی پڑے گی، ہمارا یہ فیصلہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کی دینی تعلیم کو ہر تعلیم پر مقدم رکھیں گے اور بغیر اس ضروری دینی تعلیم کے جس سے وہ اپنے پیدا کرنے والے کو، اپنے پیغمبر کو اور اپنے عقیدہ اور فرائض دینی کو پہچان سکیں، خالص رواجی یا معاشی تعلیم دلا نا گناہ اور اپنے مذہب سے بغاوت سمجھیں گے۔ اگر ہمارا یہ فیصلہ ہے اور ہم اس میں سچے ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت، کوئی ترغیب، کوئی مصلحت، کوئی تعزیر ہم کو اس صراط مستقیم سے ہٹا نہیں سکتی اور ہماری نسلوں کو اسلام کی نعمت سے محروم نہیں کر سکتی“ (۲)

پندرہ ہزار کے مجمع میں جس میں بڑے علماء اور دانشور حضرات بھی موجود تھے، حضرت مولانا کی اس پر مغز اور پر جوش تقریر نے خاص اثر کیا، اور یہیں سے دینی تعلیمی تحریک کا قافلہ

(۱) تبکیر مسلسل صفحہ: ۱۳۹

(۲) تبکیر مسلسل صفحہ: ۱۵۵

حضرت مولانا ہی کی سالاری میں رواں دواں ہوا۔

تحریک کے روح رواں جناب قاضی عدیل عباسی صاحب حضرت مولانا کے خطبہ کے بارے میں رقم طراز ہیں :

”جناب صدر نے اپنا عظیم الشان خطبہ صدارت پڑھا جس کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر کا کام کرتا تھا اور جس نے عوام اور خواص پر موجودہ حالات کی نزاکت اور مسلمان بچوں اور بچیوں کی دینی تعلیم کی ضرورت کو نقش کر دیا۔ خطبہ صدارت کے ختم ہونے پر ایک جوش سے بھر اسناٹا چھایا ہوا تھا اور ہر شخص سوچ رہا تھا کہ کتنا قیمتی وقت ضائع ہو گیا اور کس طرح اس کو جلد از جلد پورا کیا جائے۔“ (۱)

تحریک کے تین بنیادی مقاصد کا ذکر پہلے آچکا ہے، انہی خطوط پر باقاعدہ کام شروع ہوا۔ پہلے ہی خطبہ صدارت میں حضرت مولانا نے نصاب تعلیم کا ایک جائزہ پیش کیا تھا۔ کونسل کی اگلی کانفرنس میں جو بنارس میں منعقد ہوئی تھی حضرت مولانا نے بڑے جوش کے ساتھ فرمایا :

”ہم مسلمانوں نے پورے عزم کے ساتھ سوچ سمجھ کر ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے، ہمارے اس فیصلہ کو ارادۃ الہی کے سوا کوئی طاقت بدل نہیں سکتی۔ ہمارا دوسرا فیصلہ یہ ہے کہ ہم اس ملک میں اپنے پورے عقائد، دینی شعائر اور اپنی پوری مذہبی اور تہذیبی خصوصیات کے ساتھ رہیں گے۔..... ہندوستان کے دستور نے ہمیں اس ملک میں نہ صرف رہنے کی آزادی دی ہے بلکہ اس نے ہمارے رہنے کا خیر مقدم کیا ہے، وہ ہم کو ہماری خصوصیات کے ساتھ رہنے کی اجازت دیتا اور اس کا انتظام کرتا ہے۔“ (۱)

اس کے بعد مولانا نے نصاب تعلیم پر مفصل گفتگو فرمائی اور تاریخ کی روشنی میں موجودہ نصاب کے نقصانات بیان کرتے ہوئے فرمایا :

(۱) تکبیر مسلسل صفحہ: ۱۳۵

(۲) ایضاً صفحہ: ۱۵۸

”تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں آگاہی دیتا ہوں کہ یہ نصاب ہندو مذہب کی طرف سے خصوصیت کے ساتھ اور عام مذاہب کی طرف سے بالعموم بے اعتمادی، شکوک و شبہات اور تحقیر و تمسخر کا بیج بوتا ہے اور ہندوستان میں عام الحاد و دہریت کا دوازا کھولتا ہے۔

یہی وہ غلطی ہے جو یورپ میں قرون وسطیٰ میں کی جا چکی ہے، ہند جوش و ناعاقبت اندیش ”نیم خواندہ“ عیسائیوں نے مسیحی مذہب اور اس کے عقائد و روایات کو ایسی مضحکہ خیز شکل میں پیش کیا اور کائنات اور طبعیات اور زمین کے متعلق ایسے تخیلات اور روایات مذہبی رنگ میں پیش کیں، اور ان پر اصرار کیا جو تجربے و مشاہدے اور علم و مطالعہ کے خلاف تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ میں ایک عام مذہب بے زاری اور الحاد آیا، علمی حلقوں نے کلیسا کے خلاف بغاوت کرنا علم و انسانیت کی خدمت اور عقلیت اور روشن خیالی کے مرادف قرار دیا اور یورپ کا رخ اجتماعی طور پر مذہب کے بجائے مذہب بے زاری، الحاد پسندی اور تشکیک و دہریت کی طرف ہو گیا، پھر جب یورپ اپنے صنعتی و علمی تفوق اور سائنس کے زور سے دنیا کا لیڈر اور پیشوا بن گیا تو ساری دنیا میں اس کے اثر سے الحاد و دہریت کا دور شروع ہوا، جو ہمارے سامنے ہے۔ آج یہی خطرناک غلطی دانستہ یا نادانستہ طریقے پر ہندوستان میں کی جا رہی ہے، اگر یہ نصاب تعلیم چند سال اور باقی رہ گیا اور بچوں کو یہ سمجھانے کی کوشش جاری رہی کہ ہندوستان میں ہزاروں میل تک پہنچنے والی گنگا و شنو بھگوان کے پیروں سے نکل کر شیو کی بٹھا میں اور وہاں سے ہمالیہ پر بت پر آئی ہے، برہمانے راجہ بھگیرتھ کے تپ سے خوش ہو کر جانداروں کی نجات کے لیے گنگا کو زمین پر بھیجا ہے (بیسک ریڈر صفحہ ۲) اور وہ شکر جی کی جٹا میں قیام کرتی ہیں (نوبھارت اول سنسکرت صفحہ ۵) اور شیو جی کی بائیں گود میں پاربتی، سر پر گنگا اور پیشانی پر چاند، گلے میں ہش اور دل پر سانپوں کے راجہ رہتے ہیں۔ (نوپربھات دوم صفحہ ۳) تو ہندوستان کی نئی نسل

کے ذہن میں مذہب کی طرف سے یہ خیال بیٹھتا چلا جائے گا کہ مذہب کا عقل و تفکر اور مشاہدہ سے کوئی تعلق نہیں اور وہ علمی حقائق کے خلاف اوہام و خیالات اور ناقابل فہم روایات و ظلمات کا مجموعہ ہے۔ یہ ایک بڑے خطرے کی بات ہے، جس پر ہندوستان میں مذہبی فکر رکھنے والے ہر انسان کو خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو متفکر اور پریشان ہونا چاہیے۔“ (۱)

آگے ایک نئی مشکل پیش آئی کہ ۱۹۶۲ء کے وسط میں تمام بیک اسکولوں کے لیے سرکاری طور پر یہ نظام پیش کیا گیا کہ سب درجوں میں اب مذہبی تیوہار، جیتنیاں اور دیوس منائے جائیں گے، اس کے لیے کتابیں بھی تیار کی گئیں اور عملی شکل بھی مرتب کی گئی۔ یہ صورت حال مسلمانوں کے لیے بڑی خطرناک تھی، اس سے ان کے عقیدہ پر براہ راست ضرب پڑتی تھی اور ایمان کا باقی رکھنا مشکل ہو سکتا تھا۔

حضرت مولانا نے اس کے خلاف فوری طور پر ایک مضمون لکھ کر ہفت روزہ ”ندائے ملت“ میں شائع کرایا، مسلمانوں کو مخاطب کر کے حضرت مولانا نے اس میں صاف صاف کہا : ”اس سلسلہ میں جو چیز بنیادی اور اولین اہمیت رکھتی ہے وہ مسلمانوں کا خود اپنا فیصلہ، عزم اور ایثار ہے، پوری امن پسندی، دلش کی محبت، قانون کے احترام اور اپنے ملک کی بہبودی اور خیر خواہی کے جذبے اور اعتماد کے ساتھ اس بات کا کھلا ہوا اعلان کہ یہ صورت حال ہمارے لیے ناقابل برداشت ہے، اور ہم کو اپنے بچوں کا ان تعلیم گاہوں کے فوائد اور سہولتوں سے محروم رکھنا گوارہ ہے، لیکن ان کے ایمان، دینی احساسات اور شعور کو خطرہ میں ڈالنا اور شرکانہ اعمال میں شریک ہونا کسی قیمت پر گوارہ نہیں۔ بس یہ اجتماعی فیصلہ بڑی سے بڑی صورت حال کو تبدیل کر سکتا ہے۔“ (۲)

۲۰ جولائی ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں حضرت مولانا کا مضمون شائع ہوا، ۲۱ جولائی کو کونسل کا وفد دوسری مرتبہ وزیر تعلیم سے ملا تو معلوم ہوا کہ اس نظام کی منسوخی کے احکامات

(۱) یکمیر مسلسل صفحہ: ۱۶۹-۱۷۱

(۲) ایضاً صفحہ: ۲۳۰

جاری کر دئے گئے ہیں۔ یہ تحریک کی پہلی بہت بڑی کامیابی تھی۔ حضرت مولانا نے لکھا کہ ”کونسل کے لیے یہ نیک فال ہے کہ اس کے وجود میں آنے کے بعد جو تعلیمی میدان میں پہلا مسئلہ اٹھا وہ خلاف توقع بغیر کسی خرابی کے حل ہو گیا۔“

نصاب تعلیم کے جائزہ کا کام کونسل کی طرف سے مسلسل ہوتا رہا، اور جب بھی کوئی بات سامنے آئی کونسل نے اس کا نوٹس لیا، اس طرح یہ ایک بڑی اہم ضرورت تھی جو پوری ہوئی۔

اس کی سب سے بڑی اور آخری مثال ”وندے ماترم“ کے سلسلہ میں حضرت مولانا (صدر کونسل) کا انقلابی بیان ہے، صوبائی وزیر تعلیم کی طرف سے سرکاری اسکولوں کے لئے یہ مشرکانہ ترانہ لازم قرار دیا گیا، مسلمانوں کے لیے یہ ایک لمحہ فکریہ تھا، میڈیا کے نمائندے حضرت مولانا کے پاس آئے اور اس سلسلہ میں سوال کیا، تو حضرت مولانا نے فرمایا کہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو منسوخ کرنے کے لیے احکامات جاری کرے، نمائندوں نے اس پر پوچھا کہ اگر حکومت ایسا نہیں کرتی تو آپ کیا کریں گے؟ حضرت مولانا نے فرمایا: ”یہ مسئلہ ایمان و عقیدے کا ہے ہم مسلمانوں کو مشورہ دیں گے۔ کہ وہ اپنے بچوں کو اسکولوں سے نکال لیں۔“ یہ بیان کیا تھا اللہ کے ایک محبوب بندے کا فرمان تھا۔ جس کے پاس نہ طاقت نہ حکومت ایک کمزور ناتواں لیکن ایمان کی طاقت نے ہمیشہ ہر طاقت کو پاش پاش کیا ہے۔ حکومت ہل گئی وزیر موصوف کو برطرف کیا گیا۔ احکامات واپس لئے گئے۔ اور ”یومنذ یفرح المؤمنون“ کا ظہور ہوا۔

کونسل کا دوسرا اہم کام مکاتب اسلامیہ کا قیام تھا جس کی تجویز افتتاحی اجلاس میں منظور ہو چکی تھی اور اس میں یہ طے کر دیا گیا تھا کہ درجہ پنجم تک سرکاری اسکولوں کے معیار کے مطابق جا بجا مکاتب قائم کئے جائیں اور سرکاری اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے لیے شبینہ با صباچی خود کفیل مکاتب کھولے جائیں، اور مسلمان خود اپنے ایسے اسکول کھولیں جن میں دینی تعلیم کا بھی انتظام ہو۔ کونسل کی طرف سے سرکاری سطح پر یہ کوشش کی گئی کہ درجہ پانچ کے بعد چھٹے درجہ کے داخلہ میں دشواری نہ ہو، ایک طویل جدوجہد کے بعد حکومت کی طرف سے اس کو منظور کیا گیا۔

یہ تحریک پورے زور شور سے چلی اور صوبہ اتر پردیش کے مختلف شہروں میں اس کے

جلے کیے گئے، حضرت مولانا کو اس کی ایسی لگن تھی کہ بڑے بڑے کاموں پر اس کو فوقیت دیتے تھے، اپنی ایک تقریر میں اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا :

”ہم سب کا فرض ہے کہ اپنی اس تحریک کو اپنے ذہن و دماغ کی پوری صلاحیتوں اور صحیح جوش و جذبہ کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچانے کے تازہ دلولہ کے ساتھ پختہ عزم کریں، اپنی اس تحریک کو اپنے وجود کا اصل مقصد، زندگی کا نصب العین اور دین و دنیا کی نجات کا واحد ذریعہ تصور کریں۔“ (۲)

اس تحریک کا مقصد حضرت مولانا کو عزیز تھا، وہ سمجھتے تھے کہ اس ملک میں مسلمانوں کا تحفظ و بقا اسی پر منحصر ہے، اسی لیے دوسری ریاستوں میں بھی حضرت مولانا نے اس کا آواز بلند کیا اور اس کی دعوت دی کہ جگہ جگہ دینی تعلیم کے مراکز قائم کیے جائیں تاکہ پورے ملک میں کہیں بھی مسلمان دینی تعلیم سے محروم نہ رہیں۔

حضرت مولانا کی اس فکر و کوشش کے نتیجہ میں پورے ملک کے طول و عرض میں ہزاروں مکاتب قائم ہوئے، سیکڑوں مدارس کی بنیاد ڈالی گئی اور لاکھوں انسانوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔

عالمی سطح پر فکر و کوشش

حضرت مولانا رحمۃ اللہ کی یہ فکر و سعی صرف ملک تک محدود نہیں تھی، مولانا کا ذہن عالمی سطح پر سوچتا تھا، پوری امت کا درد و فکر وہ اپنے سینہ میں لیے ہوئے تھے، وہ جس ملک میں گئے وہاں انہوں نے تعلیمی اداروں، دانش گاہوں اور یونیورسٹیوں کو دیکھا اور ان کے ذمہ داروں کو قیمتی مشورے دیئے۔

مصر کے پہلے سفر میں مولانا از ہر تشریف لے گئے۔ شیخ الازہر سے ملاقات کے دوران ”جامع ازہر“ کے سلسلہ میں تبادلہ خیال فرمایا، خود شیخ کو اس کی افادیت و اہمیت کا اندازہ ہو گیا تو انہوں نے حضرت مولانا سے درخواست کی کہ وہ اس سلسلہ میں ایک مفصل یادداشت تحریر فرما کر ذمہ داروں کو دے دیں۔ حضرت مولانا نے وہ عرضداشت شیخ محمد شلتوت کے

حوالہ فرمادی۔

”جامعہ اسلامیہ“ مدینہ منورہ کی تاسیس میں حضرت مولانا شریک رہے اور ہر موقع پر اس کے ذمہ داروں کی رہنمائی فرماتے رہے، اس کے علاوہ بھی سعودی عرب کے نظام تعلیم کے سلسلہ میں وزیر تعلیم کو متعدد مرتبہ توجہ دلائی اور قیمتی مشورہ دیئے۔ اس کا تفصیل سے ذکر باب دوم میں ہو چکا ہے۔

جامعہ دمشق کے ذمہ داروں کو بھی حضرت مولانا سے خاص تعلق تھا، وہ چاہتے تھے کہ مولانا وہاں مستقل قیام اختیار فرمائیں۔ حضرت مولانا نے اس کو منظور نہیں فرمایا لیکن وزیننگ پروفیسر کی حیثیت سے تشریف لے گئے اور یونیورسٹی کے اساتذہ و طلبہ اور ذمہ داروں کے سامنے محاضرات دئے۔

اسی طرح مختلف تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں میں تشریف لے گئے اور وہاں کے حالات و ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے ذمہ داروں کو ضروری مشورہ دیئے۔

حضرت مولانا کی تحریروں میں اس موضوع پر بڑا قیمتی مواد موجود ہے جس سے مختلف ملکوں میں فائدہ اٹھایا گیا۔ سری لنکا میں ”الجامعة النظیمیة“ کی بنیاد ہی مولانا کے فکر انگیز اور مؤثر مضمون ”ردة ولا ابا بکسر لها“ (نیا طوفان اور اس کا مقابلہ) سے متاثر ہو کر رکھی گئی۔ حضرت مولانا تقسیم اسناد کے اس کے پہلے جلسہ میں شریک ہوئے اور اپنے دست مبارک سے اسانید تقسیم کیں۔

مولانا کے نزدیک اسلام کی علمی تحریک کی خصوصیات

علم اسلام کے خمیر میں داخل ہے اور سب پہلی وحی جو نازل ہوئی اس میں پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اور قلم کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے علوم کی سرپرستی فرمائی اور آپ ﷺ کی تعلیمات ہی کے اثر سے مسلم علماء نے علم کی تحریک چلائی اور اس کے لیے بڑی جانفشانی اور قربانی سے کام لیا۔ حضرت مولانا نے مسلم علماء کے زیر اثر اس علمی تحریک کی پانچ خصوصیات بیان فرمائی ہیں: پہلی خصوصیت اس کی آفاقیت اور نسل انسانی سے اس کا عمومی تعلق ہے، علم کو کسی نسل و قوم کے ساتھ مخصوص نہیں کیا گیا اور اس میں یہود کے ”بنی لاوی“ اور ہنود کے

برہمنوں جیسا حق کسی کو نہیں دیا گیا وہ ہر ایک کے لیے ایک عمومی حق اور دولت مشترکہ ہے۔
 مولانا نے اس کی دوسری خصوصیت ”عوامیت اور عمومیت“ بیان فرمائی ہے اور مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ مسلمان علماء نے کس طرح علم کی اشاعت کے لیے قربانی دی اور علم کو گھر گھر پہنچانے کی فکر کی۔

مولانا کے نزدیک اس کی تیسری خصوصیت ”حرکت“ ہے۔ اس کے لیے مولانا نے مطالعہ و جستجو اور تحقیق میں علماء کی جانفشانیوں کا ذکر کیا ہے اور حصول علم کے لیے طویل طویل مسافتوں کو قطع کرنے کی مثال دی ہے۔

چوتھی خصوصیت ”عزیمت و جواں مردی“ ہے۔ مسلمان علماء نے ہمیشہ کلمہ حق کو اپنا شعار بنایا ہے، نہ ظالم و جابر حکمرانوں کا خوف ان کے لیے رکاوٹ بن سکا اور نہ معاشرہ کا دباؤ۔

پانچویں خصوصیت حضرت مولانا نے اسلام کی علمی تحریک کی یہ بیان فرمائی ہے کہ اس نے ہمیشہ ”علم نافع“ پر خصوصی توجہ اور زور دیا ہے، ایسا علم جو ہدایت کا حامل، نجات کا ضامن، آخرت میں مفید ہو۔ یہی وہ علم ہے جس پر انسانی سعادت و نجات موقوف ہے، اسی کے ذریعہ وہ اپنے خالق کی معرفت حاصل کرتا ہے، آخرت کی سعادت و شقاوت کے اسباب کو جانتا ہے۔

”انسانی علوم کے میدان میں اسلام کا انقلابی و تعمیری کردار“ کے عنوان سے مولانا نے بڑا پر مغز مقالہ تحریر فرمایا ہے، جس میں مولانا نے یونانی، ایرانی اور ہندوستانی فلسفہ و تمدن کے کردار کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے اور اس میدان میں اسلام کے تعمیری و انقلابی کردار کا تفصیلی جائزہ پیش فرمایا ہے اور اس کے اخیر میں اسلام کی عالمگیر علمی تحریک کی خصوصیات بیان فرمائی ہیں۔ مولانا کی یہ کتاب بھی بڑی چشم کشا اور بصیرت افروز ہے اور ہر صاحب فکر کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

مولانا کے تعلیمی نظریات

حضرت مولانا علم کی ”وحدت“ کے قائل ہیں، وہ علم کی دینی و دنیوی تقسیم کو بھی مناسب

نہیں سمجھتے۔ اپنی ایک تقریر میں وہ فرماتے ہیں :

”میرا عقیدہ ہے کہ علم ایک اکائی ہے جو بٹ نہیں سکتی، اس کو قدیم و جدید، مشرقی و مغربی، نظری و عملی میں تقسیم کرنا صحیح نہیں اور جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے
ع دلیل کم نظری قصہ جدید و قدیم

میں علم کو ایک صداقت مانتا ہوں جو خدا کی وہ دین ہے جو کسی ملک و قوم کی ملک نہیں اور نہ ہونی چاہیے، مجھے علم کی کثرت میں بھی وحدت نظر آتی ہے، وہ وحدت سچائی ہے، سچ کی تلاش ہے، علمی ذوق ہے اور اس کو پانے کی خوشی ہے۔“ (۱)

مولانا نے اس کی کھل کر دعوت دی ہے کہ علوم کو دین کی سرپرستی حاصل دینی چاہیے اور جب بھی علم نے دین سے اپنا رشتہ توڑا تو اس میں توازن باقی نہ رہ سکا اور وہ علم انسانیت کے لیے بارگراں بن گیا یورپ کے عدم توازن کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس نے علم کے رشتہ کو دین سے کاٹ دیا۔ مولانا کی نظر میں اسلام کا امتیاز ہے کہ اس کو علم کے ساتھ مربوط کر دیا گیا ہے، نہ دین کو علم سے الگ کیا جاسکتا ہے اور نہ علم کو دین سے۔ اپنی ایک تقریر میں فرماتے ہیں :

”اس دین کا مزاج بتا دیا گیا کہ یہ دین علم سے کبھی الگ نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ سب سے پہلے جو پیغام دیا گیا اس میں خود کہا گیا کہ ”پڑھو“ مسلمان بے پڑھے کیسے رہ سکتا ہے؟ اوہ مسلمان حقیقی مسلمان نہیں جو علم سے اپنا رشتہ توڑے، وہ اسلام کا صحیح نمائندہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا“ (۲)

آگے فرماتے ہیں :

”پہلی انقلاب انگیز دعوت ”اقرا“ (پڑھو) کی ہے (اور دوسری بنیادی بات یہ ہے) کہ ”باسم ربک الذی خلق“ اپنے رب کے نام سے پڑھو، اس کی رہنمائی میں یہ سفر شروع کرو، اس لیے کہ یہ سفر بہت پر پیچ ہے، پر خطر ہے، قدم قدم پر قافلے لوٹنے والے ہیں، قدم قدم پر بڑی بڑی کھائیاں ہیں، قدم قدم پر گہرے دریا ہیں، قدم قدم پر سانپ اور بچھو ہیں، اس لیے اس میں ایک رہبر کامل کی رفاقت ہونی چاہیے اور وہ رہبر کامل حقیقتاً خدا کی ذات

ہے۔“ (۱)

مولانا کا خیال یہ ہے کہ جب علم و دین کی تفریق ہوئی، دنیا کو اس کا نقصان اٹھانا پڑا، جب تک علم اسلام کے سایہ میں پروان چڑھتا رہا دنیا آگے بڑھتی رہی، اور جس دن مسلمانوں نے اس کو دین سے الگ کر دیا اور دین و دنیا میں تفریق کر دی گئی وہ دن دنیا کے لیے بڑا نامبارک ثابت ہوا، مسلمان قیادت کے منصب سے پیچھے کر دیئے گئے اور دنیا اسلام کی متوازن اور عادلانہ تعلیمات سے محروم ہو گئی۔

کراچی یونیورسٹی میں اساتذہ و طلباء کو خطاب کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں :

”میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی یونیورسٹیوں اور ان اسلامی جامعات کا ایک فرض تو یہ ہے کہ علم و دین میں وہ خلیج پیدا نہ ہونے دیں جو مسیحی یورپ میں یا ان مذاہب میں جن کا علم و عقل کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں تھا پیدا ہو گئی تھی۔“ (۲)

حضرت مولانا نے اس کی پرزور دعوت پیش کی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے نظام تعلیم میں خاص طور پر اپنے عقیدہ اور دینی فکر کا خیال رکھنا ضروری ہے، ورنہ دینی نقصان کے علاوہ ان کو اس کا ایک بڑا نقصان یہ پہنچے گا کہ نوجوانوں اور تعلیم یافتہ لوگوں کی ساری توانائیاں تخریب میں صرف ہوں گی اور شاید ان کو تعمیر کا موقع ہی نہ مل سکے۔

مغربی نظام تعلیم اور مسلمانوں کی ذمہ داری

ماہرین تعلیم کا اس پر اتفاق ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد نئی نسل کو قومی خصوصیات و روایات سے آشنا کرانا اور ان پر اعتماد بحال کرنا ہے، برطانیہ کے ماہرین تعلیم نے اس کو معاشرہ کی اہم ضرورت قرار دیا ہے۔

حضرت مولانا عہد حاضر کے ماہرین تعلیم کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں :

”تعلیم کوئی ایسا تجارتی سامان نہیں ہے جو درآمد کیا جاسکے مثلاً مصنوعات، خام مال، وہ ایجادات و ضروریات جو کسی ملک اور علاقہ کے ساتھ مخصوص نہیں، وہ ایسا لباس ہے جو ان اقوام کے قد و قامت اور جسامت کے

ٹھیک ناپ کے مطابق تراشا اور سیا جاتا ہے۔“ (۱)

یورپ نے اپنی روایات اور اصولوں کو اپنے نظام تعلیم میں جاری کیا، اور وہ اس تعلیمی پالیسی پر سختی سے کاربند رہا کہ کوئی چیز باہر سے نہ آنے پائے، لیکن یورپ کے سامراجی نظام کے بعد جب مشرق نے مگر بی نظام تعلیم کو بے چوں و چرا تسلیم کر لیا (۲) تو مشرقی روایات کا اس سے زبردست ٹکراؤ ہوا، اور ان ملکوں میں ایک کشمکش کی فضا پیدا ہو گئی، اسلامی ملکوں میں قدرتی طور پر یہ کشمکش زیادہ وسیع پیمانہ پر اور شدت کے ساتھ پیدا ہوئی، جس کے نتیجے میں باہمی منازعات اور چھوٹی بڑی خانہ جنگیاں وجود میں آئیں اور ساری صلاحیتیں اس میں ضائع ہونے لگیں۔ حضرت مولانا نے اس کو ایک جگہ اپنی تقریر میں وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ اس کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے، اور اس کا حل بھی پیش کیا، وہ فرماتے ہیں :

”جہاں تک اسلامی ممالک کا تعلق ہے، وہاں یہ کشمکش اور عجیب تضاد

بڑے وسیع پیمانہ پر اور مختلف سطح پر پایا جاتا ہے۔ وہاں ایک طرف حکومت اور جمہور میں کشمکش ہے تو دوسری طرف اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کم پڑھے لکھے یا ناخواندہ لوگوں میں رسہ کشی ہے اور تیسری طرف دیندار، آزاد خیال اور ترقی پسند افراد دست و گریباں ہیں، اور یہ سب نتیجہ ہے اس نظام تعلیم کا جو مغربی ملکوں سے درآمد کیا جا رہا ہے یا مغربی ذہن اور نظام تعلیم کے خطوط پر ان ملکوں میں تیار کیا جا رہا ہے، اور اس کے نتیجے میں ایک ایسی نسل پیدا ہو رہی ہے جو ان عقائد اور حقائق کو پوری طرح ہضم اور قبول نہیں کر پاتی جن پر اس کے معاشرہ اور اس امت کی بنیاد ہے، اس لیے کہ یہ نظام تعلیم جس طرح کے خیالات کی آبیاری اس کے دل و دماغ میں کرتا ہے وہ ان حقائق اور عقائد سے کھلے طور پر متصادم ہیں جو اس معاشرہ کے لیے ناگزیر ہیں، کبھی خارق عادت طریقہ پر یا کسی بیرونی اثر سے وہ اس کو قبول کرتی ہے تو لازماً اس کے نتیجے میں یہ نظام تعلیم ضرور کمزور

(۱) خطبات علی میاں صفحہ : ۳۶۷/۱

(۲) یہ سب کچھ باقاعدہ پلاننگ کے تحت ہوا، انہوں نے یہ حقیقت سمجھ لی تھی کہ تعلیم سے ذہن بدلے جاسکتے ہیں مشہور مستشرق ”جب“ لکھتا ہے کہ مغربی ذہن بنانے کے لیے سب سے مؤثر ہتھیار تعلیم ہے۔ الغزو

پڑتا ہے لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

جب یہ طبقہ اس نظام کی آغوش میں تربیت پا کر نکلتا ہے تو قوم کے عقیدے، خیالات اور جذبات سے اس کی کشش شروع ہو جاتی ہے۔ اگر وہ قوی الارادہ ہوتا ہے تو وہ رجعت پسندی کے بلبے کو (جیسا کہ اس طبقہ کے افراد یہ اصطلاح استعمال کرتے ہیں) راستے سے ہٹا کر اپنی قوم و ملک کو ماضی کے بارگراں سے رہائی بخشنا چاہتا ہے۔ اس موقع پر ایک ایسی طویل کشش برپا ہوتی ہے جس پر ملت کی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں بے دریغ خرچ ہوتی ہیں اور اندرونی خانہ جنگیوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو بیرونی جنگوں سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ یہ ان ممالک کے قصے ہیں جہاں ایسی قیادتیں برسرِ اقتدار تھیں جو انقلابی، قوم پرستانہ اور لادینی فلسفوں پر یقین رکھتی تھیں۔

اگر اس طبقہ کی قوت ارادی کمزور ہوتی ہے اور وہ طاقتور شخصیت سے محروم ہوتا ہے تو وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کے اندر عقائد اور مقاصد کی طرف سے دلی نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ آئے دن اس کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتا ہے، غیر ملکوں اور بیرونی طاقتوں سے ساز باز کر لیتا ہے اور عوام کے قومی جذبہ اور دباؤ اور علماء و دعوت دین کے علمبرداروں کے اثر و رسوخ سے پہلی فرصت میں چھٹکارا حاصل کر لینا چاہتا ہے، چنانچہ اس کے نتیجے میں غداری کے واقعات بار بار رونما ہوتے ہیں اور یہ ممالک مستقل طور پر بے یقینی، خوف و دہشت، ذہنی انتشار اور شبہ و بے اعتمادی کی فضا میں رہتے ہیں۔

اس غیر فطری اور غیر ضروری صورتحال سے چھٹکارا پانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ اس پورے تعلیمی نظام کو یکسر تبدیل کر دیا جائے اور اس کو ختم کر کے نئے سرے سے ایک نیا نظام تعلیم تیار کیا جائے جو اس ملت اور امت کے قد و قامت پر راست آتا ہو اور اس کی دینی و دنیاوی ضروریات پوری کر سکتا ہو۔ یہ عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ، اس کی سب سے اہم اور ناگزیر ضرورت، وقت کی آواز اور اسلامیانِ عالم کا سب سے بڑا فرض ہے۔

اس مسئلے کا حل، خواہ وہ کتنا ہی دشوار نظر آ رہا ہو اور صبر آزما اور دقت طلب ہو، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظام تعلیم کو از سر نو ڈھالا جائے اور اس کو امت مسلمہ کے عقائد، زندگی کے نصب العین، مقاصد اور ضروریات کے مطابق بنایا جائے اور اس کے تمام اجزاء سے مادیت، خدا سے سرکشی، اخلاقی و روحانی قدروں سے بغاوت اور جسم و خواہشات کی پرستش سے نکال کر پوری انسانیت پر شفقت کی روح اس میں جاری و ساری کر دی جائے، اس مقصد کے لیے زبان و ادب سے لے کر فلسفہ اور علم النفس تک، اور علوم عمرانیہ سے لے کر اقتصادیات اور معاشیات تک صرف ایک روح پیدا کرنا ہوگی، مغرب کے ذہنی غلبہ اور تسلط کا خاتمہ کرنا ہوگا، اس کی قیادت و امامت کا انکار کرنا پڑے گا، اس کے علوم و نظریات و علمی تحلیل و تجزیہ اور بے لاگ تنقید کا مسلسل اور جرأت مندانہ رد عمل ظاہر کرنا ہوگا اور یہ ثابت کرنا ہوگا کہ مغرب کی کامیابیوں اور پیش قدمیوں نے انسانیت اور تہذیب کو کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے۔

اس کے علوم کے ساتھ مواد خام کا سامنا کرنا ہوگا اور اس سے وہ چیزیں تیار کرنا ہوں گی جو ان قوموں اور ملکوں کی اپنی ضروریات، رجحانات اور ان کے عقیدہ و تہذیب سے ہم آہنگ ہوں۔

اس راہ میں اگرچہ بہت سے سنگ گراں ہیں اور نتائج بھی بہت تاخیر سے ظاہر ہو سکتے ہیں لیکن تجدید پسندی، آزاد خالی اور مغرب کی ذہنی غلامی کی اس طوفانی موج کو روکنے کا یہی واحد طریقہ ہے جس نے عالم اسلام کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلا کر رکھ دیا ہے اور اسلام کے فکری و اجتماعی ڈھانچہ اور ملت ابراہیمی کے شیرازہ کے لیے ایک پتیلنج بن گئی ہے، اور جس کے نتیجے میں مسلم اقوام کے پر جوش اسلامی جذبات، ان کی سادہ دلی اور گرم جوشی، ان کی قربانیاں اور سرفروشاں اور اخلاص و وفا کی قیمتی سوغات (جس کا ان حکومتوں کے قیام اور غیر ملکی اقتدار سے آزادی میں سب سے بڑا اور براہ راست دخل ہے) افرنگی اور مغربیت کے تنور کی حقیر ایندھن بن رہی ہے۔ سادہ لوح، بے

زبان، سچے اور مخلص مسلم عوام خاموشی اور سکون کے ساتھ بکریوں کے ریوڑ کی طرح نامعلوم منزل کی طرف ہنکائے جارہے ہیں، اور یہ طبقہ ان کی قسمت کا مالک بن گیا ہے۔

کیا آج کوئی اسلامی ملک، کوئی اسلامی حکومت اور کوئی بڑی اسلامی یونیورسٹی اس آواز پر لبیک کہہ سکتی ہے، اور اپنی ساری کوششیں، توجہات اور ذرائع و وسائل اس اہم تعمیری اور انقلابی آغاز پر مرکوز کر سکتی ہے، جو بالآخر عالم اسلام کو سب سے بڑے خطرہ اور چیلنج سے بلکہ مکمل تخریب کے اس عمل سے (جو جاری ہے اور جس سے زیادہ عمومی، ہمہ گیر، اور دور رس قومی تباہی و بربادی اقوام و مذاہب اور تہذیب و تمدن کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی) بچا سکتی ہے؟ (۱)

کرنے کا کام

موجودہ نظام تعلیم جو مغرب کا پروردہ ہے اس کی خرابیاں مولانا کے سامنے ہیں اور حضرت مولانا کا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کی اصل ذمہ داری تو یہ ہے کہ اپنا نظام تعلیم جاری کریں اور ایسی دانش گاہیں قائم کریں جہاں تعلیم اسلامی فکر کے ساتھ دی جائے تاکہ ٹکراؤ کی صورت حال پیدا نہ ہو سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا نے یہ دعوت بھی پیش کی ہے کہ یہ ادارے معیاری اور بلند سطح کے ہوں۔ ایک تقریر میں اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں :

”بڑی نیکی کا کام یہ ہے کہ آپ اس نئی نسل کو بچائیں اور ایسے معیاری اسکول قائم کریں جن کا انتظام جن کے اساتذہ کی سطح یعنی کوالیفیکیشن (Qualification) ان کا تجربہ کسی طرح دوسرے اسکولوں سے کم نہ ہو۔“ (۲)

مزید فرماتے ہیں :

”اس کا ڈسپلن، رکھ رکھاؤ اس کی صفائی، اور اس کا نظم و نسق ہر طرح سے ایسا ہو کہ کھاتے پیتے لوگ اور جن کا معیار زندگی بلند ہے وہ اپنے بچوں کو وہاں بھیجنے

(۱) خطبات ملی میاں جلد ۶-صفحہ ۳۷۲ تا ۳۶۹

(۲) تھذا انسانیت صفحہ ۸۳

میں ذرا بھی تامل نہ کریں۔“ (۱)

حضرت مولانا کا یہ بھی خیال ہے کہ: اگر یہ فوری طور پر ممکن نہ ہو سکے خاص طور پر ایسے ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں تو اس کی فکر ضروری ہے کہ اس نظام تعلیم سے فائدہ اٹھانے والوں کے لیے تصحیح عقائد اور تصحیح فکر کا الگ سے انتظام کیا جائے، اس کے لیے صبحی مسائی مکاتب قائم کیے جائیں، تاکہ وہاں ان طلبہ کی ذہن سازی ہوتی رہے اور وہ اپنے نظام معاشرت و اخلاق سے دور نہ ہو سکیں اور ان کے عقیدہ اور فکر پر کوئی ڈاکہ نہ ڈال سکے۔

اس کے لیے حضرت مولانا نے ایک اور خاکہ اسلامی اقامت گاہوں (Hostels) کا پیش کیا ہے۔ اسلامی فکر رکھنے والوں پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ وہ عصری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھنے والے طلبہ کے لئے بڑے بڑے شہروں میں ایسے ہاسٹلس قائم کریں جہاں طلبہ اقامت اختیار کر سکیں اور وہاں ان کی ذہنی و فکری داخست پر داخست کا خیال رکھا جائے اور یہ کوشش کی جائے کہ ان کے ذہن اسلامی فکر کے سانچے میں ڈھل جائیں، اس کے لیے ایسے تربیت دینے والے رکھے جائیں جو ان کی ذہن سازی (Brain washing) کر کے اسلام پر ان کے اعتماد کو طاقتور بنائیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں حضرت مولانا کا یہ خیال بہت ٹھوس اور مضبوط فکر کا نتیجہ ہے جس میں مولانا کے وسعت مطالعہ اور نتائج نکالنے کی خداداد صلاحیت کا خاص حصہ ہے، اور موجودہ حالات میں یہی نظریہ تعلیم مفید اور نتیجہ خیز ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے حضرت مولانا کی اس فکر میں رنگ بھرنے کی ضرورت ہے اور ایسے باجمیت اور باشعور اور باصلاحیت افراد کی ضرورت ہے جو اس کے لیے آگے آئیں اور عملی قدم اٹھائیں۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کا کریم (Cream) ضائع ہونے سے بچ سکے گا اور اس کی توانائیاں جو اسلام کے خلاف صرف ہونے لگی ہیں وہ اسلام کے حق میں استعمال ہوں گی، اور جب تک اس طبقہ کا اعتماد دین پر بحال نہیں ہوگا، اس وقت تک بہت مشکل ہے کہ مسلمان دنیا کی قیادت و امامت کے منصب پر دوبارہ فائز ہو سکیں۔



﴿باب پنجم﴾

پیام انسانیت اور ملکی اصلاحات کی فکر و کوشش

داعی کی اولین ضرورت

ایک داعی کے لیے یہ اولین فکر و توجہ کی بات ہے کہ وہ اپنی دعوت کے لیے زمین ہموار کرے اور پیش آنے والی ان رکاوٹوں کو دور کرے جو اساسی اور بنیادی کبی جاسکتی ہیں، خاص طور پر جس ملک میں اس کو رہنا ہے، اور وہاں رہ کر اپنی دعوت و فکر پیش کرنی ہے، اس ملک اور وہاں کے باشندوں سے صرف نظر کر کے وہ کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا اور جگہ جگہ اس کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، اگر اس ملک میں اکثریت کا تعلق کسی دوسرے مذہب یا مکتب فکر سے ہو تو یہ ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے۔

حضرت مولانا کو دعوت کی جو بصیرت اور فہم و ادراک حاصل ہوا تھا، اس سے انہوں نے شروع ہی میں یہ حقیقت سمجھ لی تھی، اور اپنی دعوتی زندگی کے آغاز ہی میں مولانا نے اس کی کوششیں شروع فرمادی تھیں، مخلوط اجتماعات سے خطابات اور اس کے لیے مختلف علاقوں کے دورے اور تقریریں اسی کا حصہ تھیں، عرصہ کے بعد اس کو باقاعدہ تحریکی شکل میں ”پیام انسانیت“ کے عنوان سے حضرت مولانا نے شروع کیا جس کا پورے ملک پر اثر پڑا اور یہاں کی فضا میں جو تہوج اور مزاجوں میں جو اشتعال پسندی اور جذباتیت و سطحیت پیدا ہونے لگی تھی اس میں فرق پڑا، حالات نارمل ہونے لگے اور لوگوں میں سننے سمجھنے اور غور کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔

دل پر ایک چوٹ

حضرت مولانا کا گھرانہ اصلاً مصنفین کا گھرانہ تھا، خود مولانا کو یہ ذوق و رشتہ میں ملا تھا،

ان کی سیکڑوں تصنیفات اس پر شاہد ہیں۔ متعدد مرتبہ مولانا نے یہ بات فرمائی کہ ”لکھنے پڑھنے کا کام میں اپنے ذوق سے کرتا ہوں، کتنی ہی دیر اس میں لگے قعب کا احساس نہیں ہوتا، اس کے علاوہ میں جو بھی کام کرتا ہوں وہ ضرورہ کرتا ہوں، اور اس میں میری طبیعت پر بوجھ پڑتا ہے۔“ لیکن اس کے باوجود حضرت مولانا نے ”وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل“ کو ترجیح دی۔ تصنیف و تالیف کے کام کے ساتھ جو مسلسل جاری رہتا تھا، شروع ہی سے دعوتی و تحریکی زندگی اختیار کی، اور اس کو وقت کی ضرورت اور ملت کا تقاضا سمجھا، ابتداء میں دعوت و تبلیغ کے لیے طویل طویل دورے فرمائے، مہینوں مسلسل سفر میں گزارے، بیماری اور صحت کی کمزوری کے باوجود اس میں ذرا بھی کمی نہیں ہوئی۔

اسی زمانہ میں حضرت مولانا نے یہ محسوس فرمالیا کہ اتنے لمبے چوڑے ملک میں اکثریت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، ورنہ یہ ساری دعوتی کوششیں نقش بر آب ثابت ہوں گی۔ حضرت مولانا کا احساس یہ تھا کہ اگر اکثریت غلط راستے پر پڑ گئی تو ملک بھی خطرہ میں ہے اور ملت کو بھی بڑی آزمائش سے گزرنا پڑ سکتا ہے۔ یہ آزادی سے پہلے کا دور تھا۔ حضرت مولانا کا یہ بھی خیال تھا کہ ملک کے آزادی کے لیے مسلمانوں کو ہی قیادت کرنی چاہیے اور آگے آنا چاہیے تاکہ آزادی کے بعد وہ آزادانہ اپنے حقوق لے سکیں۔ الغنم بالغرم (نقصان اور تاوان کے بقدر نفع اور یافت ہوتی ہے) کا اصول مولانا کے سامنے تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء میں کانگریس نے ”ہندوستان چھوڑو“ کا رزلوشن پاس کیا اور آندولن کا آغاز ہوا اور زیادہ تر عوامی سطح پر ہندو ہی سامنے آئے تو حضرت مولانا کو بڑے خطرہ کا احساس ہوا اور دل پر ایک چوٹ لگی کہ اگر آج ملک کی آزادی میں دوسرے فرقہ کے لوگوں نے ہی قربانیاں دیں اور وہی دارورسن کا نشانہ بنے تو کل آزادی کے بعد مسلمان سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہ رہیں گے۔

ایسے دور رس خطرہ کا احساس اور یہ دور اندیشی اور وہ بھی عمر کے اس دور میں کہ جب عام طور پر آدمی کو دور کی باتیں دیر میں سمجھ میں آتی ہیں، اور کم ہی ذہن وہاں تک رسائی حاصل کر پاتا ہے، یہ محض اللہ کا فضل تھا، اور تاریخ کا مطالعہ مولانا نے جس نظر سے کیا تھا اور اس سے نتائج نکالنے کی ان کو جو خدا واد صلاحیت ملی تھی یہ اس کا نتیجہ تھا، یہیں سے ”تحریک پیام انسانیت“ کا

بچ پڑ گیا جو بعد میں برگ و بار لایا۔

ملک کی آزادی کے بعد جب کہ ایک ایسی جابر حکومت کا خاتمہ ہوا تھا جس نے مزارعوں میں بد اخلاقی کے بیج بودیئے تھے اور سماج کی خبر لینے کا پورا موقع یہاں کے قائدین کو نہیں مل سکا تھا، ملک تیزی سے اخلاقی انارکی کی طرف بڑھنے لگا، رشوت ستانی عام ہو گئی، ہر طاقتور کمزور کو دبانے کی فکر میں لگ گیا۔ حضرت مولانا نے اس وقت اپنی تحریروں اور تقریروں میں پورے ملک کو اس کی طرف توجہ دلائی، اور ان حالات پر سخت تشویش کا اظہار کیا۔ اسی زمانہ میں مولانا نے ایک مضمون ”ہندوستانی سماج کی جلد خبر لیجئے“ کے عنوان سے تحریر فرمایا تھا، جس کا ہندی اور انگریزی ترجمہ اس وقت کے تمام سربراہان اور سیاسی رہنماؤں اور مختلف ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کو بھیجا گیا تھا۔

لیکن بہر حال یہ ایک انفرادی کوشش تھی، حضرت مولانا اپنے طور پر اس کو ضروری سمجھ کر انجام دیتے تھے، اس کو باقاعدہ کسی تحریک کی شکل حاصل نہ تھی، باقاعدہ تحریک بنا کر اس کا سلسلہ ۱۹۵۴ء کے آغاز سے مخلوط اجتماعات کی شکل میں شروع کیا گیا، جس کی کچھ تفصیل آگے پیش کی جاتی ہے:

مخلوط اجتماعات

۱۹۴۰ء کے آغاز میں حضرت مولانا نے نظام الدین (۱) کا پہلا سفر کیا، اور وہیں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے پہلی ملاقات ہوئی۔ مولانا نے پہلی ہی ملاقات میں بڑی محبت و اپنائیت اور اکرام و اعتماد کا معاملہ فرمایا۔ اس کے بعد سے ۱۹۵۰ء کے بعد تک مسلسل حضرت مولانا پورے ملک کے تبلیغی و دعوتی دورے فرماتے رہے، مختلف علاقوں میں کام کی بنیاد پڑی، لوگوں میں دعوتی جذبہ پیدا ہوا اور کام پھیلنے لگا۔ مولانا محمد یوسف صاحب کا ندھلویؒ کو بھی حضرت مولانا سے بڑا تعلق تھا، اور وہ حضرت مولانا کی کوششوں کو بڑی قدر و عظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ حضرت مولانا کا یہ خیال پہلے بھی تھا کہ برادران وطن کی اکثریت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، تبلیغی کوششوں کے دوران مولانا نے اس کو اور زیادہ محسوس

کیا، تبلیغ کے ذمہ داروں کو بھی حضرت مولانا نے اس کی طرف توجہ دلائی، لیکن بعد میں مولانا کو اندازہ ہو گیا کہ نظام الدین سے اس کام کے آغاز میں مشکلات سامنے آسکتی ہیں اور وہاں سے جو کام جاری ہے اس پر بھی زبردستی ہے، اس لیے حضرت مولانا نے اپنے طور پر اس کام کو مناسب سمجھا اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ اور مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ کی اجازت و مشورہ سے لکھنؤ میں تبلیغی کام کے ساتھ اس کو بھی جوڑ لیا، پھر مسلسل کئی سال مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی رفاقت میں یہ کام جاری رہا۔

لکھنؤ کا مرکز تبلیغ ہی اس کا مرکز تھا، طریقہ کار تبلیغی نظام سے قریب تر تھا بلکہ اس کا اکثر حصہ نظام الدین کے طریقے کے مطابق ہی تھا، البتہ اس میں ایک نئی شق کا اضافہ یہ کیا گیا تھا کہ مختلف علاقوں میں ہندو مسلم مخلوط اجتماعات کیے جاتے تھے، اور اس میں زندگی کے مسائل پر نئے طرز سے سوچنے اور نئے طریقہ پر کوشش کرنے کی دعوت دی جاتی تھی۔

ان اجتماعات میں حضرت مولانا نے بڑی طاقتور اور موثر تقریریں فرمائیں جن سے حالات پر بہت اچھا اثر پڑا اور خاص طور پر غیر مسلم اکثریت کے دماغوں میں اسلام کے بارے میں جو شبہات بڑھتے جا رہے تھے ان کا بڑی حد تک ازالہ ہوا، اور وہ اسلام سے قریب ہوئے۔ یہ اجتماعات ملک کے مختلف شہروں میں کیے گئے، لکھنؤ کو چونکہ مرکزیت حاصل تھی اس لیے وہاں متعدد پروگرام ہوئے، صوبہ اتر پردیش کے اکثر و بیشتر بڑے شہروں میں یہ پروگرام منعقد ہوئے۔ حضرت مولانا ان اجتماعات کی ضرورت اور مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”نہ صرف ہندوستان بلکہ اس موجودہ دور اور عالم انسانی کی ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ اغراض و تعصبات، قوم پرستی اور سیاسی مقاصد سے بالکل آزاد اور بے تعلق ہو کر عام انسانوں کے سامنے وہ حقیقتیں رکھی جائیں جن پر انسانیت کی نجات اور سلامتی موقوف ہے، اور جن کو نظر انداز کر کے ہمارا یہ پورا تمدن اور پوری انسانی سوسائٹی اس وقت سخت خطرہ سے دوچار اور موت و زیست کی کشمکش میں گرفتار ہے۔“ (۱)

طریقہ کار کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”۱۵۴ء میں لکھنؤ کی ”جماعت دعوت و اصلاح“ کا معمول تھا کہ وہ ملک کا دورہ کرتی تھی، اور مختلف شہروں میں ایسے جلسے منعقد کرتی تھی جن میں مختلف مذاہب و خیالات کے لوگ اور ہندو، مسلم، عیسائی بڑی تعداد میں شریک ہوتے تھے، جماعت کے مقررین ان جلسوں میں ان حقائق کو عام فہم زبان، اور روزمرہ کے واقعات اور مثالوں سے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتے تھے، اور یہ بتاتے تھے کہ ہمارے تمدن اور زندگی میں بنیادی خرابیاں اور کمزوریاں کیا ہیں، اور ہم سے زندگی کے مسائل و مشکلات پر غور کرنے اور پھر ان کو حل کرنے کی کوشش میں کیا چوک اور غلطی ہو رہی ہے، موجودہ مادی تہذیب میں کیا سقم اور خامی ہے جو وہ نئی نئی الجھنیں پیدا کر رہی ہے، اور وسائل و ذرائع کی فراوانی کے باوجود انسانیت کو حقیقی سکون بخشنے، دنیا میں امن قائم کرنے، اور صحیح مقاصد کے لیے جدوجہد کرنے سے بالکل قاصر ہے، زندگی کا صحیح نقطہ نظر اور انسان کا حقیقی مقام کیا ہے، اس سلسلہ میں خدا کے پیغمبر ہماری کیا رہنمائی کرتے ہیں، اور زندگی کا کون سا نیا نقطہ نظر، نیا جذبہ اور نئی قوت عمل عطا کرتے ہیں؟“ (۱)

اس کی افادیت اور کامیابی پر روشنی یوں ڈالتے ہیں :

”تجربے سے معلوم ہوا کہ یہ وقت کی اہم ترین ضرورت تھی، یہ جلسے ہم سب کی توقع اور اندازہ سے بہت بڑھ کر کامیاب ہوئے، ان میں ہزاروں مہذب اور تعلیم یافتہ شہریوں کا مجمع ہوا، جس نے اتنے سکون و اطمینان اور رغبت اور دلچسپی سے تقریریں سنیں جس پر سیاسی کارکنوں کو بھی حیرت ہوئی۔ پھر معزز سامعین نے اپنے تاثرات کا اظہار اس انداز میں کیا جس سے عمل اور دعوت کا ایک نیا میدان سامنے آ گیا اور معلوم ہوا کہ ہمارے ملک میں صدائوں اور حقیقتوں کے سمجھنے کی کتنی استعداد اور صلاحیت موجود

ہے، اور خود غرض قومی و سیاسی تحریکوں نے عام آدمیوں کو کتنا مایوس کر دیا ہے، نیز یہ کہ اندھی اور بے ضمیر مادیت کے خلاف کتنا جذبہ اور کیسا اضطراب پایا جاتا ہے، یہ اس ملک اور اس دور کے لیے ایک فال نیک ہے اور امید کی ایک بہت بڑی شعاع۔“ (۱)

ان مخلوط اجتماعات کا سب سے پہلا باقاعدہ اجتماع حضرت مولانا کے سفر شام (۱۹۵۰ء) کے بعد ہوا تھا، امین الدولہ پارک امین آباد (لکھنؤ) میں جو اہم جلسوں کے لیے سب سے بڑی جگہ تھی یہ اجتماع منعقد ہوا، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس میں سامعین کی اتنی بڑی تعداد تھی جو بڑے بڑے سیاسی جلسوں میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس میں حضرت مولانا نے خدا پرستی اور نفس پرستی کے عنوان سے تقریر کی، جس میں ثابت کیا کہ یہ دو متوازی فلسفہ حیات ہیں جنہوں نے دنیا کو تقسیم کر رکھا ہے، پھر حضرت مولانا نے دنیا پر پڑنے والے ان دونوں کے مختلف اثرات اور نتائج کا ذکر فرمایا۔ تقریر میں ایسا جوش اور روانی تھی کہ مجمع پر سکتہ کا عالم طاری تھا، رکشے والوں نے سواریاں لینے سے انکار کر دیا تھا اور بے خود ہو کر تقریر سن رہے تھے۔ اس پہلے جلسہ نے لکھنؤ کی فضا پر گہرا اثر ڈالا اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس موضوع پر حضرت مولانا کے خطابات بڑے پر مغز اور مؤثر ہوتے تھے، افسوس ہے کہ وہ سب محفوظ نہ رہ سکے۔

البتہ ۵۴ء اور ۵۵ء کی تقریریں جو صوبہ اتر پردیش کے مختلف بڑے شہروں میں ہوئیں محفوظ رہ گئیں اور ان کے مجموعے ”مقام انسانیت“ اور ”پیام انسانیت“ کے عنوان سے منظر عام پر آئے، ان تقریروں کے عنوانات سے ان کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

”پیام انسانیت“ میں پانچ تقریریں ہیں، جن کے عنوانات درج ذیل ہیں :

- ۱- خرابی کی جڑ یہ ہے کہ برائی اور پاپ کی خواہش پیدا ہو گئی ہے۔
- ۲- آج دنیا پر خود غرضی اور بداخلاقی کا مانسون چھایا ہوا ہے اُسے چادروں سے روکا نہیں جاسکتا۔

۳- انسان خود پرست بھی ہے اور خود فراموش بھی۔

۴- دنیا کی موجودہ کشمکش یہ نہیں کہ برائی دور ہو بلکہ یہ کہ برائی ہماری نگرانی اور نظام میں ہو۔

۵- اعلیٰ اخلاقی قدریں دل کے اندر کھوئی ہیں ان کی باہر تلاش ہے۔

تقریروں کے مزاج اور مقصد کو سمجھنے کے لیے پہلی تقریر کے ذیلی عناوین بھی پیش کیے

جار ہے ہیں :

۱- تاریخ کا مطالعہ۔

۲- جب تک سوسائٹی میں برائی کا رجحان اور بگاڑ کی صلاحیت نہ ہو کوئی اس کو بگاڑ نہیں سکتا۔

۳- خود غرض انسان۔

۴- اصلاح اور سدھار کی مختلف تجاویز اور تجربے۔

۵- دل کی تبدیلی کے بغیر زندگی تبدیل نہیں ہو سکتی۔

۶- پیغمبر انسانیت کا مزاج بدلتے ہیں۔

۷- ایثار کے دو واقعے۔

۸- انسانیت کا درخت اندر سے سرسبز ہوگا۔

۹- انسانیت کے صحیح نمائندے۔

۱۰- پیغمبروں کی زندگی۔

۱۱- خواہشات کی تسکین سکون کا راستہ نہیں۔

۱۲- اللہ کے پیغمبر خواہشات میں اعتدال پیدا کرتے ہیں۔

۱۳- ہمارا پیغام اور ہماری صدا۔

ان تقریروں کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ تقریر کا اختتام ایسے مضمون پر ہوتا تھا جس سے

آسمانی ہدایت کی ضرورت، نبوت کی قدر و منزلت اور اسلام کی جستجو اور تلاش کا جذبہ پیدا ہو۔

ایک تقریر میں فرماتے ہیں :

”اللہ کے پیغمبروں نے خواہشات پر پہرے بٹھائے، خواہشات میں

توازن اور اعتدال پیدا کیا، نفسانی خواہشات کے بجائے اللہ کو راضی کرنے کی

زبردست خواہش پیدا کی، انسانی ہمدردی اور غمگساری کا جذبہ پیدا کیا۔“ (۱)

”ہم لوگوں میں اس جذبہ کو پیدا کرنا چاہتے اور ان میں ان حقیقتوں کی پیاس پیدا کرنا چاہتے ہیں، زندگی محض کھانے پینے کا نام نہیں، انسان کی زندگی محض مادی یا حیوانی زندگی کا نام نہیں۔ ہم ایک نیا ذوق لے کر آئے ہیں، آج کی مادی دنیا میں یہ بات نئی ہے، دراصل یہ بات نئی نہیں، دنیا کے سب پیغمبر جو ہر قوم میں آئے، یہی پیغام لائے اور سب سے زیادہ طاقت اور وضاحت کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ نے آخری طور پر یہ بات کہی۔ یہ حقیقت چوراہوں پر کہنے کے لائق ہے، لوگ پیٹ کے گرد چکر لگا رہے ہیں، اصلی زندگی دم توڑ رہی ہے، انسانیت کی پونجی لٹ رہی ہے۔ ہم ایک صدا لگانے آئے ہیں، حق کی صدا، دنیا اس صدا سے نامانوس ہے، مگر ہم دنیا سے مایوس نہیں، انسانوں کے پاس اب بھی ضمیر ہے، یہ ضمیر مردہ نہیں ہوا، اس پر گردوغبار آگیا ہے، اگر وہ گردوغبار جھاڑ دیا جائے اور اس کو آلودگی سے صاف کر دیا جائے تو اب بھی اس کی گنجائش ہے کہ وہ حق کو قبول کر لے اور اس میں ایمانی شعور پیدا ہو۔“ (۱)

ان تقریروں کی تاثیر و افادیت کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مولانا نے ”کاروان زندگی“ میں ایک واقعہ تحریر فرمایا ہے، اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے :

”ایک مرتبہ تو یہ پیش آیا کہ سیوان میں شب کے مخلوط اجتماع میں حسب معمول تقریر کر کے بیٹھنا چاہتا تھا کہ جلسہ سے آوازیں آئیں کہ ابھی اور فرمائیے ہم ابھی سننا چاہتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ ہم لوگوں کا یہ معمول نہیں کہ جب بات پوری ہو جائے تو بلا ضرورت تقریر جاری رکھیں۔ میں یہ کہہ کر بیٹھ ہی رہا تھا کہ ایک سن رسیدہ ہندو اسٹیج پر Wonderful-Wonderful کے الفاظ کہتے ہوئے آگے بڑھے اور کہا کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ہم لوگوں نے اس اندیشہ کے پیش نظر کہ کہیں اس جلسہ میں کوئی انتشار یا خیالات کا تضاد سامنے نہ آئے، ان کو مہذب طریقہ پر بٹھانے کی کوشش کی، لیکن وہ اسٹیج

تک پہنچ گئے۔ معززین شہر نے بتایا کہ یہ یہاں کے بہت کامیاب وکیل اور یہاں کی پرجا سوشلسٹ پارٹی کے سکریٹری یا صدر ہیں۔ انہوں نے مانگ پر کہا کہ میں نے اپنی زندگی میں دو تقریریں سنی ہیں جن سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہوں، ایک مسٹر R.Dass کی تقریر، اور ایک آج مولانا صاحب کی۔ اور میں صاف کہتا ہوں کہ محمد صاحب (انہوں نے صلی اللہ علیہ وسلم کا جملہ ادا کرنے کی کوشش کی تھی جو انہوں نے بار بار سنا تھا، لیکن وہ ادا نہ کر سکے) خدا کے سچے پیغمبر ہیں، مولانا صاحب آپ صرف مسلمانوں ہی کے نہیں ہیں، ہم بھی آپ پر اپنا حق سمجھتے ہیں، ہم آپ کو آئندہ بھی یہاں آنے کی زحمت دیں گے۔“ (۱)

یہ سلسلہ بڑا ہی مفید تھا اور اس کے معاشرہ پر بڑے اچھے اثرات مرتب ہو رہے تھے، لیکن مخلوط اجتماعات سے خطاب بڑا نازک اور دشوار کام تھا، اور اس میں ذرا سی بے احتیاطی ”وحدت ادیان“ تک لے جاسکتی تھی، اس لیے زیادہ تر ان اجتماعات سے حضرت مولانا ہی خطاب فرماتے تھے، اور کبھی کبھی مولانا محمد منظور نعمانی کا خطاب ہوتا تھا، ان دو حضرات کے علاوہ اس نزاکت کو محسوس کرنا اور توازن باقی رکھنا دوسرے کے لیے مشکل تھا۔ حضرت مولانا کے بیرونی ممالک کے اسفار اتنی کثرت سے ہو رہے تھے اور اس میں اتنا وقت صرف ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ سلسلہ جاری رکھنا بہت مشکل ہونے لگا، اس کے علاوہ بعض غلط فہمیاں بھی پیدا ہونے لگیں اور بعض ایسے اندیشے سامنے آئے (۲) جس کی وجہ سے کئی سال جاری رہنے کے بعد یہ سلسلہ موقوف کرنا پڑا، اور سالوں کے بعد ۱۹۷۷ء میں ”پیام انسانیت“ کے نام سے پھر باقاعدہ یہ تحریک شروع کی گئی۔

”تحریک پیام انسانیت“ کی ضرورت

مخلوط اجتماعات کا سلسلہ اگرچہ جاری نہ رہ سکا تھا لیکن حضرت مولانا کو اس کی افادیت و

(۱) کاروان زندگی، اول صفحہ: ۳۹۹ تا ۴۰۰ (۲) چوں کہ یہ کام لکھنؤ کے ”مرکز دعوت و اصلاح“ سے ہو رہا تھا اور اس کا طریقہ کار نظام الدین کے تبلیغی نظام سے منسلک تھا، اس لیے یہ اندیشہ ہونے لگا کہ لوگ شاید دونوں کاموں میں فرق نہ کر سکیں، اور تبلیغی کام اس سے متاثر ہو جائے۔

ضرورت کا بڑا احساس تھا، حضرت مولانا نے اس کا تذکرہ اپنے مختلف مضامین میں کیا ہے۔ مولانا کے خیال میں جو بڑی دوراندیشی اور حکمت و بصیرت پر مبنی تھا، اتنے طویل و عریض ملک میں جس میں اکثریت غیروں کی ہو، ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا، اور خاص طور پر ایسے ماحول میں جہاں بدگمانیاں بڑھ رہی ہوں، اور سیاسی صف بندیاں ہو رہی ہوں اور اکثریت کے طبقہ میں مسلمانوں کے بارے میں توخس و تنفر پیدا کیا جا رہا ہو، خاموش تماشائی بن کر رہنا بڑے خطرہ کا پیش خیمہ بن سکتا تھا، اسی طرح اشتعال انگیز تقریریں آگ پر تیل جھڑکنے کے مترادف تھیں، جس سے پورا ملک آگ کی بھٹی میں تبدیل ہو سکتا تھا، جس کے بعد کسی کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ ایسی صورتحال میں اس کی شدید ضرورت تھی کہ اعتماد کا ماحول پیدا کیا جائے، اور امن و امان کی فضا بحال کی جائے، اس کے بغیر دینی، تعلیمی کوششیں، رفاہی ادارے اور انجمنیں کسی کی کوئی گارنٹی نہیں تھی۔ حضرت مولانا پیام انسانیت سے متعلق دیئے گئے انٹرویو میں خود فرماتے ہیں :

”میں اس بات کے سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ یہ اخلاقی سدھار کی مہم اور پیام انسانیت کی تحریک، ملک کے تمام دینی، تعلیمی، علمی کوششوں اور تحریکوں کے لیے ایک حصار کی حیثیت رکھتی ہے جس کے اندر رہ کر ہر کوشش کامیاب ہو سکتی ہے، اور اس کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے پرسکون اور معتدل فضا مہیا ہوگی، اس لیے اس تحریک کو میں ہر تحریک کا خادم اور معاون سمجھتا ہوں۔“ (۱)

حضرت مولانا کا خیال یہ تھا کہ اکثریت کے سامنے اسلام کے تعارف کا بھی یہی راستہ ہے کہ پہلے ان تک پہنچا جائے، اور ان کے سامنے ایسی مشترک باتیں رکھی جائیں کہ وہ خود متوجہ ہوں، اس سلسلہ میں ایک جگہ وہ تحریر فرماتے ہیں :

”غیر مسلم اکثریت کے ان افراد کو متوجہ کرنے اور ان کے ذہن و ضمیر تک پہنچنے کا کوئی راستہ اس وقت زندگی کے مشترک مسائل، انسانیت اور اخلاق، اور ملک کے مفاد کے تذکرہ اور تمام مسائل و مصائب کے حل کی

نشان دہی کے سوا اور نہیں، یہی طریقہ ان کو اسلام کے مطالعہ اور مسلمانوں کے سمجھنے اور ان کو ان کا صحیح مقام دینے پر اور اس خدا داد دولت (مسلمانوں کی موجودگی) سے فائدہ اٹھانے پر جو اس ملک کی تاریخ نہیں بلکہ تقدیر بن گئی ہے، آمادہ کر سکتا ہے۔“ (۱)

ایک جگہ مولانا نے یہاں تک فرمایا کہ ”یہ پورے عالم انسانی کی ضرورت ہے۔“ مولانا کے سامنے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا اسوہ ہے، آپ ﷺ نے ”حلف الفضول“ میں شرکت فرمائی تھی، بعد میں بھی آپ ﷺ فرماتے تھے کہ اگر مجھے کوئی آج بھی اس طرح کے معاہدہ میں شریک کرنا چاہے تو میں تیار ہوں۔

مولانا سے جب سوال کیا گیا کہ اس بھرے پُرے ملک میں جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے، آپ ہی نے کیوں اپنی یہ ذمہ داری سنبھالی کہ اس دعوت کو لے کر کھڑے ہوں؟ اس پر حضرت مولانا نے فرمایا کہ :

”مسلمان اپنے مذہب کی رو سے بھی اس کا ذمہ دار ہے کہ وہ جہاں کہیں ہو اپنے ماحول کی فکر کرے، شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دھنسا کر خطروں سے آنکھیں بند نہ کر لے، ”اور سب خیریت ہے“ کا سبق نہ دہرائے، مسلمانوں کو ہر جگہ بھلائی کا حکم دینے، اور برائی سے روکنے کا حکم ہے، اس کو سمجھنا چاہئے کہ وہ زندگی کی جس کشتی پر سوار ہے، وہ جب ڈوبے گی تو اس کو لے کر ڈوبے گی..... یہ ہمارے ملک کی کشتی ہے، اگر خدا نخواستہ ڈوبی تو نہ ہمارے ادارے بچیں گے نہ کتب خانے، نہ مقدس اور خدا رسیدہ افراد، نہ عالم و فاضل، نہ بزرگ۔“ (۲)

مخلوط اجتماعات کی پانچ تقریریں جب ”مقام انسانیت“ کے نام سے شائع کی جانے لگیں تو اس پر حضرت مولانا نے بڑا طاقتور مقدمہ تحریر فرمایا، اس کے آغاز میں حضرت مولانا نے اسی حقیقت کو دو ٹوک الفاظ میں بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں :

”نہ صرف ہندوستان بلکہ اس موجودہ دور اور عالم انسانی کی ایک اہم

(۱) کاروان زندگی، اول صفحہ: ۳۹۶

(۲) تحریک پیام انسانیت کے بارے میں ایک اہم انٹرویو صفحہ: ۱۲ تا ۱۱

ضرورت یہ ہے کہ اغراض و مقصبات، قوم پرستی اور سیاسی مقاصد سے بالکل آزاد اور بے تعلق ہو کر عام انسانوں کے سامنے وہ حقیقتیں رکھی جائیں جن پر انسانیت کی نجات اور سلامتی موقوف ہے، اور جن کو نظر انداز کر کے ہمارا یہ پورا تمدن اور پوری انسانی سوسائٹی اس وقت سخت خطرہ سے دوچار اور موت وزیست کی کنگش میں گرفتار ہے۔“ (۱)

”ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا“

۲۸، ۲۹، ۳۰ دسمبر ۱۹۷۷ء کو الہ آباد میں اس موضوع پر ایک بڑی کانفرنس بلائی گئی اور

ان الفاظ کے ساتھ ہندو گیرمہم کا آغاز کر دیا گیا کہ :

”افسوس ہے کہ اس لمبے چوڑے ملک میں اخلاقی کمزوریوں کو دور کرنے اور روحانی اور انسانی زندگی کو رواج دینے کے لیے کوئی تحریک اور کوئی جماعت نظر نہیں آتی، ہم نے بہت انتظار کیا اور آخر یہ فیصلہ کیا کہ جو کچھ بن پڑے اس کو شروع کر دیں۔“

الہ آباد سے اس تحریک کا باقاعدہ آغاز کیوں کیا گیا اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے

حضرت مولانا فرماتے ہیں :

”الہ آباد سے ہم نے کام کو شروع کیا ہے کیونکہ اس کا نام ہی ”الہ آباد“ یعنی ”خدا کی گری“ ہے، یہیں سے خدا پرستی کی تحریک اور انسانیت کے احترام کی دعوت شروع ہونا چاہیے، خدا کے بندوں کی عزت، انسانیت کو نئی زندگی دینے اور انسانوں کو انسانیت و اخلاق کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کا کام اسی شہر سے ہونا چاہیے تھا جو خدا کے نام سے آباد ہے۔“ (۲)

”کل ہند حلقہٴ پیام انسانیت“ کے نام سے باقاعدہ لکھنؤ میں اس کا دفتر قائم کر دیا گیا اور کام شروع ہو گیا، یہ کوئی نئی تحریک یا انجمن سازی نہیں تھی بلکہ حضرت مولانا نے ایک صدا

(۱) مقام انسانیت صفحہ: ۵

(۲) تحریک پیام انسانیت کے بارے میں ایک اہم انٹرویو صفحہ: ۲۰

لگائی تھی، نہ مخصوص ارکان اس کے لیے منتخب کیے گئے، نہ کوئی باقاعدہ صدر یا جنرل سکرٹری چنا گیا، ایک نامانوس اور نئی صدالگانے والوں کا یہ ایک مشترکہ پلیٹ فارم تھا، ایک کارواں تھا جو حضرت مولانا کی قیادت میں آگے بڑھ رہا تھا۔

تحریک کے ترجمان مولانا اسحاق جلیس ندویؒ اس کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

- ۱- ”خالص انسانی رشتے اور ہندوستانی ناطے سے ملک میں عام محبت و بھائی چارے کی فضا قائم کرنے اور اخلاقی گراؤ کا ماحول ختم کرنے کے لیے عوامی رابطہ کی مہم، جلسوں اور سیمینار کا انعقاد، مفید اخلاقی لٹریچر کی مختلف زبانوں میں اشاعت۔
- ۲- خدمت خلق کے ذریعے روٹھے ہوئے، بیزار اور آپس میں دست و گریباں انسانوں کو زندگی کے حقیقی لطف اور صحیح مقصد سے روشناس کرانا۔
- ۳- معاشرہ سے رشوت، اقرباء پروری، بدعنوانی، ذخیرہ اندوزی، فرقہ پرستی اور معاشی استحصال کو دور کرنا اور بے حیائی و عریانی کے خلاف بھرپور جدوجہد۔
- ۴- غلط اور ظالمانہ رسم و راج کے انسداد کی کوشش۔
- ۵- ملک کے مظلوم، پس ماندہ، غریب اور پریشان حال افراد کی بلا احتیاز مذہب و ملت ہر ممکن امداد۔
- ۶- نوجوان نسل خاص طور سے طلباء میں سنجیدگی، علمی لیاقت اور سماج کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا تاکہ ہمارے ملک کو ان خطرات سے بچایا جاسکے جو نئی نسل کی بے راہ روی سے پیدا ہو رہے ہیں۔
- ۷- اپنے حلقہ اثر، محلہ، بستی، شہر اور پورے ملک میں برادرانہ ماحول پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش و جدوجہد۔“ (۱)

(۱) تحریک پیام انسانیت کے بارے میں ایک اہم انٹرویو صفحہ: ۲۰

اس تحریک نے آگ پر پانی کا کام کیا، زخموں پر مرہم رکھا اور حالات کو معتدل و پرسکون بنانے میں اہم کردار ادا کیا، پورے ملک کے طول و عرض میں جا بجا اس کی کانفرنسیں ہوئیں، جس میں ہر طبقہ اور فرقہ کے لوگ شریک ہوئے، غلط فہمیاں دور کی گئیں، دل صاف کیے گئے اور دماغوں میں نفرتوں کی جوتھیں جم رہی تھیں ان کو کھرچا گیا، بقائے باہمی کی فضا قائم کی گئی، اور بڑی حد تک اعتماد کا ماحول بحال ہوا۔ پیام انسانیت کے ان جلسوں میں حضرت مولانا اکثر افتتاحی خطاب فرماتے تھے اور اس سے پورے اجلاس کا رخ متعین ہو جاتا تھا، بعد میں آنے والے مقررین کی تقریریں اکثر مولانا کی پُر مغز تقریر کی تشریح کے طور پر ہوا کرتی تھیں۔

مولانا کی تقریروں کی خصوصیات

حضرت مولانا کی تقریروں میں اس پر خاص زور دیا جاتا تھا کہ انسان کے اندر انسانیت موجود ہے اس کو بیدار کرنے اور جگانے کی ضرورت ہے۔ ۲ دسمبر ۱۹۹۰ء کی ایک تقریر میں فرماتے ہیں :

”تاریخ کے قدیم ترین دور سے لے کر ہمارے زمانہ تک جس چیز نے انسانیت کی شمع مسلسل طور پر روشن رکھی وہ خدا کی یہ نعمت ہے کہ اچھے انسان، انسان سے مایوس نہیں ہوئے، انہوں نے اس کو ناقابل علاج مریض اور ناقابل اصلاح حیوان نہیں سمجھا، وہ بھی اس کے وجود سے ایسے متنفر نہیں ہوئے کہ اس کی صورت دیکھنے تک کے روادار نہ ہوں، انہوں نے کبھی اس کے زندہ رہنے کے استحقاق کا انکار نہیں کیا۔

انسانیت کا چراغ بے تیل جی کے جل سکتا ہے، وہ ہوا کے تیز جھونکوں اور طوفانوں کے تھپیڑوں میں روشن رہ سکتا ہے، اور انسانیت کی تاریخ بتاتی ہے کہ پیغمبروں نے انسانیت کا چراغ روشن رکھا، انہوں نے پیٹ پر پتھر باندھ کر اور مسلسل فاقہ کر کے جنگلوں اور بیابانوں، کڑا کے جاڑوں کی راتوں اور تپتی ہوئی دوپہریوں میں انسانیت کی خدمت کی۔ ان میں سے کوئی چیز ان کی ہمت توڑنے اور ان کو ان کے مقدس کام سے روکنے کے لیے کافی نہ تھی،

ان کی نہ ختم ہونے والی قوت کے مقابلہ کاراز اور ان کی حیرت انگیز قوت عمل کی بنیاد یہ تھی کہ وہ انسان کو دست قدرت کا شاہکار (Master Piece) سمجھتے تھے۔“ (۱)

ایک تقریر میں انسانوں کی انسانیت کو لاکارتے ہوئے بڑے جوش کے ساتھ فرماتے ہیں :

”کیا ایک شہری دوسرے شہری کو اپنا بھائی سمجھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ خدا کا بنایا ہوا ایک انسان ہے؟ بالکل نہیں، ہر شخص دوسرے کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ ایک شکار ہے..... ایک قیمتی انسان سے ایک موذی جانور کا سا سلوک کیا جاتا ہے..... ہماری نظر اس کے دھڑکتے ہوئے دل، اس کی سلگتی ہوئی روح، اس کے پلکتے ہوئے بچوں، اس کی بوڑھی ماں، اور اس کے غریب خاندان پر نہیں ہوتی، ہماری نظر اس کی جیب کے چار پیسوں پر رہتی ہے۔ سارے ملک کا یہ حال ہو گیا ہے کہ کسی کو کسی سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی، سارا ملک ایک منڈی اور ایک جوا خانہ بن گیا ہے، جس میں ایک کی جیت اور ہزاروں کی ہار ہے، کسی کے دل میں کوئی بلند جذبہ، بلند تخیل، انسانیت کا احترام، خدا کا لحاظ باقی نہیں رہا۔ انسانیت کو اس پر ماتم کرنا چاہیے اور انسانیت کے دعویداروں کو شرم کے مارے اپنی گردن جھکا لینی چاہیے۔“ (۲)

دوسری چیز جس پر مختلف تقریروں میں حضرت مولانا نے زور دیا ہے وہ مسلسل محنت اور تگ و دو ہے، حضرت مولانا نے بار بار یہ بات فرمائی ہے کہ ”یہ کوئی تھوڑی دیر کا کام نہیں ہے، بلکہ یہ ایک جہد مسلسل کا نام ہے۔“ ایک تقریر میں فرماتے ہیں :

”حضرات! کوئی کام شدید جدوجہد، خطرات اور قربانیوں کے بغیر نہیں ہو سکتا، قوم کی صحیح تعمیر اور انسانیت کا احترام اور ماہمی اعما د و محبت پیدا کرنے کے لیے ہم کو ایک مجنونانہ اور سرفروشانہ جدوجہد کی ضرورت ہے۔

(۱) کسی ملک و معاشرہ کے لیے سب سے خطرناک بات صفحہ: ۱۳ تا ۱۴

(۲) اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے صفحہ: ۱۳ تا ۱۴

ہندوستان تاریخ کے ایک نازک موڑ اور فیصلہ کن دور ہے پرکھڑا ہے، ایک راستہ ہمیشہ کی تباہی، نہ مٹنے والے انتشار اور نہ ختم ہونے والے زوال کی طرف لے جاتا ہے۔ ایک راستہ ہمیشہ کے امن وامان، اتحاد و یکجہتی کی طرف لے جاتا ہے۔

ہر ایسے موڑ پر کچھ ایسے لوگ سامنے آ جاتے ہیں جو تاریخ کا رخ موڑ دیتے ہیں اور واقعات کا دھارا بدل دیتے ہیں، ان کی دلیری، ان کی صاف گوئی اور ان کی جانبازی پورے پورے ملک اور قوم کو بچالے جاتی ہے، یہی لوگ ملک کے معمار ہوتے ہیں، اردو کے کسی پرانے شاعر نے صحیح کہا ہے

اولو العزمان دانشمند جب کرنے پہ آتے ہیں

سمند رپاٹتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں۔ (۱)

پیام انسانیت کی تقریروں میں حضرت مولانا کی یہ بہت بڑی خصوصیت ہے کہ وہ دعوت حق حکیمانہ انداز میں پیش کرتے چلے جاتے ہیں، خدا کی عظمت و کبریائی کا تذکرہ ان تقریروں میں جا بجا ملتا ہے، اور متعدد موقعوں پر یہ حدیث حضرت مولانا نے برادران وطن کے سامنے سنائی ہے کہ ”تمہارا رب بھی ایک اور تمہارا باپ بھی ایک، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کو مٹی سے بنایا گیا۔“

ایک تقریر میں عقیدہ توحید کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”حدیث میں آتا ہے ”الخلق عیال اللہ“ ساری مخلوق اور جتنے انسان ہیں، وہ خدا کا کنبہ ہیں، یہ آخری بات اس مذہب نے کہی ہے جس کو عقیدہ توحید پر ذرا سی آنچ گوارا نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں ہر وہ چیز جس سے توحید مجروح ہوتی ہونا پسندیدہ ہے، یہاں تک کہ گنتی میں بھی وتر کو پسند کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت میں جو مذہب اتنا حساس (SENSITIVE) ہو وہ نہ ہر تمام مخلوق کو خدا کا کنبہ کہتا ہے، یہ کتنی بڑی بات ہے، قرآن مجید کا تہائی حصہ عقیدہ توحید پر مشتمل ہے، سورہ اخلاص کو

قرآن مجید کا ۳۱ حصہ کہا گیا ہے، اس میں ہے ”قل هو الله أحد. الله الصمد. لم يلد ولم يولد. ولم يكن له كفوا أحد. (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! کہہ دیجئے اللہ ایک ہے، وہ بے نیاز ہے، سب اس کے ضرورت مند ہیں اور اس کو کسی کی ضرورت نہیں، نہ اس نے کسی کو جنم دیا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا، اور اس کا کوئی ہمسر نہیں)۔“ (۱)

ایک دوسری تقریر میں فرماتے ہیں :

”کسی ملک یا قوم کے تحفظ و بقا کے لیے اور افراد کو خود غرضی، ظلم، بے ایمانی اور خیانت سے بچانے کے لیے اصل طاقت تو خدا کا عقیدہ اور خوف ہے، جب کسی انسان کے دل و دماغ میں یہ عقیدہ جاگزیں ہو جائے کہ ایک ایسی بالاتر ہستی ہے جو اندھیرے اُجالے میں میری نگراں ہے اور مجھے اس کے سامنے جواب دہی کرنی ہے تو وہ کوئی غلط کام نہیں کر سکتا، اصلاح کے لیے اس سے بہتر کوئی نسخہ نہیں، یہ وہ اصل طاقت ہے جو چوروں کو پاسبان بناتی ہے۔“ (۲)

اس میں حضرت مولانا بڑے خوبصورت انداز میں توحید اور آخرت کے عقیدہ کی طرف اشارہ فرما دیا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں ”بارہ درسی“ (لکھنؤ) کے اجلاس پیا انسانیت میں حضرت مولانا نے جو اختتامی تقریر فرمائی تھی وہ خالص الہامی معلوم ہوتی ہے، اس کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر کا کام کرتا ہے، اس میں مولانا نے جس طرح برادران وطن کے سامنے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت، کام اور مقام کا تذکرہ کیا ہے وہ مولانا ہی کا حصہ ہے، فرماتے ہیں :

”ہمارے سامنے اس سلسلہ میں سب سے اونچا نمونہ خدا کے پیغمبروں کا ہے، وہ کس حال میں اور کس زمانہ میں آئے! ایک آدمی ان کی بات سننے کا روادار نہیں تھا، ایک آدمی ان کی بات سمجھنے کے قابل نہیں تھا، معلوم ہوتا ہے جنگل میں آگے ہیں، درندوں میں آگے ہیں، کوئی ان کی بولی سمجھنے والا

(۱) تحفۂ انسانیت صفحہ: ۲۶

(۲) اس گھر کو آگ لگی گھر کے چراغ سے صفحہ: ۲۱

نہیں۔ چنانچہ قرآن شریف میں ہے کہ ایک پیغمبر کو خطاب کر کے ان کی قوم نے کہا کہ: ”قالوا یا شعيبُ ما نفقهُ كثيرًا مما تقول وانا لنراک فينا ضعيفا“ اکثر آپ کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، ہمارے پلے کچھ نہیں پڑ رہا ہے، ہم نہیں جانتے آپ کیا کہہ رہے ہیں؟! ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ہمارے درمیان سب سے کمزور آدمی ہیں، پھر ہم آپ کی بات کیوں سنیں؟؟ لیکن انہوں نے کیا کہا، پارس کی بھی حقیقت ہے کہ پتھر کو چھو جاتا ہے تو سونا بنا دیتا ہے، کیمیا کی بھی کیا حقیقت ہے کہ مٹی کو وہ سونا بنا دیتی ہے۔ انہوں نے انسانوں کو فرشتوں سے اونچا کر دیا، انسانوں میں وہ صبر و ضبط پیدا کیا کہ اگر تاریخ کی متواتر شہادتیں نہ ہوتیں تو یقین کرنا مشکل تھا کہ انسان اتنا صابر و ضابط ہو سکتا ہے، آپ دیکھیں گے کہ جوان کے خون کے پیا سے تھے ان کو انہوں نے سینے سے لگایا، دل میں جگہ دی، اس کے بعد وہ ان پر اپنی جان نچھاور کرنے لگے، لوگ ان کو مارنے کے لیے آتے تھے لیکن ان کا کلمہ پڑھتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوتے تھے، جنہوں نے خون کیے تھے اور جن کی آنکھوں سے اب بھی خون ٹپک رہا تھا، انہوں نے ان کو محبت کا پیغام دیا، انہوں نے ان کو اپنے سینے سے لگایا پھر دنیا کیا ہو گئی! دنیا میں کیسی ہوائیں چلنے لگیں، خزاں کے بعد بہار کا دور آیا، بادِ سموم کے بعد نسیمِ جانِ نغز کے جھونکے چلے، آج تک وہ ہم کو محسوس ہو رہے ہیں۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں، بغیر کسی معذرت کے کہ اس وقت بھی جو کچھ دنیا میں خیر ہے، اس وقت بھی دنیا میں محبت کا جو کچھ مادہ ہے، اس وقت بھی انسانوں کے دلوں میں جو کچھ روشنی ہے، اس وقت بھی انسانوں کے دلوں پر درد کی جو چوٹ ہے، وہ سب ان پیغمبروں کا صدقہ ہے۔“ (۱)

حضرت مولانا کی ان تقریروں کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ان میں

مسلمانوں کو بھی خطاب کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں ان کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلاتے ہیں، اور اس طرح اسلام کے پیغام کو اور مسلمانوں کے کام کو غیروں کے سامنے پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔

مشہور تقریر (۱) جو ”اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے“ کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے، اس کا اختتام کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”آخر میں میں اپنے مسلمان دوستوں اور بھائیوں سے کہوں گا کہ ان کی اس موقع پر دودھری ذمہ داری ہے، ایک تو یہ کہ ان کا مذہبی صحیفہ قرآن، اور ان کے پیغمبر کی تعلیم ان کو نہ صرف اس عام بگاڑ، اس پھیلی ہوئی آگ، اور ردولت کی پرستش کے اس بہتے ہوئے گندے پانی سے بچنے کی تلقین کرتی ہے بلکہ ان پر اس کو روکنے اور اس سے لوگوں کو بچانے کی ذمہ داری بھی عائد کرتی ہے، ان کو ان کے پیغمبر نے صاف طریقہ پر سمجھا دیا ہے کہ اگر کسی کشتی کے کسی سوار کو بھی ایسی حرکت سے باز رکھنے کی کوشش نہ کی گئی جس سے یہ کشتی خطرہ میں پڑ جاتی ہے اور یہ کشتی ڈوبی تو پھر اس کشتی کا کوئی سوار بھی بچ نہیں سکے گا، اور یہ کشتی نیک و بد، قصور وار اور بے قصور، سوتے جاتے سب کے ساتھ ڈوب جائے گی، اور اس وقت کوئی نیکی اور کوئی دانائی کام نہ آئے گی۔ ان کی دوسری ذمہ داری کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس ملک میں انسانیت کے احترام، عدل و مساوات اور سماجی انصاف کا پیغام لے کر آئے تھے، اور انہوں نے اس ملک کی بڑے نازک وقتوں میں مدد کی، یہ پیغام ان کی مذہبی تعلیمات میں اب بھی پورے طور پر محفوظ ہے۔ اگر انہوں نے ملک کی سوسائٹی کی اس ڈوبتی یا ڈمگاتی کشتی کو بچانے کی امکانی کوشش نہ کی، تو وہ خدا کے سامنے قصور وار اور گنہگار ٹھہریں گے اور تاریخ میں فرض ناشناس بلکہ احسان فراموش اور مجرم قرار پائیں گے۔“ (۲)

(۱) ۲۲ مئی ۱۹۷۵ء کو لکھنؤ میں کی گئی تقریر۔

(۲) اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے صفحہ ۲۲-۲۳

تحریک کے سلسلہ میں بعض خدشات اور مولانا کی رائے

تحریک اپنے شباب پر تھی، جگہ جگہ اس کا استقبال ہو رہا تھا، شہر شہر اس کے پروگرام منعقد ہو رہے تھے اور ہر طبقہ کے لوگ اس میں دلچسپی لے رہے تھے کہ بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ خدشات ابھرنے لگے کہ کہیں یہ تحریک ”وحدت ادیان“ کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔ تحریک کے ترجمان مولانا اسحاق جلیس صاحب نے انٹرویو لیتے وقت حضرت مولانا سے اس خدشہ کا اظہار کیا تھا، جس کا مولانا نے بڑا حکیمانہ جواب دیا، مناسب معلوم ہوتا ہے وہی جواب یہاں نقل کر دیا جائے، مولانا نے فرمایا :

”اس کا سارا انحصار داعیوں کی نیت، ان کے یقین و عزم، اور ان کے دعوت کے پیش کرنے کا طریقہ پر ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں شروع سے ”وحدت ادیان“ کا مخالف، اور ”وحدت حق“ کا قائل ہوں، ۱۹۴۷ء کے بعد ہی سے میں نے اس پر مضامین لکھنے شروع کیے اور ہر اس چیز کی مخالفت شروع کی جس سے مسلمانوں میں کسی دوسری تہذیب یا دعوت میں تحلیل ہونے کا اندیشہ پیدا ہوتا تھا۔ اس سلسلہ میں میں اپنے دور سالوں کا حوالہ دوں گا، جن کا تعلق علی الترتیب ڈاکٹر سپورنا نند وزیر اعلیٰ ریاست یوپی، اور باپو پرشوتم داس سٹڈن صدر کانگریس و اسپیکر یوپی اسمبلی کی بعض تقریروں اور مضامین سے تھا، ایک کا عنوان ”مسلمان اور ہندوستانی پروج“ اور ایک کا نام ”مذہب یا تہذیب“ ہے۔ درحقیقت یہ تحریک ”وحدت ادیان“ کی نہیں، ”وحدت انسان“ کی ہے، اس لیے ہم ان تقریروں میں اس سے امکانی حد تک احتیاط برتتے ہیں کہ ان میں مذہب کی دعوت دی جائے، ہم صرف اخلاق، خدا ترسی، انسان دوستی اور اخلاقی اور شہری شعور کی دعوت دیتے ہیں، یوں سمجھ لیجئے کہ یہ اس غیر مسلم اکثریت کے ملک میں اس ”حلف الفضول“ کی ایک تقلید ہے جو بحث سے قبل مکہ معظمہ میں ایک انجمن یا معاہدہ کی شکل میں قائم ہوا تھا، جس کے اہم دفعات یہ تھے کہ ”ہم ملک سے

بے امنی دور کریں گے۔“ مسافروں کی حفاظت کریں گے۔“ غریبوں کی امداد کرتے رہیں گے۔“ زبردست کو زبردست پر ظلم کرنے سے روکا کریں گے۔“ آنحضرت ﷺ اس میں شریک تھے، اپنے نبوت کے زمانہ میں فرمایا کرتے تھے کہ اگر آج بھی کوئی اس انجمن کے نام سے کسی کو مدد کے لیے بلائے تو میں سب سے پہلے اس کی امداد کو تیار پایا جاؤں گا۔“ (۱)

حضرت مولانا کو ہمیشہ اس کا اہتمام رہا کہ ان جلسوں میں وہی لوگ تقریریں کریں جو اس کی نزاکتوں کو اچھی طرح سمجھ چکے ہوں، جن لوگوں سے یہ خطرات ہوئے کہ وہ ”وحدت ادیان“ کا نظریہ پیش کریں گے، حضرت مولانا ان کی گفتگو ہر گز پسند نہیں فرماتے تھے اور اگر کبھی غلطی سے اس کی نوبت آجاتی تو بڑی خوبصورتی سے اس کی تردید فرما دیتے تھے۔ مولانا کا خیال یہ تھا کہ ان جلسوں میں وہی گفتگو مناسب ہے جو مشترک انسانی موضوعات پر ہو، اور مشترک قدروں کو اس میں موضوع بنایا گیا ہو، جس سے لوگ مانوس ہوں اور ان کے دل و دماغ کے بند دروازے کھل سکیں اور ان میں غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔ اس طرح ایک خدشہ یہ بھی ظاہر کیا جا رہا تھا کہ اس تحریک کا ہندوستان کی دوسری تحریکوں اور دینی کوششوں سے تصادم نہ ہو جائے، یا یہ تحریک ان کوششوں کو نقصان نہ پہنچا دے جو عرصہ سے جاری ہیں اور ان کے بہترین نتائج سامنے آرہے ہیں۔ حضرت مولانا کے سامنے جب یہ سوال رکھا گیا تو مولانا نے فرمایا :

”میں اس کو ”اندیشہ دور دراز“ سے زیادہ وقعت نہیں دیتا، اس لیے کہ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ یہ تحریک سب کے لیے مفید و معاون، سازگار فضا پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، جس کے بغیر کوئی تحریک سکون و اطمینان کے ساتھ اپنا عمل نہیں کر سکتی، ہر کام کے لیے معتدل (Normal) حالات کی ضرورت ہے، اس کی ضرورت ہے کہ دماغ اپنا توازن نہ کھوئیں، طبیعتوں میں اشتعال، برہمی، اور بے جا بدگمانیاں نہ پائی جائیں، ان میں بات سننے کا موڈ اور اچھی بات کے قدر کی صلاحیت ہو، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ تحریک یہ مقصد

(۱) ”تحریک پیام انسانیت“ کے بارے میں ایک اہم انٹرویو صفحہ ۱۸۲:۱۷

پورا کرتی ہے۔

جہاں تک تصادم اور ٹکراؤ کا تعلق ہے تو ٹرین ٹرین سے لڑ سکتی ہے، موٹر موٹر سے ٹکرا سکتی ہے، لیکن ٹرین اور کشتی یا جہاز میں کوئی ٹکرا نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ ایک خشکی پر چلتی ہے، دوسری پانی میں۔

تحریک ”پیام انسانیت“ کے مخاطب بلا تفریق مذہب و ملت ملک کے تمام باشندے ہیں، اس کا موضوع انسانیت اور اخلاق ہے، اس کا مقصد ملک کے رہنے والوں میں زندگی کا سلیقہ اور شہریت کا احساس پیدا کرنا ہے۔

آخر میں آپ کو یاد دلانا ہوں کہ میں ان حضرات کو اس تحریک میں شامل کرنے کے بارے میں کتنا محتاط ہوں جو دوسری دینی، دعوتی و تبلیغی تحریکات میں شامل ہیں، ان کے بارے میں مطمئن ہیں اور مفید کام کر رہے ہیں، بلکہ عام طور پر ان کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اپنے کام میں پورے انہماک کے ساتھ لگے رہیں، اس کے بعد بھی اگر کسی کو مخالفت یا تصادم کا اندیشہ ہے، تو آپ کو معلوم ہے کہ وہم کا علاج لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نیتوں کا جاننے والا اور قلوب کی حفاظت کرنے والا ہے، فنعم المولیٰ ونعم النصیر۔“ (۱)

تحریک کی افادیت اور طریقہ کار میں وسعت

اس تحریک نے پورے ملک کی فضا پر گہرا اثر ڈالا۔ خاص طور پر فساد زدہ علاقوں میں جہاں ایک انسان دوسرے انسان کے خون کا پیاسا ہورہا تھا اور نفرت اور گروہ بندی کی آگ لگی ہوئی تھی ایسے علاقوں میں بھی اس کے کامیاب جلسے ہوئے اور بعض بعض جگہ تو یکسر فضا بدل گئی۔

تحریک کی اس افادیت کے پیش نظر حضرت مولانا کی شروع سے یہی رائے رہی اور اس پر عمل بھی ہوتا رہا کہ اس کے لیے کوئی لگا بندھا نظام نہ جاری کیا جائے بلکہ جہاں جیسی ضرورت پیش آئے اس کے مطابق اس سے کام لیا جائے، اس کے لیے شروع ہی سے عوامی

(۱) ”تحریک پیام انسانیت“ کے بارے میں ایک اہم انٹرویو صفحہ: ۱۹

رابطہ کی مہم بھی چلائی گئی، بڑی بڑی کانفرنسیں بھی کی گئیں، خطوط کے ذریعہ سے بھی لوگوں کو متوجہ کیا گیا، ملک کے مختلف حصوں کے دورے بھی کیے گئے، ملک کی اہم علمی، ادبی، سماجی و سیاسی شخصیات سے ملاقاتیں کر کے ان کو بھی توجہ دلائی گئی، اور خاص طور پر اس موضوع سے متعلق بڑا لٹریچر تیار کیا گیا جو تقریباً تمام تر حضرت مولانا ہی کے مضامین اور تقریروں پر مشتمل تھا، اس کی مختلف زبانوں میں بڑے پیمانہ پر اشاعت کی گئی۔ حضرت مولانا کے مضامین میں ادبی چاشنی کے ساتھ درد دل اور خون جگر کی جو آمیزش ہے اس سے ان کی تاثیر دو آتشہ ہو جاتی ہے، اس لٹریچر نے ملک کی سرکردہ شخصیات اور قائدین کو بھی متوجہ کیا اور وہ بھی کچھ سوچنے پر مجبور ہوئے۔

ملک کے سابق وزیر اعظم مسروری پی سنگھ نے خود حضرت مولانا کے سامنے اپنے بڑے تاثر کا اظہار کیا، اور کہا کہ ”جب میں کوئی بڑی اسپیچ (Speech) دینے جاتا ہوں تو آپ کی کوئی تقریر پڑھ لیتا ہوں، اس سے میرے اندر طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔“ اپنی متعدد تقریروں میں انہوں نے مولانا کی بعض تقریروں کے حوالے بھی دیئے۔

پیام انسانیت کے سلسلہ میں حضرت مولانا نے پورے ملک کے دورے کیے، ان دوروں میں ایک اہم دورہ مدھیہ پردیش کا بھی ہوا، گیارہ روز اس میں صرف ہوئے اور ایک ایک دن میں تین تین یا چار چار پروگرام ہوئے۔ مولانا اسحاق جلیس صاحب نے اس کی بڑی پراز معلومات اور موثر روداد بھی لکھی جو ”تحفہ انسانیت“ کے نام سے شائع ہوئی۔ ان جلسوں میں ملک کے بعض اہم قائدین اور سیاسی و سماجی کارکن شریک ہوئے اور انہوں نے گہرا تاثر ظاہر کیا، اس کا پوری فضا پر اثر پڑا، اکثر مقامات پر اکثریتی طبقہ کے لوگوں نے صاف کہا کہ یہ باتیں ہم نے اب تک نہیں سنی تھیں، آپ بار بار تشریف لائیں۔ ہر جلسہ میں تحریک کا پورا تعارف کرایا جاتا، اور اس کے اغراض و مقاصد اور طریقہ کار پر روشنی ڈالی جاتی، عام طور پر یہ ذمہ داری تحریک کے ترجمان مولانا اسحاق جلیس ندوی صاحب کے سر ڈالی جاتی اور وہ اس کو بڑی خوبی کے ساتھ ادا کرتے۔ قافلہ کے ایک اہم رکن جناب مولانا عبد الکریم پارکھی صاحب تھے، ہندی زبان پر قدرت کی وجہ سے ان کے خطابات نے خاص اثر ڈالا، حضرت مولانا کے

بعد وہی اس تحریک کے سب سے کامیاب ترجمان تھے۔

تحریک پیام انسانیت کے سلسلہ کا ایک طویل دورہ مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوئی کی دعوت و تحریک پر حضرت مولانا نے بندیل کھنڈ کا فرمایا تھا، قاری صاحب کی تحریک وجد و جہد سے یہ دورہ بھی بہت کامیاب رہا اور تحریک کا ہر جگہ استقبال ہوا کہ یہ عوام و خواص کی ضرورت اور دل کی آواز تھی۔

اسی سلسلہ کا ایک کامیاب سفر مغربی یوپی، ہریانہ و پنجاب کا بھی ہوا تھا اور اس کے پورے علاقہ پر بہت اچھے اثرات پڑے، حضرت مولانا نے اس کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ ”یہ پیام انسانیت کے دوروں میں کامیاب ترین دورہ تھا۔“

ان دوروں کے علاوہ پورے ملک میں حضرت مولانا نے آواز لگائی، سفر کیے اور جگہ جگہ بہت کامیاب پروگرام ہوئے جس کی کچھ تفصیل ”کاروان زندگی“ کے جلدوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

آخر میں حضرت مولانا نے محسوس کیا کہ ملک کے پڑھے لکھے لوگوں کو اور ان لوگوں کو جن کے ہاتھ ملک کی باگ ڈور ہے اور وہ اثر انداز ہوتے ہیں، ان کو خاص طور سے متوجہ کرنے کی ضرورت ہے، اس کے لیے مختلف بڑے شہروں میں باہمی تقابہ اور تبادلہ خیال کے لیے بڑے بڑے پروگرام کیے گئے۔

ڈائلاگ (Dialogue) کے عنوان سے یہ پروگرام دہلی، پونہ، ناگپور میں کیے گئے، اور اس میں ملک کا کریم (Cream) طبقہ شریک ہوا۔ حضرت مولانا کے اس کام اور پیغام سے وہ لوگ نا آشنا نہیں رہے تھے، مگر ان جلسوں سے ان کے دل و دماغ پر اثر پڑا اور کچھ سوچنے سمجھنے اور کرنے کا ان میں جذبہ پیدا ہوا۔

ملک کی چوٹی کے قائدین، وزرائے اعظم، وزرائے اعلیٰ، اور اعلیٰ حکام سے ملاقاتوں میں بھی حضرت مولانا نے ان کے سامنے یہ حقائق بیان کیے اور ان کے سامنے اپنی تقریروں میں دو ٹوک انداز میں ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں اور مکاتیب کے ذریعہ سے بھی ان کو متوجہ کیا۔

ملک کے وزرائے اعظم کے نام مکاتیب

ملکی اصطلاحات کے سلسلہ میں حضرت مولانا کی کوششوں کا یہ ایک اہم اور مؤثر طریقہ کار رہا ہے کہ انہوں نے اپنے وقت کے وزرائے اعظم کو خطوط کے ذریعہ پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کیا اور ملک کی اصلاح و ترقی کی طرف متوجہ فرمایا۔ یہ حضرت مولانا کا خاص اسلوب دعوت ہے کہ وہ اپنی بات کہنے سے پہلے خوبیوں کا اعتراف فرماتے ہیں، اور اس کے لیے بہت سی وہ خوبیاں تلاش کر لیتے ہیں جن کی طرف عام طور پر نگاہ نہیں جاتی، اس کا بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو مخاطب کی توجہ حاصل ہو جاتی ہے، اور وہ پوری بات گوش دل سے سنتا ہے اور کہنے والے کو اپنا خیر خواہ اور مخلص سمجھتا ہے، ایک داعی کے لیے اس کی بڑی اہمیت ہے کہ وہ اپنے مخاطب کے دل میں جگہ بنا لے۔ حضرت مولانا نے اس اسلوب دعوت کو ہر جگہ استعمال فرمایا ہے اور اس کے نتیجے میں ان کی دعوت بہت مؤثر ہوئی ہے۔ ملک کے وزرائے اعظم کے نام خطوط میں اور اپنی براہ راست گفتگو میں بھی حضرت مولانا نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔

ملک کے پہلے وزیر اعظم مسٹر جواہر لال نہرو سے حضرت مولانا کی باقاعدہ مراسلت ملاقات و گفتگو کا تذکرہ تو نہیں ملتا، البتہ مصر کے صدر ناصر کے سلسلہ میں انہوں نے حضرت مولانا کو طیب جی (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے واسطے سے یہ پیغام کہلوایا تھا کہ ”مولانا، ناصر کی مخالفت نہ کریں وہ ملک سے اور خود ان سے اچھا تعلق رکھتے ہیں۔“ حضرت مولانا نے اس پر فرمایا تھا کہ ”یہ ہمارے قلب و ضمیر کا مسئلہ ہے، نہرو جی کو اس سلسلہ میں صحیح بات سے واقف کرادیا جائے۔“

مسٹر اندرا گاندھی

اندرا گاندھی کے دور حکومت میں حضرت مولانا نے ان کو خطوط بھی لکھے، اور ملاقات کر کے ان کو خطرات سے آگاہ بھی کیا، اس کی کچھ تفصیلات ذیل میں نقل کی جاتی ہیں :

۱۹۷۱ء میں عام انتخابات سے پہلے اندرا گاندھی نے خاندانی منصوبہ بندی (Family Planning) کے لیے قانون پاس کرایا اور اس کے عملی نفاذ کے لیے ”نس بندی“ کا قانون

بنوا کر اس پر عمل درآمد کے احکامات جاری کر دیئے، سختی سے اس پر عمل شروع کر دیا گیا، جس کے نتیجہ میں حکومت سے عمومی طور پر بددلی پیدا ہونے لگی لیکن چوں کہ اس کے فوراً بعد ہی الکشن کرائے گئے، اس لیے کانگریس پھر برسرِ اقتدار آئی، اور مسز گاندھی بھی کسی نہ کسی طرح اپنے حلقہ رائے بریلی سے جیت گئیں، ان کے حریف مسٹر راج نرائن نے ہائی کورٹ میں الکشن کو چیلنج کر دیا، اور حکومت پر کھلی جنبہ داری کا الزام لگایا اور ثابت کیا کہ اس کے لیے حکومت کے سارے ذرائع استعمال کیے گئے ہیں، گو مقدمہ نے طول پکڑا اور چار سال گذر گئے، لیکن فاضل اور منصف جج نے ہزار دہاؤ کے باوجود فیصلہ راج نرائن کے حق میں دیا اور یہ اعلان کر دیا کہ اندرا گاندھی سیٹ سے محروم کی جاتی ہیں۔ مسز گاندھی نے اس فیصلہ کے بعد سپریم کورٹ میں اپیل کی، ان کی مخالف جماعتوں نے یہ فیصلہ لیا کہ سپریم کورٹ میں وہ ان کی مخالفت نہیں کریں گے، سپریم کورٹ نے مسز گاندھی کے حق میں فیصلہ دے دیا، لیکن مخالف جماعتوں نے مسز گاندھی کے استعفیٰ کا مطالبہ اصرار کے ساتھ کیا اور فضا ایسی ان کے خلاف بن گئی کہ ان کے قانونی مشیروں نے مشورہ دیا کہ ان کے لیے اقتدار میں رہنے کا اب صرف ایک ہی راستہ رہ گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایمر جنسی نافذ کر دی جائے، مسز گاندھی کسی بھی صورت میں اقتدار سے دستبردار ہونا نہیں چاہتی تھیں، اس لیے انہوں نے ایمر جنسی کو ترجیح دی۔

۲۵ جون ۱۹۷۵ء کو پورے ملک میں ایمر جنسی لگا دی گئی، بڑے پیمانہ پر گرفتاریاں ہوئیں، بہت سے اہم مسلمان قائدین بھی گرفتار کر لیے گئے، مسز گاندھی کے چھوٹے بیٹے مسٹر بھگت گاندھی جو پہلے سے سرگرم تھے، اس کے بعد سب سے زیادہ با اختیار شخصیت کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے۔ ان کے سامنے صرف دو کام تھے، آبادی پر روک لگانا اور اس کے لیے نس بندی کا سلسلہ وسیع کرنا۔ دوسرے شہروں کی صفائی اور آرائشی، اس کے لیے مکانات منہدم کرنا اور بے دریغ بلڈوزر چلوانا۔ زیادہ تر اس کا نشانہ مسلمان بن رہے تھے، ان کی ان کاروائیوں کی کوئی دافریاد نہ تھی۔ اندرا گاندھی کے سامنے اگر کوئی شکایت کی بھی جاتی تو وہ کہتیں بھگت گاندھی سے کہو۔ ایک عام دہشت پھیلی ہوئی تھی، لوگ ہراساں تھے۔ اس دوران حضرت مولانا، مولانا عبدالغفار صاحب (قیم جماعت اسلامی) سے ملنے تشریف لے

گئے، وہ بھی گرفتار کیے جا چکے تھے، اور لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل میں تھے، ملاقات کے دوران دوسرے قیدی بھی جمع ہو گئے، اس وقت بعض تعلیم یافتہ لوگوں نے جن میں بعض غیر مسلم وکلاء پیش پیش تھے، حضرت مولانا سے عرض کیا کہ وہ اگر وزیر اعظم کو اس سلسلہ میں متوجہ کریں تو شاید وہ کچھ غور کریں۔ حضرت مولانا کو بھی حالات کی نزاکت کا پورا احساس تھا اور ملک جس تیزی کے ساتھ کرپشن کی طرف بڑھ رہا تھا یہ بڑے خطرے کی بات تھی۔ حضرت مولانا نے طے فرمایا کہ جو ہو سکے گا وہ اس سلسلہ میں کریں گے۔ وہاں سے آنے کے بعد مولانا نے کئی مرتبہ خط لکھ کر وزیر اعظم سے ملاقات کا وقت مانگا لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مولانا نے اس خیال سے کہ کب اچانک ملاقات کی صورت نکل آئے، ایک مفصل مکتوب تیار کر لیا اور اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی کر لیا، اور یہی ہوا، اچانک ۲۳ اگست ۱۹۷۶ء کو رائے بریلی میں وزیر اعظم کا پیغام پہنچا کہ کل آپ راشٹر پتی بھون میں مدعو ہیں، آج آپ کی سیٹیں رزرو ہیں، آپ کو دہلی چلنا ہے۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے گفتگو کرنے کے لیے موقع غنیمت جانا، اگرچہ اس میں دوسرا خطرہ بھی تھا کہ کہیں میں گرفتار نہ کر لیا جاؤں۔ حضرت مولانا نے گھر میں اس کا اشارہ بھی دے دیا تھا۔ اسی شام کو اپنے رفقاء کے ساتھ حضرت مولانا دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ صدر موریتانیا کے اعزاز میں لنچ کا اہتمام ہے۔ شاید عربوں سے تعلق کی وجہ سے حضرت مولانا کو مدعو کیا گیا تھا۔ لنچ میں جب مسز گاندھی سے ملاقات ہوئی تو حضرت مولانا نے فرمایا کہ میں نے کئی مرتبہ آپ سے گفتگو کا وقت لینا چاہا لیکن آپ نے کوئی جواب نہیں دیا، اب آپ مجھے اس کے لیے وقت دیں۔ انہوں نے حضرت مولانا کا نظام سفر دریافت کیا، اور دوسرے دن کا وقت دے دیا۔

دوسرے دن ان کے دفتر میں ان سے ملاقات ہوئی۔ حضرت مولانا نے پہلے مکتوب ان کو دیا اور فرمایا کہ وہ اس کو اسی وقت پڑھ لیں تاکہ اس کی روشنی میں گفتگو ہو۔

خط میں حضرت مولانا نے اپنے اسلوب کے مطابق پہلے ان کی خوبیوں کا کچھ تذکرہ فرمایا اور ساتھ ساتھ ان کی ذمہ داریاں جو ملکی سطح پر ان کے سر ہیں ان کا بھی تذکرہ کیا پھر اخیر میں نس بندی کے نتیجہ میں جو خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

”ادھر تقریباً چھ مہینے سے جب سے کہ نس بندی پر عمل کرانے کی مہم شروع ہوئی ہے، صورت حال اور زیادہ خراب ہو گئی ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ آپ تک صحیح حالات و واقعات پہنچنے نہیں دیئے جاتے، ورنہ آپ اس صورت حال کو کسی طرح باقی رہنے کی اجازت نہ دیتیں۔ صورت یہ ہے کہ آپ کے منشاء و مقاصد کے خلاف ریاستی حکومتوں نے اس قانون کے نفاذ اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کو اپنے اقتدار کی بقا اور سرخ روئی حاصل کرنے کا ذریعہ بنالیا ہے، اور اس میدان میں وہ ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتی ہیں، اور اس سلسلہ میں وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو کسی زخم خوردہ انتظامی ذہنیت رکھنے والی غیر ملکی حکومت اور اس کے ایجنٹوں کے ذریعہ کسی ملک کے پر امن شہریوں کے ساتھ ہوتا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ سارا ملک ایک کیسپ میں تبدیل ہو گیا ہے، خوف و ہراس کی ایک فضا قائم ہے، لوگ اپنی مقصد براری کے لیے اور اپنا اپنا نس بندی کا کوٹہ پورا کرنے کے لیے نہایت ذلیل بلکہ وحشیانہ حرکتیں کر رہے ہیں، جس طرح جنگل کے جانوروں اور چڑیوں کا شکار کھیلا جاتا ہے، اس طرح غریب مزدوری کرنے والوں، دیہاتیوں اور شاگرد پیشہ لوگوں کو پکڑا جاتا ہے، اور پیسے کی لالچ دے کر یا دھمکا کر یا پھسلا کر اپنا حساب پورا کیا جاتا ہے، تجارتوں کے لائسنس باقی رکھنے یا نئے لائسنس لینے، حتیٰ کہ روزمرہ کی اشیاء کے حصول کے لیے بھی اس کی شرط لگائی جاتی ہے کہ وہ دوکاندار یا خریدار نس بندی کے اتنے کیس لائے، ملازمین کا طبقہ جو حکومت کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، اور جو ابھی تک مطمئن اور ملک میں سب سے زیادہ باعزت سمجھا جاتا تھا، سب سے زیادہ پریشان ہے، تعلیمی اسٹاف جو نئی نسل کی تربیت کرنے والا ہے بے چینی اور سخت ذہنی انتشار میں مبتلا ہے، ہر مجلس کا یہی موضوع سخن بنا ہوا ہے، اور ہر شخص پریشان نظر آتا ہے۔

اس صورت حال کا قدرتی نتیجہ وہ اخلاقی گراؤٹ ہے جو لالچ یا خوف سے ایک ایسے ملک میں پیدا ہو سکتی ہے، جس میں تعلیم و تربیت کی پہلے بھی کمی تھی، اس کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اہل ملک اس خودداری و خود اعتمادی کی دولت سے محروم ہوتے جا رہے ہیں جو آزادی کی تحریک، کانگریس و خلافت کی جدوجہد، گاندھی جی، مولانا آزاد، علی برادران، نہرو خاندان اور ہمارے قابل احترام سیاسی رہنماؤں کی کوششوں سے، بڑی قربانیوں سے اس ملک میں پیدا ہوئی تھی، سارا ملک اپنے کو غلام، بے بس اور ذلیل محسوس کر رہا ہے، اور اس کو شاید ہی کسی وقت یہ محسوس ہوتا ہو کہ یہ آزاد جمہوری ملک ہے، جو ہر قسم کے جبر و تشدد سے محفوظ ہے اور جس نے اس جدوجہد کے ذریعہ جس کی نظیر دوسرے ملکوں کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے، اپنے کو بدیشی حکومت کی غلامی سے آزاد کر لیا ہے، اور اب وہ اپنی مرضی کے مطابق اس ملک کا نظم و نسق چلا رہا ہے۔“ (۱)

وزیر اعظم نے خط پڑھ لیا تو حضرت مولانا نے اسی اسلوب میں گفتگو شروع کی، پھر یہاں تک فرمایا کہ ”آزادی کی کسی تحریک، جدوجہد اور اس کے قائدین کی ناکامی کے لیے اس سے بڑی بات نہیں ہو سکتی کہ لوگ غلامی کے زمانہ کو یاد کرنے لگیں۔“ پھر فرمایا ”ہم سب کے لیے یہ بڑی شرم کی بات ہے کہ لوگ اب برملا انگریزوں کے زمانہ کو یاد کرنے لگے ہیں، اور اس کی آرزو کرنے لگے ہیں۔“

انہوں نے حضرت مولانا سے دریافت کیا کہ آبادی کو کس طرح کنٹرول کیا جائے، تو حضرت مولانا نے فرمایا کہ پہلے حالات نارمل کیے جائیں، اس لیے کہ اس غیر معتدل فضا میں کسی مسئلہ پر ٹھنڈے دل اور کھلے دماغ سے غور کرنا ممکن نہیں، حالات نارمل ہونے کے بعد ملک کے دانشوروں اور ہی خواہوں کا ایک سیمینار بلا جائے اور اس پر غور کیا جائے۔

اس گفتگو کا وزیر اعظم پر اثر پڑا، اور اس کے پانچ ماہ کے بعد امیر جنسی کے خاتمہ کا

اعلان ہوا۔

اس کے بعد آنے والے الکشن میں امید کے مطابق ان کو شکست ہوئی، وہ اس کے بعد حضرت مولانا کی قیام گاہ ”تکیہ کلاں“ میں حضرت مولانا سے ملنے آئیں، اس وقت بھی حضرت مولانا نے ان کو ملک کی بے لوث خدمت کرنے کا پیغام دیا۔ محسنہ قدوائی بھی ساتھ تھیں، انہوں نے حضرت مولانا سے کہا کہ آپ اندراجی کے لیے دعا کر دیجئے۔ مولانا نے فرمایا کہ ”میں ہر اس شخص کے لیے دعا کرتا ہوں جس سے ملک کو حقیقی فائدہ پہونچے، اور وہ اس کا بے لوث خادم ہو۔“

۱۹۸۰ء میں کانگریس پھر برسرِ اقتدار آئی، کانگریس کا اپنا ایک پس منظر رہا تھا، سیکولرزم کو اس نے اپنی بنیاد قرار دیا تھا، لیکن ۱۹۸۰ء کے بعد سے اندراجی کے دورِ اقتدار میں اس میں نمایاں تبدیلی نظر آنے لگی۔ ہندو اجماعیت کی تحریکوں کو اس نے کھلی چھوٹ دے دی، بلکہ درپردہ اس کی سرپرستی کی، جس کے نتیجے میں اس کا ایک طوفان کھڑا ہو گیا، دشنوہندو پریشد، شیو سینا، اور آریس ایس جیسی فرقہ پرست تحریکات پوری طرح سرگرم عمل ہو گئیں۔

۷/۸ اپریل ۱۹۸۴ء کو ہندو پریشد کے زیرِ اہتمام ایک خفیہ اجلاس بلایا گیا اور اس میں مسلمانوں کی اجتماعی و ملی نسل کشی کی تجاویز پیش کی گئیں، اور اس میں بابری مسجد، گیان داپی مسجد اور متھرا کی عید گاہ کے بارے میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ یہ ہندوؤں کے مذہبی مقدس مقامات ہیں، ان کو ہندوؤں کے حوالے کیا جائے، پورا ہندو پریش اس کے لیے وقف ہو گیا جس کے نتیجے میں پورے ملک میں مذہبی منافرت اور فرقہ واریت کا ایک طوفان کھڑا ہو گیا، اور اس سے مسلمانوں کا ملی تشخص اس ملک میں خطرہ میں پڑ گیا۔

حضرت مولانا نے سب سے زیادہ اس خطرہ کو محسوس کیا، اور یہ اندازہ کر لیا کہ یہ اس ملک کو دوسرا اسپین بنادینے کی ایک سازش ہے جو رچی جا رہی ہے، اس کے مقابلہ کے لیے اگر فوری اقدامات اور موثر تدابیر اختیار نہ کی گئی تو یہ ملک ہاتھ سے نکل جائے گا اور یہ چیز صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ اس ملک کے حق میں بھی کم خطرناک نہیں ہے۔

اس کے لیے حضرت مولانا نے ایک طرف تو مسلمانوں کو جا بجا خطاب کر کے ان کو خطرہ سے آگاہ کیا اور تحفظ ملت کے لیے تیار رہنے اور اس کی فکر رکھنے کی طرف متوجہ کیا،

دوسری طرف جگہ ”پیام انسانیت“ کے اجلاس منعقد کرائے اور اہم ہندوؤں سے ملاقات کر کے ان کو باور کرایا کہ فرقہ دارانہ منافرت خود اس ملک کے لیے کتنی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے، اور اس سے اس ملک کی سالمیت کو بڑا خطرہ لاحق ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت مولانا نے یہ بھی مناسب سمجھا کہ ملک کے قائدین اور حکومت کے اہم عہدہ داروں کو بھی خط کے ذریعہ اس خطرہ سے آگاہ کیا جائے، اس کے لیے مولانا نے ملک کی وزیر اعظم مسز گاندھی کے نام ایک مفصل اور موثر خط لکھا، جس میں مولانا نے خاص طور پر تین چیزوں کی طرف توجہ دلائی ہے: سب سے پہلے اس ملک کے بنیادی ڈھانچے کا تذکرہ فرمایا ہے اور بہت واضح الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ اس ملک کی بقاء، استحکام، ترقی اور عزت کے لیے اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں اور وہ راستہ ہے سیکولرزم کا، جمہوریت کا اور ہندو مسلم اتحاد کا۔ اس کے بعد مولانا ظلم و سفاکی کرنے والوں کے عبرتاً انجام کا تذکرہ فرمایا ہے۔ دوسرے نمبر پر مولانا نے ہندو احمیاء پرستی کی تحریکات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

”اس سلسلہ کی دوسری چیز ہندو احمیت (Hindu Revivalism) کی تحریک، ہندو پریشد، شیو سینا، آریس ایس اور فرقہ پرستی اور جارحیت و تشدد کے کھلے رجحانات کے سلسلہ میں ادنیٰ سی رعایت، چلک اور نرمی ہے جس سے وقتی طور پر خواہ کچھ فائدہ پہنچ جائے یا پریشانی سے بچا جاسکے، ملک کو زمین دوز اور دھما کہ خیز سرنگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا ہے جو بالآخر ملک کو لے ڈوبے گی“۔ (۱)

اخیر میں حضرت مولانا ملک کی اخلاقی گراؤ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”تیسری چیز جو فوری توجہ کی مستحق اور تشویش کا باعث ہے، وہ اخلاقی و انتظامی انتشار (Corruption) ہے جو اس حد تک پہنچ گیا ہے جس کی نظیر کم سے کم مجھے اس ملک کی تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملی، آپ اس سلسلہ میں سرکاری رپورٹوں اور ملک کے نظم و نسق کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور ترقی کو نہ دیکھئے، عام شہریوں، متوسط درجہ کے آدمیوں، اور ان لوگوں سے

پوچھتے جن کا عدالتوں، دفاتر، ریلوے، ہوائی سروس، پولیس، تھانوں، ٹیلیفون، اسپتالوں، سرکاری ٹھیکوں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے کام پڑتا رہتا ہے، رشوت کے بغیر ادنیٰ درجہ کا کام نہیں ہو سکتا، پیسہ کے ذریعہ ہر کام کرایا جاسکتا ہے، ہر مجرم کو چھڑایا جاسکتا ہے، ہر شریف انسان کو پھانسا جاسکتا ہے، ہر طرح کا غلط فیصلہ حاصل کیا جاسکتا ہے، ہر جگہ فساد کرایا جاسکتا ہے، یہاں تک کہ ملک کے راز بھی بیچے جاسکتے ہیں، دواؤں اور غذاؤں میں ملاوٹ ہو رہی ہے، طبی امداد ملنی مشکل ہو رہی ہے، مریضوں کے لیے جو انتظامات ہیں وہ بیکار جا رہے ہیں، سنگدلی اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے، ریلوے، ہوائی سروس میں رشوت کی گرم بازاری سے حکومت کو روزانہ لاکھوں، کروڑوں روپے کا نقصان ہو رہا ہے، اس سب کی جڑ میں پیسہ کی حد سے بڑھی ہوئی محبت، خدا کا خوف دل سے نکل جانا اور انسان سے ہمدردی، ملک سے وفاداری اور اس کے مفاد کو ترجیح دینے اور اس کے نقصان کا خیال رکھنے کے جذبہ کا ختم ہو جانا ہے، ایسی صورت میں ملک صنعتی طہر پر، سیاسی طور پر اور خارجی تعلقات کی بنیاد پر، ترقی اور تعلیم کی اشاعت اور خواندگی کا تناسب بڑھ جانے کے باوجود تیزی سے زوال کی طرف جا رہا ہے، لوگ زندگی سے عاجز ہیں، اور آخری شرم و ناکامی کی بات یہ ہے کہ انگریزوں کے دور غلامی کو یاد کرتے اور اس کی تمنا کرتے ہیں۔ جب انتظامیہ چوکس تھی، ریلیں وقت پر چلتی اور پہونچتی تھیں، ہسپتال اطمینان و خوشی اور خدمت و راحت کے ٹھکانے تھے، نوجوان اپنی محنت و لیاقت سے پاس ہوتے تھے، تقرریاں اور ترقیاں قابلیت اور استحقاق کی بنا پر ہوتی تھیں، اب یہ سب چیزیں خواب و خیال ہو گئیں۔“ (۲)

یہ مولانا کا بڑا طاقتور اور مؤثر خط تھا جو انہوں نے مسز گاندھی کو لکھا تھا، لیکن عجیب بات

(۱) اس کی تفصیلات آئندہ باب میں ذکر کی جائیں گی۔

(۲) کاروان زندگی سوم صفحہ : ۸۸-۸۹

ہے کہ خط ان تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنے محافظین کے ہاتھوں ہلاک کر دی گئیں، ہلاک کرنے والا چوں کہ سکھ فرقہ سے تعلق رکھتا تھا، اس لیے قدرتی طور پر اکثریتی طبقہ میں اس فرقہ کے خلاف شدید غم و غصہ پیدا ہوا، بے دریغ سکھوں کو قتل کیا گیا، ان کی دکانیں لوٹی گئیں، اور ہر طرح کا ظلم ان پر روا رکھا گیا۔ حضرت مولانا کے وطن رائے بریلی میں سکھوں کی بڑی تعداد ہے، وہاں بھی ان کی دکانوں کا مال لوٹا گیا۔ حضرت مولانا نے اپنی مجلس میں یہ بات فرمائی کہ ”لوٹا ہوا مال جس گھر میں جائے گا وہاں مصیبتیں آئیں گی“۔ اس جملہ نے پورے شہر پر اثر کیا اور لوگوں نے لوٹا ہوا مال واپس کر دیا۔ سکھ اس پر حضرت مولانا کے شکر گزار ہوئے۔

مسٹر راجیو گاندھی

اندرا گاندھی کے بعد ان کے بڑے بیٹے راجیو گاندھی ان کے جانشین ہوئے، ان کا ذہن نسبتاً کھلا ہوا تھا اور ان میں وہ تنگ نظری نہیں تھی جو ان کے پیش روؤں میں تھی، ان ہی کے زمانہ میں ”شاہ بانو کیس“ کا قصہ کھڑا ہوا اور بحیثیت صدر مسلم پرسنل لا بورڈ حضرت مولانا نے ان سے بار بار ملاقاتیں کیں۔ حضرت مولانا کا طرز عمل و طرز فکر دیکھ کر ان پر گہرا اثر پڑا۔ اور انہوں نے بورڈ کی پوری مدد کی، پارلیمنٹ سے بل منظور کرایا۔ (۱) اس کے بعد حضرت مولانا نے ان کو شکریہ کا خط لکھا، جس میں شکریہ کے ساتھ بڑی حکمت سے ان کو ملک کی دوسری خرابیوں کی طرف متوجہ فرمایا، جن کی طرف ملک بڑھ رہا تھا، اس خط کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے :

”مسلم مطلقہ بل کی منظوری پر اپنے جذبہ، شکریہ، اعتراف کا اظہار کرنے کے ساتھ اور کچھ اس سے زائد میں آپ سے اپنے اس یقین، مطالعہ اور عقیدہ کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت ملک کی قیادت بلکہ اس کی حفاظت کا راستہ حقیقت پسندی، واقعات و حقائق کو تسلیم کرنے، اصول پسندی اور اخلاقی جرأت، وسیع النظری اور فراخ دلی میں منحصر ہے، اور یہ وہی

(۱) اس کی مزید تفصیلات آئندہ باب میں انشاء اللہ ذکر کی جائیں گی۔

راستہ ہے جو ہندوستان کی تحریک آزادی کے قائدین اور ملک کے صف اول کے رہنماؤں نے دکھایا تھا، اور اس پر چل کر ملک کو آزاد کرایا تھا۔ اس ملک کے لیے جس کے لیے شروع سے مختلف مذاہب، تہذیبوں، زبانوں اور ثقافتوں کا مرکز ہونا مقدر ہو چکا ہے، صحیح جمہوریت، سیکولرزم، ہر ایک کا احترام اور اس کو ترقی کرنے اور ملک کی تعمیر و ترقی میں جوش و خروش کے ساتھ حصہ لینے کا موقع دینا ہی صحیح طریق عمل ہے۔ تعصب، تشدد، تنگ نظری، جذباتیت، اور سوئی ہوئی تاریخ کو جگانا، سوئے ہوئے شیر کے جگانے کے مرادف ہے جو کسی پر رحم نہیں کھائے گا۔

اس ملک کے لیے سب سے بڑا خطرہ تشدد کا وہ رجحان ہے جو ادھر چند برسوں (اور چند مہینوں سے خاص طور پر) ابھر کر سامنے آ گیا ہے، اور جس کے گاندھی جی سخت مخالف تھے، اور اس سے شدید خطرہ محسوس کرتے تھے، اس لیے کہ آگ کو جب باہر کی کوئی چیز کھانے کو نہیں ملتی تو وہ اپنے کو کھانے لگتی ہے۔ فرقہ وارانہ منافرت اور تشدد، فرقوں سے آگے بڑھ کر ذاتوں، طبقوں اور پھر خاندانوں اور افراد تک منتقل ہو جائے گا اور پھر ملک کو تباہی سے کوئی بچا نہیں سکتا۔“ (۱)

مسٹروی پی سنگھ

وی پی سنگھ جی جس زمانہ میں برسر اقتدار ہوئے وہ بڑے فسادات اور فرقہ وارانہ منافرت کا زمانہ تھا، اس سے کچھ ہی پہلے بھاگل پور کے خونریز فسادات ہو چکے تھے۔ حضرت مولانا نے خاص طور سے ضرورت سمجھی کہ ان کو حقائق و تاریخ کی روشنی میں ایسے مشورے دیئے جائیں جن میں ملک و ملت کی فلاح ہو، اور حالات میں تبدیلی پیدا ہو۔ اس کے لیے حضرت مولانا نے ایک دستاویزی مضمون تحریر فرما کر اخبارات و رسائل میں دیا اور خاص طور پر اس کا انگریزی ترجمہ جناب یونس سلیم صاحب کے توسط سے وی پی سنگھ کو بھیجا۔ وی پی سنگھ

نے پورا مضمون توجہ سے پڑھا، اس کے اہم حصوں پر نشانات لگائے پھر حضرت مولانا کو ایک خط میں لکھا کہ اس کے مضمون کے اکثر الفاظ سے مجھے اتفاق ہے اور ان کے لیے کوشش کی جائے گی۔

حضرت مولانا نے سب سے پہلے سیاسی تبدیلی کو جمہوریت کی صحت مندانہ علامت قرار دیا اور تحریر فرمایا کہ ”کسی سیاسی پارٹی یا قیادت کا بلا ترجیح و استحقاق کے مدت دراز تک منصب قیادت پر فائز رہنا اور ملک کے نظم و نسق پر حاوی اور قابض رہنا بہت سی خرابیوں کا باعث ہو سکتا ہے۔“ پھر مولانا نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ برسر اقتدار آنے والے کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس تبدیلی کے اسباب تلاش کرے اور اس سے سبق لے۔ اس کے بعد حضرت مولانا نے ترتیب کے ساتھ چند حقائق بیان فرمائے ہیں، اور حکومت پر زور دیا ہے کہ وہ سب سے پہلے ان کی طرف توجہ کرے۔

پھر مولانا نے اقلیتوں کی آزادی اور ان کے حقوق کے تحفظ پر روشنی ڈالی ہے، اور اس میں کسی سیاسی مبصر کا یہ جملہ بھی نقل فرمایا ہے کہ ”تحفظ ہی کافی نہیں بلکہ تحفظ کا احساس اور اطمینان بھی ضروری ہے۔“

اس کے بعد مولانا نے یک جہتی اور اعتماد کی فضا پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے، اور اس کی تدابیر بیان فرمائی ہیں۔ نفرت پھیلانے والی جماعتوں اور سرگرمیوں پر پابندی کو ضروری قرار دیا ہے، اور یہ مطالبہ کیا ہے کہ آزادی کے وقت عبادت گاہوں کی جو حیثیت اور شکل تھی اس کو اسی شکل میں باقی رکھا جائے اور تاریخ کو الٹا سفر نہ کرایا جائے، وہ ایک سویا ہوا شیر ہے اس کو جگانا ہوشمندی نہیں۔

اخیر میں انتظامیہ کی اصلاح کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”اس سب کے ساتھ اس حقیقت کی طرف بھی متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس ملک کی انتظامی انتہی، فرض ناشناسی، رشوت خوری اور پیسہ کی لالچ اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے، اس کے خلاف ایک بڑی ملک گیر عوامی جدوجہد، اخلاقی تحریک اور انتظامیہ کی چوکی اور فرض شناسی کی ضرورت ہے کہ کار پردازان

حکومت اور ہر جگہ کے عملہ کو جلد سے جلد یہ محسوس ہو جائے کہ اس حکومت میں اب بالکل اس کی گنجائش نہیں۔ اس سے عوام میں خود اعتمادی، حکومت کی قدر اور ایک بڑی خوشگوار تبدیلی کا احساس ہوگا جو ملک کے مفاد میں بھی ہے اور حکومت کرنے والی پارٹی کے مفاد میں بھی۔“ (۱)

مسٹر چندر شیکھر

۹ نومبر ۱۹۹۰ء کے پہلے ہی ہفتہ میں وی پی سنگھ سبکدوش کیے گئے اور ان کی جگہ پر چندر شیکھر نے وزارت عظمیٰ کا حلف لیا۔ حضرت مولانا نے ان کے پیشروں کی طرح ان کو بھی مبارکباد کا خط لکھا جس کا اصل مقصد ان کو چند اہم نکات کی طرف متوجہ کرنا تھا، حضرت مولانا نے اس میں چھ باتیں تحریر فرمائیں۔

- ۱۔ انسانی، اخلاقی، اور سچی حب الوطنی کی بنیاد رابطہ عوام (Masscontact) کی کوشش۔
- ۲۔ فرقہ واریت کا زہر جو نصابی کتابوں تک میں شامل ہو گیا ہے نکالا جائے اور غلط فہمیاں اور بدگمانیاں دور کی جائیں۔
- ۳۔ میڈیا غیر ذمہ دار نہ خبریں دینے سے احتیاط کرے، اس کو قابو میں کیا جائے۔
- ۴۔ پولیس میں اخوت و اعانت اور ہمدردی کا انسانی جذبہ اس طرح پیدا کیا جائے کہ لوگ بغیر کسی تفریق کے ان کو اپنا محافظ سمجھیں۔
- ۵۔ مسلم پرسنل لا میں کسی بھی قسم کی مداخلت نہ کی جائے اور اس کو پوری طرح محفوظ رکھا جائے۔
- ۶۔ تاریخ کو الٹا سفر نہ کرایا جائے، ورنہ ملک کی ساری صلاحیتیں اسی میں صرف ہوں گی اور بجائے ترقی کے انحطاط شروع ہو جائے گا۔

نرسمہا راؤ

۱۷ جون ۱۹۹۱ء کو مسٹر نرسمہا راؤ کانگریس کے صدر اور ملک کے وزیراعظم بنائے گئے۔ یکم جولائی ۱۹۹۱ء کو حضرت مولانا نے ان کو بڑا مفصل خط لکھا، جس میں اس وقت کی

(۱) کاروان زندگی چہارم صفحہ ۱۶۰-۱۶۱

صورت حال کی پوری عکاسی ہے، اندیشوں کا اظہار ہے، اور ملک کو بچانے کی تدابیر بھی ہیں۔ سب سے پہلے مولانا نے ان کو مبارک باد دی ہے پھر ملک کی صورت حال بیان کرتے ہوئے بڑی جرأت کے ساتھ فرماتے ہیں۔

”آپ یہ ذمہ داری ایسے موقع پر سنبھال رہے ہیں جب ملک قعر مذلت میں گر گیا ہے“ آگے فرماتے ہیں کہ :

”میں اس نازک موقع پر مذہب، اخلاقیات اور تاریخ و سیاست کا ایک وسیع مطالعہ کرنے والے مصنف اور ایک ایسے محب وطن کی حیثیت سے (جوان معروضات پیش کرنے اور اس عریضہ کے ذریعہ ملک کی سب سے بڑی ذمہ دار شخصیت سے تعلق و رابطہ قائم کرنے کے ذریعہ کوئی سیاسی اقتصادی، معاشرتی اور جماعتی غرض نہیں رکھتا) آپ کی خدمت میں مخلصانہ اور بے غرضانہ طریقہ پر کچھ مشورے اور حقائق پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔“ (۱)

پھر بڑی حکمت کے ساتھ ان کو خط کے مندرجات کی اہمیت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں :

”میں اس وقت آپ کا قیمتی وقت جزوی مسائل، ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت (مسلمانوں) کی شکایات و ضروریات کے تذکرے میں صرف نہیں کروں گا، میں اس وقت جو بھی عرض کروں گا وہ ہندوستان کے عمومی مفاد میں اور اصولی انداز میں ہوگا۔“ (۲)

حضرت مولانا نے سب سے پہلے ان تین بنیادوں کا تذکرہ فرمایا جن پر تحریک آزادی کے قائدین نے ملک کا ڈھانچہ قائم کیا۔ ۱۔ سیکرلزم ۲۔ جمہوریت ۳۔ عدم تشدد اور آپس کا اتحاد، پھر فرمایا کہ اس سلسلہ کی دو چیزیں فوری توجہ کی مستحق ہیں ایک ظلم و تشدد کا بڑھتا ہوا رجحان اور انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کی بے قیمتی دوسرے انتظامی و اخلاقی انتشار، مولانا فرماتے ہیں کہ :

”اس صورت حال کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے، سیاسی مسائل اور انتخابی مہم سے زیادہ اس کے خلاف طوفانی مہم چلانے کی ضرورت ہے، اس کے لیے گاؤں گاؤں، محلہ محلہ جانے کی ضرورت ہے۔ سخت قوانین، عبرت ناک سزاؤں، ابلاغ عامہ کے ذرائع سے کام لینے اور انتظامیہ کو سخت سے سخت قدم اٹھانے کی ضرورت ہے، ورنہ ”نہ رہے گا بانس نہ بچے گی بانسری۔“ (۱)

خط میں مولانا نے وہ بات پھر دہرائی ہے کہ تاریخ کو الٹا سفر نہ کرایا جائے، جو مذہب یہاں جس طرح آزادی کے ساتھ باقی ہیں ان کو اسی طرح رہنے دیا جائے اور پرسنل لاء کا تحفظ کیا جائے، فرقہ وارانہ منافرت کو ہوانہ دی جائے ورنہ اس کی آگ بڑھتے بڑھتے پوری ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی، امن پسند شہریوں کو لقمہ بنا لے گی اور پورا ملک تباہ ہو کر رہ جائے گا۔

اخلاقی انتشار کے سلسلہ میں بھی حضرت مولانا نے وہ باتیں دہرائی ہیں جن کا تذکرہ اندرا گاندھی کے خط میں فرمایا تھا، مولانا کے خط کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے :

”پیسہ کے ذریعہ ہر کام کرایا جاسکتا ہے، ہر مجرم کو چھڑایا جاسکتا ہے، ہر شریف انسان کو پھانسا جاسکتا ہے، ہر طرح کا غلط فیصلہ حاصل کیا جاسکتا ہے، ہر جگہ فساد کرایا جاسکتا ہے، یہاں تک کہ ملک کے راز بھی بیچے جاسکتے ہیں۔“ (۲)

آگے فرماتے ہیں :

”ایسی صورت میں ملک صنعتی طور پر، سیاسی طور پر، اور خارجی تعلقات کی بنیاد پر، ترقی اور تعلیم کی اشاعت اور خواندگی کا تناسب بڑھ جانے کے باوجود تیزی سے زوال کی طرف جا رہا ہے، لوگ زندگی سے عاجز ہیں، اور آخری شرم و ناکامی کی بات یہ ہے کہ انگریزوں کے دور غلامی کو یاد کرتے اور اس کی تمنا کرتے ہیں، جب انتظامیہ چوکس تھی، ریلیں وقت پر چلتی اور پہنچتی تھیں، ہسپتال اطمینان و خوشی اور خدمت و راحت کے ٹھکانے تھے، نوجوان اپنی محنت و لیاقت سے پاس ہوئے تھے، تقرریاں اور ترقیاں قابلیت اور استحقاق

کی بنا پر ہوتی تھیں، اب یہ سب چیزیں خواب و خیال ہو گئیں۔“ (۱)

مسٹر دیو گوڑا

مئی ۱۹۹۶ء کے عام انتخابات میں کسی پارٹی کو واضح اکثریت حاصل نہ ہو سکی چند روز کے لیے بی جے پی برسر اقتدار آئی لیکن پھر اس کو سبکدوش ہونا پڑا۔

۱۳ جون ۱۹۹۶ء کو متحدہ محاذ نے قائد مسٹر دیو گوڑا نے اپنی اکثریت پارلیمنٹ میں ثابت کر دی، اس کے بعد ہی وہ حضرت مولانا سے ملنے دارالعلوم ندوۃ العلماء آئے، احترام و عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے مہمان خانے سے کچھ فاصلہ پر جوتے اتارے اور ننگے پاؤں مہمان خانہ میں داخل ہوئے۔ حضرت مولانا نے ملاقات کے دوران ان کو ملک کی خدمت کی طرف متوجہ کیا اور سماج میں اخوت، رواداری اور امن کی ضرورت بتائی، کچھ دیر بیٹھ کر وہ رخصت ہوئے۔ اس کے بعد حضرت مولانا نے ان کو ایک مکتوب تحریر فرمایا جس میں ان کو مبارک باد دی، ندوے آنے پر شکریہ ادا کیا۔ پھر ملک کی صورت حال واضح فرما کر ان کی ذمہ داری ان کو بتائی۔

سب سے پہلے مولانا نے فرمایا :

”تاریخ عالم، مذاہب کی تعلیمات اور تجربہ بتاتا ہے کہ جس چیز کو سب سے زیادہ کامیابی ہوئی اور ہوتی ہے اور جو چیز تمام مشکلات پر حاصل کرتی ہے، وہ ”خلوص“ اور ” صداقت“ ہے جس سے ناممکن چیزیں ممکن ہو جاتی ہیں اور دشمنیاں دوستی سے بدل جاتی ہیں، اس لیے سب سے زیادہ اسی پر عمل کیا جائے، اور اس کو فتح و کامیابی کا راز سمجھا جائے۔“ (۲)

اس کے بعد مولانا نے انہی تینوں بنیادی اصولوں کو ذکر فرمایا جن پر اس ملک کی بنیاد ہے جمہوریت، سیکولرزم اور عدم تشدد۔ مولانا نے فرمایا کہ ”اس کثیر المذاہب اور متنوع تہذیبوں، زبانوں، ثقافتوں اور معاشرتی نظام رکھنے والے ملک کے لیے یہ ضروری ہے ورنہ

(۱) کاروان زندگی ششم صفحہ : ۲۵۶

(۲) ایضاً صفحہ : ۲۵۷-۲۵۸

یہ ملک میدان جنگ بن جائے گا۔“

اس کو بعد مولانا فرماتے ہیں :

”ضروری ہے کہ ایک تو کسی مذہب میں دخل نہ دیا جائے، اور کوئی ایک عائلی قانون (Personal Law) سب فرقوں اور ملک کے مختلف حصوں پر نافذ کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ اسی طرح میڈیا اور نشر و اشاعت کے ذرائع کو کسی مذہب اور فرقہ کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے اور اس کی مذہب و اہانت کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ نصاب تعلیم اور کورس کی کتابوں میں کسی مذمت و فرقہ کے خلاف ہجو و مذہت اور توہین کے مضامین و اسباق شامل نہ ہونے دیئے جائیں جیسا کہ اس وقت صورت حال ہے، پھر اس کے ساتھ ضروری ہے کہ تاریخ کو پیچھے لے جانے کے بجائے آگے لے جایا جائے اور وہ غلطی نہ کی جائے جو بابر مسجد کے انہدام میں کی گئی، ورنہ اس کا سلسلہ ختم ہونے والا نہیں، جینی بودھ اور دوسرے مذاہب کے لوگ کھڑے ہو سکتے ہیں اور اپنے ان قدیم معبدوں کا مطالبہ کر سکتے ہیں جن کو مندروں اور شوالوں کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ایسے ہی آثار قدیمہ اور قدیم عمارتوں کا معاملہ ہے جن میں مختلف عہدوں میں تبدیلی کی گئی، اور یہ سلسلہ ختم ہونے والا نہیں۔“ (۱)

حضرت مولانا نے اقتدار میں آنے والے ہر وزیر اعظم کو اپنے درد بھرے اور پر مغز مکاتیب سے ملک کی اصلاحات کی طرف متوجہ فرمایا۔ اٹل بہاری واجپئی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں ندوہ آکر مولانا سے ملے، وہ حضرت مولانا کی علالت کا زمانہ تھا۔ اس موقع پر بھی مولانا نے ان کو ملک کی اصلاح و ترقی کی طرف متوجہ کیا اور خطروں سے آگاہ کیا اور ملک کی ان ہی تینوں بنیادوں کو باقی رکھنے کی تلقین کی جن کا تذکرہ اور تلقین مولانا ان کے پیش روؤں سے کر چکے تھے۔ یہ بھی حضرت مولانا کی دعوت و فکر کا ایک روشن باب ہے، جس سے مولانا کی بصیرت و فراست ظاہر ہوتی ہے، اور دعوت کا ایک مؤثر اسلوب سامنے آتا ہے۔

☆☆☆

﴿باب ششم﴾

ملک و بیرون ملک دینی و ملی مسائل اور ان کے حل کی کوشش

حضرت مولانا کا اصل ذوق اگرچہ لکھنے پڑھنے کا تھا تاہم ملت کے درد آشنا بلکہ نبض شناس رہنما کی حیثیت سے مولانا نے ہمیشہ اپنی ذمہ داری محسوس کی، اور جب جب ضرورت پڑی انھوں نے ملت کی ڈولتی کشتی کو بھنور سے نکالنے کی کوشش کی، بارہا مواقع ایسے آئے کہ ان کی ناخدائی سے سفینہ گرداب سے باہر نکل سکا اور ملت کو تحفظ حاصل ہوا۔ مولانا کی ساٹھ سالہ دعوتی زندگی میں اس کی بیسیوں مثالیں ہیں۔ مولانا کی ان کوششوں میں ان کے دو نمایاں امتیازات سامنے آتے ہیں؛ ایک ان کی بصیرت و فراست، دوسرے حکمت و دعوت۔ جن کی بنیادی وجہ ان کی روحانیت اور نور قلبی کے علاوہ ان کا وسیع مطالعہ، نتائج اخذ کرنے کی خداداد صلاحیت ہے جس سے دعوت کے میدان میں انھوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔

وہ مخاطب کے سامنے اصل بات اسی وقت کہتے ہیں جب اس کو اعتماد میں لے لیتے ہیں، اور اعتماد میں لینے کے لیے وہ پہلے ان مشترک قدروں کا تذکرہ فرماتے ہیں جن سے وہ مانوس ہو سکے۔ یہ اسلوب حکمت ان کو وراثت میں ملا ہے۔ حضرت مولانا کے والد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی نے سرسید مرحوم کو جو طویل و مفصل مکتوب تحریر فرمایا تھا وہ اسی کی غمازی کرتا ہے (۱) مولانا نے اپنی اسی حکمت و بصیرت سے مسائل حل فرمائے ہیں، اور ابھی ہوئی گتھیاں سلجھائی ہیں، اور اس سے پورے عالم اسلام نے فائدہ اٹھایا ہے۔

(۱) ملاحظہ ہو: حیات عبدالحی صفحہ ۱۰۲ تا ۹۲

ملک کی آزادی سے پہلے

۱۹۳۹ء میں حضرت مولانا کی پہلی تصنیف ”سیرت سید احمد شہید“ شائع ہوئی جس نے بگڑتے ہوئے ماحول کو تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مولانا محمد منظور نعمانی (۱) نے کتاب پڑھ کر اپنے گھرے تاثر کا اظہار کیا اور اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا کہ ”آپ نے کتاب تصنیف فرمادی، اب یہ بھی فرمائیے کہ عملی طور پر بھی کچھ کرنے کا خیال ہے؟“ حضرت مولانا نے اثبات میں جواب دیا تو مولانا رائے بریلی تشریف لائے۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ ”خاکسار تحریک“ کا فتنہ بڑی شد و مد کے ساتھ اٹھا تھا، نوجوانوں میں اس کی دیوانگی پیدا ہو رہی تھی، جس کے نتیجے میں دین سے دوری بڑھ رہی تھی۔ مولانا نعمانی کا خیال تھا کہ خاکسار تحریک کے متوازی کوئی ایسی تحریک برپا کی جائے جو اس کا علاج کر سکے۔ ان کا یہ بھی اصرار ہوا کہ حضرت مولانا اس کی قیادت قبول فرمائیں۔ حضرت مولانا نے اس سے عذر کیا اور حاجی عبدالواحد صاحب (۲) کا نام لیا کہ ان کو بھی کام میں شریک کیا جائے اور ذمہ داری بھی وہی قبول کریں تو بہتر ہے۔

یہ دونوں حضرات اس فکر کو لے کر صوبہ سرحد تشریف لے گئے۔ وہاں مشورہ میں یہ بات طے ہوئی کہ پہلے اہم دینی مراکز کا دورہ کیا جائے اور اگر کہیں اس طرح کا کام چل رہا ہو تو اس کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ یہاں سے یہ تینوں حضرات اسی خیال سے نکلے اور مختلف مراکز کا دورہ کیا۔ اسی سفر میں پہلی مرتبہ رائے پور، سہارن پور، اور نظام الدین حاضری ہوئی، جس کی تفصیلات مولانا کی خود نوشت سوانح حیات ”کاروان زندگی“ کے صفحات پر موجود ہیں۔

وہ زمانہ انگریزوں سے مرعوبیت کا تھا، جو چیز ”ولایت“ سے آتی بڑی قیمتی سمجھی جاتی، تعلیم یافتہ طبقہ اسی رو میں بہہ رہا تھا۔ حضرت مولانا کو اس کا بڑا احساس تھا کہ ملت کا قیمتی سرمایہ دوسروں کی جھولی میں جا رہا ہے۔ اسی زمانہ میں مولانا مودودیؒ نے اسلامی مسائل پر

(۱) شروع سے حضرت مولانا کے رفیق کار، ممتاز عالم دین، معارف الحدیث کے مصنف اور ماہنامہ الفرقان (گلشن) کے بانی۔

(۲) صوبہ سرحد کے انسپٹر آف اسکول، حضرت رائے پوریؒ کے فیض یافتہ۔

بڑے فاضلانہ مضامین لکھے، جنہوں نے اس تعلیم یافتہ طبقے پر گہرا اثر ڈالا۔ حضرت مولانا نے وہ مضامین پڑھے تو اپنی فکر کی ترجمانی محسوس کی اور مولانا مودودیؒ سے قرب و ارتباط کا سلسلہ شروع ہوا، یہاں تک کہ ”جماعت اسلامی“ میں شمولیت کی نوبت آئی لیکن یہ سلسلہ دو سال سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ مولانا مودودیؒ کے بعد کے بعض مضامین اور کتابوں میں فکر سلف سے انحراف پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں حضرت مولانا اور ان کے رفقاء ”جماعت اسلامی“ سے علاحدہ ہوئے۔ اسی اثناء میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے قرب بڑھتا گیا۔ مولانا کے حالات و خیالات میں حضرت مولانا نے اپنی حکایت دل محسوس کی اور آہستہ آہستہ تبلیغی کام کے لیے یکسوئی اختیار فرمائی۔

حضرت مولانا کو اللہ تعالیٰ نے بڑا وسیع ذہن اور گہری نظر عطا فرمائی تھی، تبلیغی کام کی افادیت کا ہمیشہ ان کو اعتراف رہا، دس پندرہ سال عملی طور پر مولانا اس میں شریک رہے، اور ملک و بیرون ملک اس کے لیے طویل طویل دورے فرمائے اور تادم آخر اس کی سرپرستی فرماتے رہے۔ لیکن دوسری طبی ضروریات اور تقاضے ہمیشہ ان کے پیش نظر رہے اور جب جب ضرورت پڑی وہ اس کے لیے سامنے آئے اور بار بار ایسا ہوا کہ بڑے بڑے فتنوں کے وقت ان کی شخصیت سد سکندری ثابت ہوئی۔

تقسیم کے بعد

ملک آزاد ہوا اور اس کے بعد ہی اس کو تقسیم سے دوچار ہونا پڑا، اس وقت جو کشت و خون ہوا وہ اپنی جگہ، اس کا تصور بھی دل اور جگر کو چھنی کرتا ہے لیکن اس سے بڑا مسئلہ ہندوستان میں باقی ماندہ مسلمانوں کے تحفظ کا تھا، ملت اسلامیہ ہند یہ کی کشتی ڈول رہی تھی، مسلمانوں پر ہراس طاری تھا، اس وقت قدموں کے جمانے اور کھویا ہوا اعتماد بحال کرنے کی بڑی ضرورت تھی۔

غیر مسلم اکثریت برسر عام مسلمانوں کا مذاق اڑانے لگی تھی؛ کوئی کہتا مسلمانوں نے اپنا ملک لے لیا اب وہ یہاں کیوں ہیں؟ کوئی ملی تشخص پر طنز کرتا اور قومی دھارے میں شامل ہو جانے کی دعوت دیتا، کوئی اردو کے رسم الخط کو بدل دینے کا مشورہ دیتا، زخم خوردہ مسلمانوں

کے لیے یہ مشورے زخموں پر نمک پاشی کا کام کر رہے تھے۔ صوبہ اتر پردیش کے دواہم لیڈر پرشوتم داس ٹنڈن (صدر مجلس قانون ساز، اتر پردیش) اور سپورنامند (اس وقت کے وزیر تعلیم جو بعد میں وزیر اعلیٰ بھی ہوئے) اس کام میں آگے آگے تھے۔ حضرت مولانا نے ان حالات میں بڑے طاقتور مضامین لکھے جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ اس میں مولانا نے بڑے دو ٹوک انداز میں ان ”مشوروں“ کے جوابات دیے جو ان لوگوں کی طرف سے مسلمانوں کو دیے جا رہے تھے۔ ایسی صورتحال میں کہ جب عام مسلمانوں پر کسمپرسی کا حال طاری تھا، ان جرأت مندانہ مضامین نے ان کی رگوں میں خون پہونچایا اور فضا میں کچھ اعتدال پیدا ہوا (۱)

”نشانِ راہ“

تقسیم کے بعد ملک کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر مسلمانوں کا مستقبل خطرہ میں نظر آ رہا تھا، ملت کے تحفظ و بقاء کے لیے مستقل پلاننگ کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، اور ناامیدی کی جو ایک عام فضا بن رہی تھی اس کو بدلنے کی ضرورت تھی۔

حضرت مولانا نے اس ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اپنے رفقاء اور معاونین کے مشورے سے ایک مشاورتی اجتماع ضروری سمجھا۔ ۲۶ اگست ۱۹۴۸ء کو لکھنؤ میں مختلف مکاتب خیال کے دردمندوں کو دعوت دی گئی۔ حضرت مولانا کی سرکردگی میں یہ اجتماع ہوا جس میں مولانا نے ”نشانِ راہ“ کے عنوان سے ایک فکر انگیز اور مؤثر مقالہ پیش فرمایا، جس میں اس وقت مسلمانوں کے مسائل و مشکلات کا تجزیہ بھی تھا اور ان کے روشن مستقبل کے لیے راہ عمل کی تجویز بھی۔ مقالہ خون جگر سے لکھا گیا تھا، اس نے خاص اثر کیا۔ جگر مراد آبادی کی فرمائش پر دوسری نشست میں اس کو دوبارہ سنایا گیا۔

مقالہ میں حضرت مولانا نے اس داعیانہ مزاج پیدا کرنے پر زور دیا ہے جو اولین مسلمانوں کی خصوصیت تھی، اور جس ایمانی دعوت نے ان کے لیے پہاڑوں کو موم کر دیا تھا۔ مولانا فرماتے ہیں:

(۱) واضح رہے کہ فضا کو معتدل کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہارویؒ کا تھا جن کی جرأت مندانہ تقریروں نے بڑا کام کیا۔

”یہ دعوت اللہ تعالیٰ کی وہ محبوب دعوت ہے جس کی خاطر اس نے اپنے قوانین قدرت میں تغیر کر دیا ہے، اشیاء سے ان کے خواص سلب کر لیے ہیں اور کبھی ان کی فطرت کے خلاف خواص بخش دیئے ہیں، آگ کو گلزار اور سمندروں کو پایاب کر دیا ہے، پہاڑ اس کے راستہ میں آئے ہیں تو اس کو سرنگوں ہونا پڑا ہے، سمندر اور بہتے ہوئے دریا راستہ میں پڑ گئے تو ان کو راستہ دینا پڑا ہے۔ قیروان کی تاریخ شاہد ہے کہ اژدہوں اور خونخوار درندوں سے اس کے کام میں رکاوٹ محسوس ہوئی تو ان کو جنگل چھوڑ کر چلا جانا پڑا ہے۔ یہ دعوت قوموں اور جماعتوں کے حق میں ”آب حیات“ ہے، جس نے اس کا کوئی جرمہ پی لیا اس پر موت حرام ہے۔ اگر مسلمان اس دعوت کے علمبردار ہیں اور انھوں نے اپنے وجود کو اس دعوت کے وجود میں اس طرح گم کر دیا کہ ان کی زندگی اس دعوت کی زندگی کے مرادف ہو گئی تو فنان کے لیے محال اور بقا ان کے لیے مقدر ہے۔

۔ مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلمان کہ ہے

اس کی اذانوں سے فاش سر کلیم و خلیل۔“ (۱)

مقالہ میں حضرت مولانا نے تین بنیادی کام کرنے کے بتائے ہیں:

۱۔ اسلام کے پیغام کی بڑے پیمانہ پر اشاعت کی جائے اور اس کے لیے قرآن مجید اور سیرت طیبہ کو سامنے رکھ کر، اس طرح ان دونوں کو پیش کیا جائے کہ انسان، اس کو اپنی چیز اور اپنے درد کی دوا سمجھے۔ اس کے لیے وہ سب معقول اور مفید ذرائع استعمال کیے جائیں جو ممکن ہوں۔ مخلوط اجتماعات سے حکیمانہ انداز سے خطاب بھی ہو۔ اس موضوع پر ہندی، انگریزی لٹریچر کی بڑے پیمانہ پر اشاعت بھی کی جائے اور مختلف ہندی و انگریزی رسائل میں وقتاً فوقتاً مضامین بھی لکھے جائیں۔ (۲)

۲۔ دینی ماحول بنانے کی فکر کی جائے اور لوگوں کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے

(۱) نشان راہ ۱۶-۱۷

(۲) حضرت مولانا نے عملی طور پر اس سلسلہ میں جو کوششیں کیں اس کا تذکرہ باب پنجم میں آچکا ہے۔

مشاغل سے وقت نکالیں اور ان کی جماعتیں شرعی نظام کے ماتحت شہروں، قصبات اور دیہاتوں کی طرف بھیجی جائیں۔ شہروں میں وہ شہریوں کے مزاج و حالات کے مطابق دین کی دعوت دیں اور وہاں کے مسلمانوں کو اجتماع کرنے، اہل دین کو اس کی سرپرستی کرنے اور پھر ماہوار جماعتیں نکالنے پر آمادہ کریں اور وہاں کے خصوصی اور ملک کے عمومی دینی ضرورتوں اور دین کے لیے قریبی خطرات کی طرف متوجہ کریں اور دیہاتوں میں وہاں کی دینی سطح اور ضروریات کے تقاضے کے مطابق دین کے مبادی و مہمات کی تلقین کریں اور ان میں دینی احساس اور عملی تبدیلی کی دعوت دیں۔

۳۔ تیسری ضرورت جس کی طرف حضرت مولانا نے متوجہ کیا ہے وہ آزاد دینی درس گاہوں کا قیام ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود و بقا اور ان کے ملی تحفظ کے لیے حضرت مولانا نے اس کو ریڑھ کی ہڈی قرار دیا ہے اور اس کا خطرہ ظاہر فرمایا ہے کہ اگر یہ آزاد دینی مدارس نہ ہوئے تو بڑے پیمانہ پر فتنی اور تہذیبی ارتداد کا خطرہ ہے۔

مولانا نے تحریر فرمایا ہے:

”اس کے لیے قربانی اور ایثار کی ضرورت ہے، راستہ میں دشواریاں اور رکاوٹیں پیش آئیں تو ان کے تحمل کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ نظام تعلیم کے سلسلہ میں ضروری اجتہاد اور اس کی اصلاح و ترقی اور اس کو زیادہ مفید، موثر اور عملی زندگی اور خارجی دنیا سے ہم آہنگ کرنے کے لیے بار بار کوشش کی ضرورت ہے۔ اور اس بارہ میں دین کے اصول و ارکان اور اس کے روح و مزاج کی حفاظت کے معاملہ میں پورے رسوخ، صلاحیت اور استقامت کے ساتھ اس کو زیادہ سہل، قابل عمل اور عام کرنے کے لیے جدت فکر، ذہانت اور وسعت نظر کی ضرورت ہے۔“ (۱)

یہ مشاورتی اجتماع اپنے پیچھے بہتر اثرات چھوڑ گیا، علماء و عمائدین نے یہ فکر قبول کی اور تینوں تجاویز پر مختلف حلقوں کی جانب سے کام شروع ہو گیا۔ اسلام کے تعارف اور اس کے لیے ہندی، انگریزی لٹریچر کی تیاری کا کام ”مجلس تحقیقات و نشریات اسلام“ (لکھنؤ) اور

(۱) نشان راہ۔ اختصار کے ساتھ

حلقہ ”پیام انسانیت“ کے پلیٹ فارم سے انجام پایا۔ تبلیغی نقل و حرکت نے دوسری ضرورت پوری کی اور علماء نے احیائے مدارس کا کام بڑے پیمانہ پر شروع کیا جس کے نتیجہ میں آج الحمد للہ پورے ملک کے طول و عرض میں ہزاروں مدارس دین کی بڑے پیمانہ پر خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان تینوں کاموں کی حضرت مولانا نے ساری زندگی سرپرستی فرمائی، ہمت افزائی کی اور جہاں تک ہوسکا عملی شرکت بھی فرمائی اور کسی قسم کے تعاون سے دریغ نہیں فرمایا۔ مجلس تحقیقات اور پیام انسانیت کا کام حضرت مولانا کی سرپرستی میں آگے بڑھا۔ تبلیغ میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے ساتھ شروع سے مولانا شریک رہے اور اپنی زبان و قلم سے اس کو طاقت پہنچائی۔ متعدد شہروں میں حضرت مولانا کی تحریک سے کام کی بنیاد پڑی۔ عالم عربی میں حضرت مولانا نے اس کی پوری سرپرستی فرمائی۔ تقسیم کے بعد مدارس کا مسئلہ بڑا نازک بن گیا تھا اور ان کا وجود خطرہ میں پڑ گیا تھا، حضرت مولانا نہ صرف یہ کہ ان کے تحفظ کی ابتدائی کوششوں میں شریک رہے بلکہ جا بجا مدارس و مکاتب کے قیام کی تحریک بھی چلائی۔

فسادات اور ہندوستانی مسلمان

ملک کی تقسیم کے دوران بڑے بھیانک فسادات ہوئے تھے، اس کے بعد سے جھٹ پٹ جھگڑوں کو چھوڑ کر کوئی بڑا فساد نہیں ہوا۔ لیکن ۱۹۶۳ء کے اواخر اور ۱۹۶۴ء کے اوائل میں فسادات کی ایک ایسی لہر چلی کہ جس نے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ کلکتہ، جمشید پور، رانچی، راوڑکیلا اس کی زد میں آئے، یہ بڑے بڑے صنعتی شہر تھے جہاں مسلمانوں کو مولیٰ گاجر کی طرح کاٹا گیا، عورتوں کی عزتیں پامال کی گئیں، ہر نفرت انگیز اور شرم ناک حرکت کی گئی، فسادات تو ان خاص شہروں میں ہوئے لیکن پورے ملک کے مسلمانوں کے لیے یہ خطرہ کا سارن تھا، ہر صاحب ضمیر مسلمان کے لیے ایک بڑے فکر اور تشویش کی بات تھی۔

حضرت مولانا تاریخ کے نشیب و فراز سے واقف تھے، ان کی نگاہ نے خطرہ کو بہت دور تک محسوس کیا۔ مولانا اور ان کے رفقاء کو یہ یقین ہو گیا کہ اگر ان فسادات کا سد باب نہ کیا گیا تو کسی ادارہ، تحریک، اور انجمن کی خیر نہیں اور اس ملک میں مسلمانوں کا ملی وجود مشکوک ہو

کر رہے گئے۔ مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور مولانا معین الدین دہلویؒ نے ان شہروں کا دورہ کیا اور حضرت مولانا کو حالات کی سنگینی بتائی، پھر ان دونوں کے مشورے سے حضرت مولانا نے خود بھی ان علاقوں کا دورہ فرمایا۔ حضرت مولانا نے یہ محسوس کیا کہ اب بھی اکثریتی فرقہ میں ایک بڑا طبقہ ایسا موجود ہے جس کا ذہن میلا نہیں ہوا، اور اب بھی اس کے دل میں کسی درجہ عظمت انسانیت پائی جاتی ہے، لیکن اکثریت کو فرقہ پرستی کا روگ لگ چکا ہے، اگر اس پر روک نہ لگائی گئی تو پورا ملک اس کی لپیٹ میں آجائے گا۔ مولانا نے یہ ضرورت محسوس کی کہ اسی طبقہ کے لوگوں کو اس کام کے لیے کھڑا کرنا ہوگا، اسی کی طرف سے یہ تحریک زیادہ مؤثر ہوگی۔

دورہ سے واپسی کے بعد حضرت مولانا نے مشورہ کیا اور مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے ہمراہ دہلی تشریف لے گئے اور جے پرکاش نرائن جی سے ملاقات اور گفتگو فرمائی۔ وہاں سے ناگپور تشریف لے گئے اور ونوبا بھاوے جی سے ملاقات کی اور ان کو ایک میمورنڈم بھی دیا جو پہلے حضرت مولانا نے تیار کر لیا تھا اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی ساتھ رکھ لیا تھا۔ یہ میمورنڈم ”ندائے ملت“ کے ۳۱ اپریل ۱۹۶۳ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مولانا نے فرمایا:

”باہمی اعتماد و محبت پیدا کرنے کے لیے ہمیں ایک مجھوتا نہ اور سرفروشانہ جدوجہد کی ضرورت ہے، ہندوستان تاریخ کے ایک نازک موڑ اور فیصلہ کن دور ہے پر کھڑا ہے، ایک راستہ ہمیشہ کے لیے تباہی، نہ مٹنے والے انتشار اور نہ ختم ہونے والے زوال کی طرف جاتا ہے۔ ایک راستہ ہمیشہ امن و امان، اتحاد و یک جہتی کی طرف جاتا ہے۔ ہر ایسے موڑ پر کچھ ایسے لوگ سامنے آجاتے ہیں جو تاریخ کا رخ اور واقعات کا دھارا بدل دیتے ہیں، ان کی دلیری، ان کی صاف گوئی اور ان کی جاں بازی، پورے پورے ملک اور قوم کو بچالے جاتی ہے، اکثر ایسے لوگ سیاست و حکومت کے ایوانوں سے باہر، ملک کے بے لوث خادموں اور سچے روحانی اور درویشوں میں پائے جاتے ہیں، جن کی نیتوں پر شبہ نہیں جاتا، جن کی صداقت اور بے غرضی مسلم ہوتی ہے، اور ان کا ماضی ہر داغ سے پاک ہوتا ہے۔“

ہم اسی امید پر آپ کے یہاں آئے ہیں کہ آپ اس نازک موقع پر ملک کی قیادت کریں گے اور اپنے پورے خلوص، عزم، قربانی کے جذبہ اور انسانیت دوستی کا بوجھ ڈال دیں گے۔“ (۱)

حضرت مولانا نے اپنے رفقاء کے ساتھ ان سے گفتگو بھی فرمائی اور حالات کی سنگینی کا تذکرہ فرمایا، وہاں قیام کے دوران ہی جے پرکاش جی بھی آگئے، وہاں بھی ان سے ملاقات ہوئی اور حالات کا تذکرہ ہوا، مگر ان دونوں نے اس کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔

”مسلم مجلس مشاورت“ کا قیام

حضرت مولانا نے جن دو آدمیوں کا انتخاب ملاقات کے لیے کیا تھا، ان سے اس سلسلہ میں اچھی امیدیں تھیں اور وہ کچھ کر بھی سکتے تھے لیکن ان کی سردمہری کے بعد مولانا اور ان کے رفقاء نے اندازہ کر لیا کہ اب اس کا حل صرف یہی ہے کہ مسلمانوں میں قیادت پیدا ہو اور وہ اس کام کے لیے آگے آئیں۔

ڈاکٹر سید محمود صاحبؒ جو اہم سرکاری عہدوں پر رہ چکے تھے، کانگریس کے سکریٹری کی حیثیت سے بھی انہوں نے کام کیا تھا، ان حالات نے ان کو خاص طور پر متاثر کیا۔ انھوں نے حضرت مولانا سے اور دوسرے اہم قائدین سے رابطہ قائم کیا اور مشورہ کے بعد یہ بات طے ہوئی کہ ایک مشاورتی اجتماع بلایا جائے جس میں تمام جماعتوں کی نمائندگی ہو اور ملک کے اہم لوگ اس میں شریک ہوں۔

یہ اجتماع دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں طے ہوا (۲) حضرت مولانا اور مولانا نعمانی نے اس کی ذمہ داری قبول کی اور بحیثیت ناظم ندوۃ العلماء خود مولانا اس کے اصل داعی قرار پائے۔

اس زمانہ میں حضرت مولانا کو آنکھ کی تکلیف چل رہی تھی، اجلاس کے لیے ۹/۸/۱۹۴۷ء کی تاریخیں طے ہوئیں۔ اس سے ایک مہینہ پہلے ہی مولانا نے بمبئی میں آنکھ کا

(۱) کاروان زندگی۔ اول صفحہ ۵۰۰-۵۰۱

(۲) ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد میں یہ بات داخل تھی کہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں اور مختلف الخیال افراد میں اتحاد پیدا کیا جائے اور دریاں ختم کی جائیں۔

آپریشن کرایا تھا، اور اس کی تکلیفیں جاری تھیں کہ اجلاس کی تاریخیں بالکل قریب آگئیں۔ مولانا نعمانی نے حضرت مولانا سے خطبہ استقبالیہ کی فرمائش کی۔ مولانا نے اس موقع پر کسی رسمی خطبہ استقبالیہ کے بجائے مناسب سمجھا کہ چند خیر مقدمی کلمات کے ساتھ اجلاس کے اغراض و مقاصد پر روشنی دالی جائے اور مسائل کا حل پیش کیا جائے۔ مولانا نے اس دھکتی ہوئی آنکھ اور دُکھتے ہوئے دل کے ساتھ خطبہ قلم بند کروایا۔ آنکھ میں بار بار ٹینشن ہوتا تھا اور تکلیف شدت پکڑتی تھی لیکن دردِ دل غالب آیا اور خطبہ مکمل ہو گیا۔

بڑی حساس فضا میں اجلاس شروع ہوا، ملک کی تمام اہم جماعتوں کے سربراہان اور ذمہ داران شریک تھے۔ ان کے علاوہ بھی مشہور سرکردہ علماء و قائدین حصہ لے رہے تھے۔ مقصد پر سب کا اتفاق تھا، مگر جب مسئلہ اجمال سے تفصیل پر آیا تو مسلمانوں کا وہ پرانا مرض ابھر کر سامنے آ گیا اور اختلافات پیدا ہونے لگے اور یہ خطرہ ہونے لگا کہ اجلاس ناکامی کا شکار ہو جائے گا۔ حضرت مولانا کو آنکھ کی تکلیف کی وجہ سے تقریر سے منع کیا گیا تھا لیکن یہ صورت حال سامنے آئی تو مولانا برداشت نہ کر سکے۔ ڈاکٹر فریدی صاحب (۱) نے اشارہ بھی کیا لیکن وہی دردِ دل غالب آیا اور مولانا نے جوش اور تاثر سے بھری ایسی تقریر کی کہ وہ پہلا اجلاس تو کامیابی کے ساتھ ختم ہوا لیکن آنکھ کی کیفیت متاثر ہو چکی تھی۔ اور مولانا کا تو یہ وطرہ تھا کہ

۔ اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں

اک جان کا زیاں ہے سوا یسا زیاں نہیں

اس کھلے اجلاس میں باقاعدہ کوئی نظام طے نہیں ہو سکا تھا، اس لیے اس کی دوسری مخصوص نشست رکھی گئی جس میں صرف قائدین جماعت اور اہم ترین لوگ شریک ہوئے۔ اس موقع پر بھی حضرت مولانا نے اس کی کامیابی کے لیے اپنی شخصیت کا پورا وزن ڈال دیا اور اسی وقت ”مسلم مجلس مشاورت“ کی تشکیل ہو گئی۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب کو اس کا صدر منتخب کیا گیا اور مختلف جماعتوں کی مناسب نمائندگی رکھی گئی۔

اس اقدام سے دکھے ہوئے دلوں کو تسکین ملی، ملت کی ایک اہم ضرورت پوری ہوئی،

(۱) ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، مشہور ملی قائد اور ”مسلم مجلس“ کے بانی

جگہ جگہ اس کا پر زور استقبال ہوا، مسلمانوں نے زندگی کی ایک نئی لہر محسوس کی۔
 مجلس کی تشکیل کے بعد ارکان نے سب سے پہلے یہ طے کیا کہ ان شہروں کے دورے ہونے چاہئیں جو فسادات کی آگ میں جھلس چکے ہیں اور دورہ کے لیے جس وفد کی تشکیل ہو اس میں تمام اہم جماعتوں کے سربراہان شریک ہوں۔ حضرت مولانا کو بھی اس میں خاص طور سے شامل کیا گیا۔

ستمبر ۱۹۶۲ء کے دوسرے ہفتے سے یہ دورہ شروع ہوا، رانچی، چکر دھر پور، جانی باسا اور جمشید پور کے جلسوں میں حضرت مولانا کے کلیدی خطابات ہوئے۔ جمشید پور کے آگے کی منزل راڈ کیلا تھی مگر حضرت مولانا ایک اہم بیرونی سفر کی وجہ سے وہاں تشریف نہیں لے جاسکے۔

اس دورہ کا خاص اثر یہ پڑا کہ ان شہروں میں جہاں کچھ دنوں پہلے فرقہ وارانہ منافرت کے نتیجہ میں اقلیتی فرقہ پر مظالم ڈھائے گئے تھے وہاں اکثریتی فرقہ کے لوگ کھلے عام اس کی مذمت کرتے تھے اور اس کو پورے ملک کے لیے ناسور قرار دیتے تھے۔ یہ بڑی خوش آئند تبدیلی تھی جو ان پروگراموں کے نتیجہ میں ظاہر ہوئی تھی۔

دسمبر ۱۹۶۲ء میں مجلس کا دوسرا دورہ گجرات کا ہوا۔ حضرت مولانا اس میں بھی بنیادی رکن کی حیثیت سے شریک تھے۔ صدر مشاورت کے دل میں حضرت مولانا کے لیے بڑی محبت و عقیدت کے جذبات تھے۔ حضرت مولانا کی بات وہ نہیں ٹالتے تھے، بار بار ایسا ہوا کہ کسی مسئلہ پر تمام ارکان کے اصرار کے باوجود وہ تیار نہیں ہوئے لیکن حضرت مولانا کے کہنے سے انہوں نے اپنی رائے بدل دی۔

احمد آباد اسی سفر کی پہلی منزل تھی، اس کے مضافات میں بھی بہت کامیاب جلسے ہوئے۔ اس کے بعد بڑودہ کا سفر ہوا جہاں ارکان مجلس کا زبردست استقبال ہوا۔ شام کو کامیاب جلسہ ہوا۔ دوسرے دن فجر بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ حضرت مولانا ”پرانے چراغ“ میں ڈاکٹر سید محمود صاحب کے تذکرہ میں اس کو نقل فرماتے ہیں:

”ہم لوگ نماز فجر کے بعد اپنی قیام گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ

اچانک چند لوگ مکان میں داخل ہوئے، وہ سخت سر اسیمہ اور بدحواس تھے۔ انہوں نے کہا کہ پاس کا ایک مکان زمین میں دھنس رہا ہے۔ خواب میں متواتر بتایا گیا تھا کہ بعض گناہوں اور بد اعمالیوں کی وجہ سے یہ مکان زمین میں دھنسا دیا جائے گا، چنانچہ اس کے اثرات شروع ہو گئے ہیں اور مکین و اہل محلہ سب خائف ہیں، آپ حضرات چل کر وہاں دعا کر دیں۔ ہم لوگ ”ایاز قدر خود را شناس“ کے اصول پر اپنی حیثیت سے واقف تھے لیکن جہاں تک دعا کا تعلق ہے ہم اس اس سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ ڈرتے ڈرتے اور شرماتے ہوئے ہم لوگ وہاں جا کر کھڑے ہوئے اور دعا کی، اللہ کی شان مکان کا دھنسا فوراً بند ہو گیا، اور وہ اس وقت سے (جہاں تک ہم کو معلوم ہے) ابھی تک قائم ہے۔ میں تو اس واقعہ کو بھول گیا تھا لیکن مفتی صاحب (۱) نے کئی بار یاد دلایا۔ مسلمان جماعتوں کے نمائندے اس وفد میں موجود تھے، ان سب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور جس سے جو بن آیا اس نے دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ملت کی اس اجتماعیت کی شرم رکھ لی۔ کس وجہ سے یہ آتی ہوئی آفت ٹل گئی وہ اللہ کو معلوم ہے لیکن واقعہ مجلس کی طرف منسوب ہو گیا اور شہر میں اس کا خاصا چرچہ ہوا۔“ (۲)

آگے کی منزل میں بھروچ اور سورت میں بڑے کامیاب جلسے ہوئے۔ ہر جگہ وفد کا ایسا عظیم الشان استقبال ہوا جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ مجلس مشاورت کا سب سے کامیاب دورہ ریاست میسور کا ہوا جس کا آغاز مدراس سے ہوا اور گلبرگہ پر اس کا اختتام ہوا۔ بنگلور، منگلور، میسور، ہاسن، بلسار، بیجاپور اس کی خاص منزلیں تھیں۔ اس دورہ میں ہندو مسلم اتحاد کے وہ مناظر سامنے آئے جس نے تحریک خلافت کی یاد تازہ کر دی۔ ارکان مشاورت کے ان دوروں کے علاوہ اور بھی دورے ہوئے جو بہت کامیابی کے ساتھ مکمل ہوئے۔ دورہ ریاست میسور کو مجلس مشاورت کا شباب کہا جاسکتا ہے، مگر اس شباب کو ایسی نظر لگی کہ اس میں

(۱) مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی مسلم مجلس مشاورت کے دوسرے صدر۔

(۲) پرانے چراغ اول صفحہ ۳۸۶-۳۸۷ طبع پنجم

اس کے بعد جلد ہی اضحلال شروع ہو گیا اور تھوڑی مدت میں بڑا کام کر کے مجلس انتشار کا شکار ہو گئی۔ بقول حضرت مولانا کے:

”یہ مسلمانوں کی ملی زندگی کی تاریخ میں ایک نیا ورق تھا جس کو اگرچہ باد صرصر کے جھونکوں نے جلد الٹ دیا لیکن اس کو ملت اسلامیہ ہند کا کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔“ (۱)

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ پوری اجتماعیت کے ساتھ مجلس مشاورت کو کام کرنے کا بہت کم موقع ملا، لیکن اس تھوڑے ہی عرصہ میں حالات میں اعتدال پیدا ہوا، مسلمانوں میں اعتماد کی فضا بحال ہوئی، اور مثبت، تعمیری، تعلیمی، اور رفاہی کاموں پر خطرات کے جو بادل منڈلا رہے تھے وہ چھٹ گئے۔

”آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ“

آزادی کے بعد ملک کے لیے جو قانون تیار کیا گیا اس میں تمام مذاہب کے ماننے والوں کو آزادی دی گئی، اور حکومت کی بنیاد سیکولر ازم پر رکھی گئی، یہ بڑی خوش آئند بات تھی، اس میں مسلم پرسنل لا کا تحفظ بڑی حد تک تھا لیکن اس میں بعض دفعات ایسی بھی تھیں جن سے یہ تحفظ مشکوک ہو رہا تھا۔ دفعہ ۴۴ یکساں سول کوڈ سے متعلق ہے اور اس میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ”مملکت یہ کوشش کرے گی کہ بھارت کے پورے علاقہ میں

شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ کی ضمانت ہو۔“ (۲)

ملک کے متعدد قومی ہندوؤں کے ذہن بھی اس سلسلہ میں صاف نہیں تھے۔ ۱۹۵۶ء میں جب ہندو لا میں ترمیم کی گئی اور ”ہندو کوڈ بل“ پاس ہوا تو اس وقت کے وزیر قانون مسٹر پائلسکر نے کہا:

”ہندو قوانین میں جو اصلاحات جاری ہیں وہ مستقبل قریب میں

ہندوستان کی تمام آبادی پر نافذ کی جائیں گی۔“ (۳)

(۱) پرانے چراغ۔ اول صفحہ ۳۹۰

(۲) بھارت کا آئین صفحہ ۶۲، شائع کردہ قومی کونسل برائے فروغ اردو (دہلی)

(۳) جہد مسلسل صفحہ ۱۸

۱۹۷۲ء میں متنبی بل پاس ہوا جس میں لے پالک کو وہ تمام حقوق دیے گئے جو بیٹے کو حاصل ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ قانون اسلامی شریعت سے متصادم تھا اور ایک طرح سے ”یکساں سول کوڈ“ کی طرف عملی قدم تھا، اس لیے کہ یہ ایک عمومی قانون تھا جس میں کسی قسم کا کوئی استثناء نہیں تھا۔ اس بل نے مسلمان علماء و قائدین کے کان کھڑے کر دیئے۔ حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ (مہتمم دارالعلوم دیوبند) نے دارالعلوم دیوبند میں ایک مشاورتی نشست رکھی، وہاں یہ بات طے کی گئی کہ ہندو گریہ پیمانہ پر مسلم پرسنل لاکونشن بلانے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں اولین تحریک کرنے والوں میں مولانا سید منت اللہ رحمانی (امیر شریعت بہار و اڑیسہ) کا نام سرفہرست تھا جو ایک بیدار مغز اور صاحب بصیرت عالم تھے۔ ان حضرات کی تحریک پر بمبئی میں ۲۸/۲۷ دسمبر ۱۹۷۲ء کو مسلم پرسنل لاکونشن منعقد ہوا جس میں پورے ملک کے علماء اور دانشوروں کی بھرپور نمائندگی تھی، ہر فرقہ کے اہم لوگ اس میں شریک تھے۔ یہ ایک اہم ملی مسئلہ تھا۔ حضرت مولانا اس وقت حجاز مقدس میں تھے اور حج کا زمانہ قریب تھا لیکن مسئلہ کی نزاکت و اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے کنونشن میں شرکت کے لیے واپس تشریف لے آئے۔ اسی کنونشن میں ”آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ“ کی تشکیل ہوئی اور اس کے اگلے اجلاس حیدرآباد، ۱۸/۱۷ اپریل ۱۹۷۳ء میں قاری محمد طیب صاحبؒ کو صدر اور مولانا منت اللہ رحمانیؒ کو جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا، اور پہلے اجلاس بمبئی میں جو نمائندہ حضرات شریک تھے ان سب کو بورڈ کا بنیادی رکن نامزد کیا گیا۔

بورڈ نے بنیادی طور پر دو ذمہ داریاں قبول کیں:

- ۱۔ ہندوستان میں ”مسلم پرسنل لا“ کے تحفظ اور شریعت ایکٹ کے نفاذ کو قائم اور باقی رکھنے کے لیے مؤثر تدابیر اختیار کرنا، اور بالواسطہ یا بلاواسطہ متوازی قانون سازی جس سے قانون شریعت میں مداخلت ہوتی ہو خواہ وہ قوانین پارلیمنٹ میں یا ریاستی مجلس قانون سازی میں وضع کیے جا چکے ہوں یا آئندہ وضع کیے جانے والے ہوں یا اس طرح کے عدالتی فیصلے جو مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا ذریعہ بنتے ہوں انھیں ختم کرانے یا مسلمانوں کو اس

سے مستثنیٰ قرار دیے جانے کی جدوجہد کرنا۔

۲۔ مسلمانوں کے عائلی و معاشی زندگی کے بارے میں شرعی احکام

و آداب، حقوق و فرائض اور اختیارات و حدود سے واقف کرانا اور اس سلسلہ

میں ضروری لٹریچر کی اشاعت کرنا۔“ (۱)

بورڈ کی تشکیل کے بعد سب سے پہلا مسئلہ متنبی بل کا تھا، اس کے لیے پورے ملک میں فضا بنائی گئی، احتجاجی جلسے منعقد کیے گئے اور حکومت سے رابطہ قائم کر کے بورڈ کے ذمہ داروں نے مسئلہ کی نزاکت بتائی اور بل واپس لینے کا مطالبہ کیا۔ کئی سال کی کوششوں کے بعد ۱۹۷۸ء میں جتنا حکومت کے دور میں بورڈ کو کامیابی ہوئی اور حکومت نے بل واپس لے لیا۔

۱۹۷۸ء ہی میں مسلم مطلقہ کے لیے تاحیات یا تانکاح ثانی سابق شوہر سے نفقہ کے متعلق نیا ضابطہ فوجداری کالاگو ہوا۔ اس سلسلہ میں بورڈ کے ذمہ داروں نے اس وقت کی وزیراعظم اندرا گاندھی سے ملاقات کی اور اس میں بورڈ کو کامیابی حاصل ہوئی اور آئین میں کچھ ترمیم کر دی گئی۔

قاری صاحب کی قیادت میں بورڈ کا سفر جاری رہا، درمیان میں دو ایک مرتبہ قیادت کی تبدیلی کی بات بھی زبانوں پر آئی اور حضرت مولانا کولوگوں نے قیادت قبول کرنے پر آمادہ کرنا چاہا لیکن حضرت مولانا نے سختی سے انکار کیا اور فرمایا کہ ”طوفان میں کشتی نہیں بدلی جاتی“۔ قاری صاحب کو بھی مولانا سے خاص تعلق تھا۔ اخیر کی ملاقات میں فرمایا کہ ”مولانا! جی چاہتا ہے کہ کچھ دن تکیہ آکر آپ کے پاس رہوں“۔

۱۷ جولائی ۱۹۸۸ء میں قاری صاحب نے وفات پائی اور اس کے اگلے اجلاس میں جو مدراس میں ہو رہا تھا بالاتفاق حضرت مولانا کو صدر منتخب کیا گیا۔ اس اجلاس میں حضرت مولانا اپنی علالت کی بنا پر شریک نہیں ہو سکے تھے، مولانا کو جب اس کی اطلاع ملی تو ملت کی ضرورت سمجھ کر انھوں نے اس منصب کو قبول فرمایا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

”جب مجھے اس کی اطلاع ہوئی تو ”سنگ آمد و سخت آمد“ کا مضمون

(۱) دستوراسی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ صفحہ ۵۔

تھا۔ یہ فیصلہ میری افتاد طبع، صحت جسمانی، عمر اور دوسری ذمہ داریوں سے میل نہیں کھاتا تھا۔ اگر یہ کسی سیاسی، ملی تنظیم اور باعث افتخار و اعزاز منصب کے قبول کرنے کا معاملہ ہوتا تو میں بغیر کسی ادنیٰ تردد کے انکار کر دیتا لیکن ایک تو مسئلہ کی نوعیت و اہمیت کی وجہ سے (جس کو میں اپنے عقیدہ کا جزء اور مسلمانوں کی ملی زندگی کے لیے شہ رگ کا درجہ دیتا ہوں) دوسرے مولانا سید منت اللہ رحمانی کے احترام کی بنا پر (جن کا بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کے فرزند ہونے کی وجہ سے ہمیشہ لحاظ کرتا رہا ہوں) چارونا چار قبول کرنا پڑا۔ دوستوں کی اس بات کو بھی اس میں دخل تھا کہ اس وقت بورڈ کو اختلاف و انتشار سے بچانے کے لیے بھی ایسا کرنا ضروری ہے۔“ (۱)

”یونین فارم سول کوڈ“ کے خلاف مولانا کی سعی

حضرت مولانا کے صدر منتخب ہونے کے بعد پہلا عظیم الشان اجلاس کلکتہ میں ہوا جس میں حاضرین کی تعداد محتاط اندازہ کے مطابق پانچ لاکھ تھی۔ حضرت مولانا نے اپنی صدارتی تقریر میں مسلمانوں کے عالمی قانون کی اہمیت بیان فرمائی اور دو ٹوک انداز میں واضح کر دیا کہ یہ نظام آسمانی ہے اور وحی کے راستہ سے یہ شریعت مسلمانوں کو ملی ہے، اس میں ان کو ذرہ برابر تبدیلی کا حق نہیں اور نہ ہی وہ اس کو گوراء کر سکتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ ”یکساں سول کوڈ کے لیے کوشش ایک بے سود عمل ہے، ملک اور اہل ملک کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے اس کو ملک کی تعمیر و ترقی میں لگنا چاہیے۔ کیا ضرورت ہے کہ اس کو ایک بے سود عمل میں صرف کیا جائے!“ پھر حضرت مولانا نے بڑی صراحت سے فرمایا :

”ضروری بات یہ ہے کہ دین اسلام کے دائرہ کو سمجھ لیا جائے۔ اس بارہ میں مذاہب میں خود اختلاف ہے اور اس میں درجوں کا فرق ہے، کئی مذاہب ایسے ہیں کہ وحی و نبوت سے ان کا آغاز ہونے کے باوجود انھوں نے مذہبی زندگی کو ایک خاص دائرہ میں محدود کر لیا، مثلاً عبادات کے دائرہ

میں۔ لیکن اسلام کا معاملہ یہ نہیں ہے، اسلام میں دین کا دائرہ پوری زندگی پر محیط ہے، یہ ایک اساسی حقیقت ہے جو عبد و معبود کے تعلق کو سمجھے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی۔ ہر مسلمان خدا کا فرماں بردار بندہ ہے اور اس کا تعلق خدا سے دائمی ہے، عمومی ہے، عمیق بھی ہے اور وسیع بھی ہے۔“ (۱)

پھر حضرت مولانا نے ثابت کیا کہ یکساں سول کوڈ ہونے کے باوجود قومیں آپس میں کس طرح لڑی ہیں۔ حضرت مولانا نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی مثال دے کر فرمایا کہ دونوں طرف لڑنے والے کر سچین تھے اور وہ بھی ایک ہی طبقہ (پروٹسٹنٹ) سے تعلق رکھتے تھے، مگر یہ چیز ان کو جنگ سے نہ روک سکی۔ پھر بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں جوش کے ساتھ فرمایا۔

”درحقیقت اختلافات اور دشمنیوں کا تعلق نفسانیت سے، دولت پرستی کے جنون سے ہے، نفس پرستی اور مادیت سے ہے، اس غلط نظام اور نصاب تعلیم سے ہے جس نے اخلاقیات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کا تعلق ہرگز عالمی قانون کے اختلاف سے نہیں ہے۔ یہ میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں اور چیلنج کرتا ہوں کہ عالمی قانون کے ایک ہو جانے سے اخلاقی صورت حال میں قطعاً ایک ذرہ کا فرق نہیں پڑے گا۔ پھر کیوں بار بار اس کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ یونیفارم سول کوڈ ہونا چاہیے تاکہ آپس میں اتحاد و الفت پیدا ہو۔“ (۲)

حضرت مولانا نے اپنے بعد کے خطبات میں بھی اس کی سنگینی کا تذکرہ کیا ہے اور دفعہ ۴۴ کا ذکر کر کے اس کو دستور ہند کے تار و پود میں ایک آتش گیر مادہ قرار دیا ہے۔

حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کو بھی حضرت مولانا نے اس سلسلہ میں توجہ دلائی ہے۔ ۱۹۸۹ء میں وی، پی سنگھ برسر اقتدار آئے، ان کی کابینہ میں بی، جے، پی کے کئی وزراء تھے، پارلیمنٹ میں بھی یہ بات اٹھائی گئی، ایک بے توفیق مسلمان رکن پارلیمنٹ نے یہاں تک کہا کہ فضا ساز گار ہونے پر اس کا نفاذ کیا جائے گا۔ یہ صورتحال تشویش پیدا کرنے والی تھی۔

حضرت مولانا نے وزیراعظم کے نام ایک مکتوب میں ان کو اس سلسلہ میں آگاہ کیا۔ اس کے بعد ہی بورڈ کے وفد نے وزیراعظم سے ملاقات کی، حضرت مولانا ہی اس وفد کی سرپرستی فرما رہے تھے۔ وزیراعظم نے بے تکلف گفتگو کی، مولانا کے خط کا تذکرہ کیا اور بورڈ کے مطالبات منظور کیے اور اخیر میں یہ بات بھی صراحت سے کہی کہ ”یونیفارم سول کوڈ مختلف فرقوں اور اقلیتوں پر تھوپا نہیں جائے گا۔“

۱۰ مئی ۱۹۹۵ء کو سپریم کورٹ نے مرکزی حکومت کو ہدایت کی کہ وہ یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کے لیے اقدامات کرے اور تین ماہ کے اندر اپنی رپورٹ پیش کرے۔ اس فیصلہ سے مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہوئی۔ حضرت مولانا کو اس فیصلہ کی اطلاع رائے بریلی میں ملی۔ مولانا نے فوراً ہی اخبارات کے لیے اس کے خلاف ایک بیان جاری کیا جس میں ملک کے لیے اس کی مضرتوں کو واضح کیا اور صاف کہا کہ ”اس کے نتیجہ میں نئے تنازعے اور احتجاج رونما ہونگے اور صلاحیتیں اور توانائیاں ضائع ہوں گی۔“ بورڈ کے ذمہ داروں نے اس کو خاص طور پر محسوس کیا اور اس کے لیے ۱۸ جون کو دہلی میں مولانا کی صدارت میں ایک مشاورتی جلسہ منعقد کیا گیا، جس میں اس مسئلہ پر غور و خوض ہوا، اور اس فیصلہ کو انتہائی افسوس ناک اور نامناسب قرار دیا گیا اور اعلان کیا گیا کہ اس کو مسلمان کبھی قبول نہیں کر سکتے۔ ساتھ ہی ساتھ حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اس فیصلہ سے پیدا شدہ بے چینی کو دور کرے اور یہ اعلان کرے کہ وہ یکساں سول کوڈ کی تدوین اور اس کے نفاذ کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔

اس مطالبہ کو حکومت نے تسلیم کیا اور یہ اعلان کر دیا کہ حکومت فی الحال اس کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ اس طرح فوری طور پر جو خطرہ سامنے آ گیا تھا وہ دور ہو گیا۔

مولانا کی قیادت میں بورڈ کی عظیم کامیابی

حضرت مولانا کی صدارت کو ابھی ڈیڑھ ہی سال کا عرصہ گزرا تھا کہ سپریم کورٹ نے فقہ مطلقہ کے سلسلہ میں اپنا وہ فیصلہ دیا جس میں دین میں کھلی مداخلت، قرآن مجید کے الفاظ کی من مانی تشریح و تفسیر، شریعت اسلامی کی توہین اور اس پر کھلا حملہ تھا۔

اس مقدمہ میں جو ”محمد احمد خان اپیل کنندہ بنام شاہ بانو بیگم“ کے سلسلہ میں دائر تھا یہ فیصلہ دیا گیا کہ سابق شوہر مطلقہ بیوی کو تاحیات یا تا نکاح ثانی نفقہ دینے کا پابند ہے، اور اس

میں قرآن کی اس آیت ”والمطلقات متاع بالمعروف“ (۱) کا یہی مطلب بیان کیا گیا۔ اس فیصلہ نے مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، مسئلہ صرف ایک فیصلہ کا نہیں تھا بلکہ مسئلہ شریعت کے تحفظ اور اس ملک میں اس پر عمل کی آزادی کا تھا۔ آج سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا تھا، کل وہ اسی طرح کے اور اس سے بڑھ کر ایسے فیصلے دے سکتا تھا جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کا ملی تشخص مشکوک ہو کر رہ جاتا۔ پرسنل لا بورڈ نے حضرت مولانا کی قیادت میں کمان سنبھالی اور پورے ملک میں اس کے خلاف ایسے عظیم الشان احتجاجی جلسے کیے گئے اور لاکھوں لاکھ فرزند ان توحید نے دستخطی مہم چلا کر صدر جمہوریہ اور وزیراعظم و وزیر قانون سے اپنے ایسے احتجاج کا اظہار کیا کہ پورا ملک ہل گیا۔ خود صدر بورڈ کے وطن رائے بریلی میں اس سلسلہ کا عظیم الشان اجلاس منعقد ہوا، اتنا بڑا مجمع شاید اس سے پہلے رائے بریلی کی سرزمین پر نہیں ہوا تھا۔ بورڈ کے ذمہ داروں نے پورے ملک کے دورے کیے اور لوگوں میں ”تحفظ شریعت“ کا ایسا جذبہ پیدا ہو گیا کہ اس سے پہلے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ حضرت مولانا نے لکھا ہے کہ ”سفروں کے دوران اسٹیشنوں پر مسلمانوں کی بھیڑ ہوتی تھی، لوگ آتے اور کہتے کہ شریعت کے لیے جان حاضر ہے، مال حاضر ہے۔“

ان احتجاجی مظاہروں کے علاوہ بورڈ کے ذمہ داروں نے اس وقت کے وزیراعظم مسٹر راجیو گاندھی سے ملاقاتیں بھی کیں، اور ان کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اس فیصلہ پر نظر ثانی کریں۔ وزیراعظم نے ان ملاقاتوں سے مسئلہ کی اہمیت و نزاکت کا اندازہ کر لیا اور یہ بھی محسوس کر لیا کہ اس تحریک کے قائدین مخلص اور بے لوث ہیں۔ صدر بورڈ سے خود موصوف نے خواہش ظاہر کر کے دو ایک مرتبہ تنہائی میں بھی گفتگو کی۔ حضرت مولانا نے اپنے داعیانہ مزاج کے ساتھ حکمت و بصیرت سے بھرپور گفتگو فرمائی، جس سے وزیراعظم پر گہرا اثر پڑا، اور انہوں نے یہ طے کر لیا کہ پارلیمنٹ کے ذریعہ سے اس میں تبدیلی کرنی ہے۔ مسئلہ بڑا نازک بن گیا تھا، پورا پریس اور میڈیا کورٹ کے فیصلہ کو بالکل مٹی برانصاف اور حق بجانب قرار دے رہا تھا، اس کا کہنا تھا کہ ایک چھوٹے سے مسئلہ کے لیے جس میں ایک مظلوم عورت کو نفقہ دلایا جا رہا ہے بورڈ کیوں اس کے پیچھے لگ گیا ہے اور کیوں اس میں تبدیلی چاہ رہا ہے؟ لگتا تھا کہ

پورے ملک میں ایک ہی معرکہ گرم ہے۔ بورڈ کے قائدین اگر اس معاملہ میں حکمت سے کام نہ لیتے تو مسئلہ شاید نہ حل ہو یا تا مگر حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں اور خاص طور پر وزیراعظم کو اعتماد میں لینے کی وجہ سے کتنی سنجیدگی ہوئی نظر آرہی تھی کہ اچانک کسی نے وزیراعظم کو یہ سمجھا دیا کہ اس سلسلہ میں دوسرے مسلمان ملکوں کے قانون کو بھی دیکھ لیا جائے، اگر وہاں اس طرح کی تبدیلیاں شریعت کے خلاف ملتی ہوں تو یہ ایک سیکولر ملک ہے، یہاں اس میں کیا حرج ہے؟ حضرت مولانا کو اس کا علم ہوا تو قبل اس کے کہ وزیراعظم کی طرف سے کوئی بات آتی خود حضرت مولانا نے وزیراعظم سے ملاقات کی اور فرمایا:

”راجیو جی! آپ کے ملک کو اللہ نے خود کفیل بنایا ہے اس کو کسی دوسرے ملک کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، شریعت کے مسئلہ میں بھی یہ ملک خود کفیل ہے، اور یہاں کے علماء کی دنیائے اسلام میں وہ اہمیت ہے کہ ورلڈ مسلم نیشن (رابطہ عالم اسلامی) جو سب سے بڑی اسلامی آرگنائزیشن ہے اس میں متعدد مرتبہ دنیا کے کئی علماء ایک طرف ہوئے اور آپ کے ملک کے عالم نے اس کے خلاف بات کہی تو اس کی بات مانی گئی، (۱) اس مسئلہ میں بھی دوسرے ممالک کی طرف نگاہ کرنا اس ملک کی توہین ہے، اگر میں ایک بار آپ سے یہ بات کہوں تو آپ چار بار کہیں۔“ (۲)

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ اس گفتگو کے بعد پھر کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی اور راجیو جی کا ذہن بالکل صاف ہو گیا۔ اس مسئلہ میں انھوں نے ان حضرات سے بار بار تفصیل سے وضاحت سنی اور خود بھی مطالعہ کیا، یہاں تک کہ خود انھوں نے اپنی کسی تقریر میں یہ بات کہی کہ ”اسلام نے عورتوں کو جو حقوق دیئے ہیں وہ کسی مذہب نے نہیں دیئے“۔ اس طرح وہ خود اس مسئلہ کے ترجمان بن گئے اور انھوں نے طے کر لیا کہ اس فیصلہ کے خلاف پارلیمنٹ

(۱) یہ واقعہ خود حضرت مولانا کے ساتھ دو مرتبہ پیش آیا، ایک مرتبہ چاند کے مسئلہ میں اور دوسرے انتقال مساجد کے سلسلہ میں۔

(۲) راقم سطور نے خود حضرت مولانا سے یہ گفتگو سنی ہے، کوشش کی ہے کہ خود حضرت مولانا کے الفاظ میں ہی اس کو نقل کر دیا جائے۔

میں بل پیش کیا جائے گا۔ اس کے لیے انھوں نے ۵ مئی ۱۹۸۶ء کی تاریخ طے کر دی۔ باہر کی فضا چونکہ ناسازگار ہو رہی تھی۔ خود کانگریس کے متعدد ممبران کے ذہن صاف نہیں تھے اس لیے راجیو جی نے باقاعدہ ”وہپ“ جاری کر دیا کہ تمام ممبران کے لیے حاضر ہونا اور بل کی تائید کرنا لازم ہے ورنہ وہ رکنیت سے نکال دیا جائے گا۔ ۵ مئی ۱۹۸۶ء کو بل پیش ہوا۔ طویل اور گرم بحث کے بعد رات کو دو بجے ووٹنگ ہوئی اور بل پاس ہو گیا اور ”ویسومینڈیفورح المؤمنون“ (اور وہ دن مسلمانوں کی خوشی کا ہوگا) کا اظہار ہوا۔ (۱)

یہ بورڈ کی بہت بڑی کامیابی تھی جس میں حضرت مولانا کی حکمت اور فہم و فراست کو خاص دخل تھا۔ حضرت مولانا نے بل پاس ہونے کے بعد راجیو جی کو شکریہ کا ایک خط بھی لکھا جس میں شکریہ کے ساتھ ساتھ ان کو ملک کے سامنے پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کیا، فرقہ واریت، اونچ نیچ اور دوسرے مسائل کی طرف ان کو متوجہ کیا اور ان کی ذمہ داری ان کو یاد دلائی۔ (۲)

بابری مسجد کا مسئلہ

۸/۷/۱۹۸۴ء کو ویشو ہندو پریشد نے ایک خفیہ اجلاس منعقد کیا تھا جس میں مسلمانوں کی اجتماعی و ملی نسل کشی کی تجاویز پیش کی گئیں تھیں۔ اس اجلاس میں بابری مسجد کے بارہ میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ اس کو منہدم کر کے ”رام جنم بھومی“ میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس اجلاس کے بعد لاوا اندر ہی اندر پکایا جاتا رہا، بالآخر وہ دن بھی آیا جس کو ہندوستان کی پیشانی پر ”کلنک کا ٹیکہ“ قرار دیا جاسکتا ہے جس میں قانون کو پیروں تلے روند اگیا اور سیکولرزم کا برسر عام مذاق اڑایا گیا۔

۱۹۸۶ء کی بات ہے جب کہ بابری مسجد کا مسئلہ سامنے آچکا تھا۔ حضرت مولانا شاہ بانو کیس کے سلسلہ میں بار بار وزیراعظم سے مل کر ان کو مطمئن کر رہے تھے۔ کسی ملاقات میں حضرت مولانا نے بابری مسجد کی طرف وزیراعظم کی توجہ مبذول کرائی، اور اس میں یہ تجویز

(۱) اس باب کو تفصیل سے جاننے کے لیے ”کاروان زندگی“ کی جلد سوم دیکھی جائے (۱۰۱-۱۱۱)۔

(۲) اسی کتاب کے باب پنجم میں خط کے مندرجات نقل کئے جا چکے ہیں۔

رکھی کہ حکومت کی جانب سے یہ اعلان ہونا چاہیے کہ عبادت گاہیں اصل شکل میں رہیں گی، کسی دوسرے فرقہ کو زبردستی ان میں کسی قسم کی تبدیلی لانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس وقت حکومت کی طرف سے یہ اعلان ہو جاتا تو آگے جو حادثات رونما ہوئے وہ شاید نہ ہوتے۔ دومرتبہ حضرت مولانا نے ڈاک سے اس مسئلہ سے متعلق اپنی تجاویز اور حل بھیجا اور گفتگو کے لیے وقت چاہا لیکن حکومت کی طرف سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ اسی سال بابرئ مسجد کا تالا کھلو کر اس میں ہندوؤں کو پوجا پاٹ کی عام اجازت دی گئی۔ اس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے۔ اس موقع پر مولانا نے ایک بیان جاری کیا جو نقل کیا جاتا ہے:

”اجودھیا کی بابرئ مسجد کے سلسلہ میں یک طرفہ فیصلہ سے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو غیر معمولی صدمہ ہوا ہے۔ ایسے حالات میں جب کہ مسلمانوں کے جذبات پر سنل لا کے مسئلہ پر مجروح ہیں، اور ان کی تمام تر جدوجہد اپنے ملی تشخص کو برقرار رکھنے اور دینی شعائر کے زندہ رہنے کے لیے ہو رہی ہے، بابرئ مسجد پر پڑے ہوئے تالے کو کھول کر اسے دوسرے فرقہ کو پوجا اور درشن کی کھلی اجازت دینا، اور اس مسجد پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنے کا حکم دینا کسی طرح دانش مندانہ اقدام سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ اس اقدام سے خطرہ ہے کہ مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہو جائیں، اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں کہ اس ملک پر صرف ایک فرقہ کی حکومت ہے، اور طاقت کے بل بوتے پر یک طرفہ فیصلہ کر کے دوسروں کے حقوق کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔“

بابرئ مسجد کے بارہ میں یہ تاریخی حقیقت ہے کہ وہ مسلمانوں کی ملکیت اور ان کی مسجد ہے، جس میں وہ ساڑھے چار سو سال سے نمازیں ادا کرتے رہے ہیں۔ مسلمانوں میں اس اقدام سے اشتعال کا ہونا فطری بات ہے، اور یہ ان کی دینی غیرت و حمیت کی دلیل ہے۔ البتہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ

فرقہ پرست عناصر کے اشتعال انگیز نعروں سے متاثر نہ ہوں، اس سے حالات مزید بگڑ جائیں گے۔ انھیں چاہیے کہ اپنی صفوں کو متحد رکھیں اور جس طرح انھوں نے ”مسلم پرسنل لا“ کے سلسلہ میں اپنے بے مثال اتحاد کا مظاہرہ کیا ہے اسی طرح انھیں ان جیسے نازک مسائل کے بارے میں اپنے اتحاد کے مظاہرہ کے ساتھ دانش مندانہ اور ٹھوس قدم اٹھانا چاہیے، اور حکومت و انتظامیہ کو وہ باور کرا دیں کہ اقلیتوں پر ظلم و زیادتی اور خاص طور سے ان کی عبادت گاہوں پر قبضہ برداشت نہیں کیا جائے گا۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اگر حکومت نے مسلمانوں کے جذبات کا احترام نہ کیا اور بابرہ مسجد کے سلسلہ میں کیے گئے حالیہ اقدامات واپس نہ لیے تو اس کے نتائج بڑے سنگین اور خطرناک ہو سکتے ہیں۔“ (۱)

۱۹۸۹ء میں ہندو شدت پسند تنظیموں نے ”شیلانیاس“ کے لیے فضا گرم کی، ان کے قائدین نے جگہ جگہ اشتعال انگیز تقریریں کیں، جس کے نتیجے میں جگہ جگہ فسادات ہوئے، جن میں بھاگلپور کا فساد انتہا کو پہنچ گیا۔ مولانا نے ضروری سمجھا کہ فضا کو نارمل کرنے کے لیے ملک کے نامور قائدین، ممتاز دانشوروں، ماہرین قانون کو متوجہ کیا جائے۔ مولانا نے ایک موثر اور مفصل خط تحریر فرمایا جس میں حالات کی اندیشہ ناک بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

”جب کسی دور میں اخلاقی گراؤ کا ایسا دورہ پڑتا ہے تو اس وقت

دو طبقے میدان میں آتے ہیں: ایک مذہبی پیشواؤں اور مذہبی انسانوں کا طبقہ۔ دوسرا دانشوروں کا طبقہ۔ اس وقت ضرورت ہے کہ مذہبی پیشوا اور مذہبی انسان اور دانشور میدان میں آئیں، وہی اس وقت معاشرہ کو بچا سکتے ہیں۔“ (۲)

یہ مکتوب ہر طبقہ کے لوگوں تک پہنچایا گیا۔ لوگوں نے عام طور پر اس فکر کا استقبال کیا۔ پھر مولانا ہی کی صدارت میں ۷ مارچ ۱۹۹۰ء کو دہلی میں دانشوروں کا ایک تاریخ ساز

(۱) کاروان زندگی سوم صفحہ ۱۵۸-۱۵۰

(۲) کاروان زندگی چہارم صفحہ ۱۹۲

کنونشن ہوا جس میں ملک کے چندہ لوگ شریک ہوئے۔ مولانا نے اس میں بڑی موثر اور بے تکلف تقریر کی جس کا حاضرین نے گہرا اثر لیا۔ اجلاس کے اختتام پر مشہور مورخ (سابق گورنر اڑیسہ) وشمبر ناتھ پانڈے کی صدارت میں ایک کمیٹی تشکیل دے دی گئی۔ حالات کو معتدل کرنے کے لیے اس نے اجلاس کے بعد ہی سے اپنا کام شروع کر دیا۔

فسادات کے پیچھے شدت پسند ہندو تنظیمیں کام کر رہی تھیں اور انھوں نے باری مسجد کے مسئلہ کو اس کی بنیاد بنا رکھا تھا۔ اس لیے مولانا کو خاص طور سے یہ فکر تھی کہ مسئلہ کسی طرح حل ہو جائے۔ اسی دوران گورنر بہار جناب یونس سلیم صاحب اور گورنر آندھرا پردیش جناب کرشن کانت جی (۱) ندوہ آکر مولانا سے ملے اور انھوں نے جنوب کے شکر آچاریہ جی سے مولانا کی ملاقات کی ضرورت و اہمیت بیان کی اور کہا کہ یہ مسئلہ اس طرح حل ہو سکتا ہے، خود شکر آچاریہ جی آپ سے اس مسئلہ میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت مولانا نے مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر ملاقات منظور کر لی۔ ۱۸ مارچ ۱۹۹۱ء کو حضرت مولانا اپنے رفقاء کے ساتھ مدراس تشریف لے گئے۔ دونوں گورنر صاحبان بھی وہیں پہنچ گئے۔ اگلے دن ۱۹ مارچ کو یہ سب حضرات ”کانچی پورم“ تشریف لے گئے۔ شکر آچاریہ سے اچھی فضا میں گفتگو ہوئی۔ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ کچھ دور مندر تعمیر کر لیا جائے اور مسجد سے مورتیاں ہٹالی جائیں۔ لیکن افسوس کہ بعض رکاوٹوں کی وجہ سے اس پر عمل نہیں ہو سکا۔

اس کے بعد بھی بعض مصالحتی فارمولوں کی کوششیں ہوتی رہیں۔ دوسری طرف ہندو شدت پسند تنظیمیں فضا کو گرم کرتی رہیں، جگہ جگہ فسادات کرائے جاتے رہے، اقلیت کو نشانہ بنایا جاتا رہا۔ حضرت مولانا نے نرمہاراؤ، وی۔ پی۔ سنگھ اور چندر شیکھر تینوں کو خطوط لکھے، ملاقاتیں کیں، پیام انسانیت کے جلسے بھی کیے گئے لیکن فضا اتنی گرم کی جا چکی تھی، اور مسئلہ کو اس طرح سڑکوں پر لے آیا گیا تھا کہ اس کو تھا منا مشکل تر ہو گیا۔ نتیجہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو کارسیو کوں کے ہاتھوں مسجد مسمار کر دی گئی اور حکومتیں خاموش تماشائی بنی رہیں۔ مرکزی حکومت نے اپنے سیکولر ازم کے اظہار کے لیے ایک ذیلی اقدام یہ کیا کہ مختلف ریاستوں کی پی۔ جے۔ پی حکومتیں درخواست کر دیں۔

حضرت مولانا نے اس موقع پر مفصل بیان جاری کیا، اس کا ایک انقباس یہاں نقل کیا جاتا ہے :

”۶ دسمبر کو اجودھیا میں قدیم تاریخی بابری مسجد کو انہدام اور باوجود اس کی حفاظت کے وعدوں کے اس کو صاف کر دینے کا جو واقعہ پیش آیا اس نے پورے ہندوستان کو ایک کلنک کا ٹیکا لگا دیا اور اس کی سیکڑوں برس کی رواداری، مذہبی آزادی اور صلح پسندی کی روایت کو خاک میں ملا دیا۔ ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والوں اور قربانی دینے والوں کی محنتوں پر پانی پھیر دیا اور عالمی اور بین الاقوامی سطح پر ہندوستان کو ذلیل کیا۔

اس کی ذمہ داری سب سے پہلے ان فرقہ پرست جماعتوں پر ہے جنہوں نے پورے ملک میں ”کارسیوا“ کے نام پر ایک اندھا دھند مذہبی جوش پیدا کر دیا، پھر اتر پردیش کی اس حکومت پر ہے جو اسی وعدہ اور بنیاد پر قائم ہوئی تھی اور جس نے باوجود مسجد کی حفاظت کے بار بار کے وعدوں اور عدالت کے فیصلہ کے احترام کے اپنا فرض پورا نہیں کیا اور اس پورے ڈرامے میں وہ تماشائی بنی کھڑی رہی بلکہ ایک طرح سے اس نے اس کا رروائی کی حوصلہ افزائی کی، ورنہ چند گھنٹوں میں اس سہولت اور آزادی کے ساتھ یہ کام نہیں ہو سکتا تھا۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مرکزی حکومت پر بھی اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور حقیقت پسند اور واقف کار حلقوں کو اس سے بھی شکایت کرنے کا حق ہے کہ اس نے مرکزی فورس اور پولیس کی موجودگی میں (جو دور سے تماشائی بنی کھڑی تھی) کوئی مداخلت نہیں کی اور اپنے بار بار اعلانات کے باوجود اس نے مسجد بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

اب کلنک کے اس ٹیکہ اور ہندوستان کے چہرہ کو جو داغ لگا ہے، اس کو مٹانے اور دھونے کے لیے بہت کچھ کرنا ہوگا، اور یہ ملک سے وفاداری، حب الوطنی

اور حقیقت پسندی کا تقاضا ہے، مسجد کی از سر نو تعمیر کے علاوہ جس کا مرکزی حکومت نے وعدہ کیا ہے، فرقہ پرست اور ملک دشمن جماعتوں پر پابندی لگانے اور ان کا احتساب کرنے اور ان کی سرگرمیوں کو مفلوج کرنے کے علاوہ ملک میں اتحاد، باہمی اعتماد، مذہبی فرائض و رسوم اور عبادت گاہوں، علمی مرکروں کی حفاظت اور احترام، انسانیت اور حب الوطنی کی ایک جرأت مندانہ، حقیقت پسندانہ لیکن ہمہ گیر اور طوفانی تحریک چلانے کی ضرورت ہوگی، عوامی اور حلقے وار جلسے کرنے ہوں گے، اور شائع ہونے والے لٹریچر اور پریس پر بھی نگاہ رکھنی ہوگی اور اس کو بھی اس مقصد کے لیے آگے، کار اور ترجمان بنانا ہوگا۔ ملک کو اس واقعہ سے اندرونی اور بیرونی طور سے جو نقصان پہنچ گیا ہے اس کو دور کرنے کے لیے سخت جدوجہد کرنا ہوگی، اور اس سلسلہ میں ہر طرح کے سیاسی مفادات، جماعتی تقاضوں اور طاقت اور اقتدار میں آنے اور عوام کے استحصال کی سطح سے بلند ہو کر پورے خلوص، سچی حب الوطنی اور انسان دوستی سے کام لینا ہوگا، ورنہ یہ ملک سخت خطرہ میں ہے اور اس کو اس خطرہ سے نکالنے اور بچانے کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہیں۔“ (۱)

خلافت اسلامیہ کا سقوط

اسلام کی تاریخ میں وہ دن بڑا نامبارک تھا جس دن ”خلافت اسلامیہ“ کی قباچاک کی گئی۔ تیرہ سال میں مسلمان عروج کی بلندیوں تک بھی پہنچے اور عکبت وادبار سے بھی ان کو دوچار ہونا پڑا، لیکن کبھی بھی مسلمان اس طرح تیرہ و تار نہیں ہوئے تھے جس طرح سقوط خلافت سے ہوئے، ان کی مرکزی طاقت بکھر کر رہ گئی، اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود مسلمانوں کا جو ایک رعب دشمنوں کے دماغوں میں بیٹھا ہوا تھا وہ نکل گیا۔ علامہ شبلی نے صحیح کہا تھا :

ع زوال دولت عثمان زوال ملک و ملت ہے

حضرت مولانا نے اس کی بہترین مثال دی ہے کہ بوئے ہوئے کھیت میں سوکھی لکڑی

کو لباس پہنا دیا جاتا ہے تو جانور ادھر نہیں پھٹکتے، اس کا بھی ایک خوف ہوتا ہے، کوئی چالاک کو اس پر ٹوٹ مار کر دیکھ لیتا ہے تو بھرم جاتا رہتا ہے لیکن پھر بھی جب تک وہ لباس پہنے ہوئے لکڑی کھڑی ہے عام طور پر جانور اس سے بھاگتے ہیں۔ خلافت کا ایک بھرم تھا جو اس کے سقوط سے جاتا رہا، اور دوسری قوموں نے مسلمانوں کو قلمہ تر سمجھ لیا۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ شام کے چار ٹکڑے کر دیئے گئے۔ بیت المقدس مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ایک وہ دن تھا کہ جب خلافت کی شان و شوکت تھی، یہودیوں کا ایک وفد سلطان عبدالحمید کے پاس فلسطین میں یہودیوں کی جزوی آباد کاری کی اجازت لینے آیا اور انھوں نے وہاں کچھ زمین بسائی چاہی تو سلطان نے بڑے جوش کے ساتھ ایک چنگلی مٹی لے کر کہا کہ ”میں تو اس سرزمین کے اتنے حصہ سے بھی دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔“ پھر کہا کہ ”ان کتوں کو یہاں آنے کی اجازت کس نے دی؟“ پھر وہ وقت آیا کہ خلافت کا سقوط ہوا اور یہودیوں نے بڑی دسیسہ کاریوں سے بیت المقدس کو مسلمانوں کی تولیت سے چھین لیا۔ مغربی طاقتوں بالخصوص برطانیہ کے اشاروں پر یہ سب کچھ ہوا اور اپنوں کے ہاتھوں سے ہوا۔

ع سادگی اپنی بھی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ
خلافت کے سقوط کے بعد جب ترکی کو ایک آزاد سلطنت کے طور پر تسلیم کیا گیا تو برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر کو اس پر اعتراض ہوا، اس کا جواب کرزی نے ان الفاظ میں دیا :
”مسئلہ یہ ہے کہ ترکی کا ایسا عمل زوال میں آ گیا ہے کہ اس کے بعد پھر اس کا عروج نہ ہوگا، اس لیے کہ ہم نے اس کی روحانی و معنوی طاقت (خلافت اسلامی) کو ختم کر دیا ہے۔“ (۱)

کمال اتاترک اور حضرت مولانا کی حقیقت رسی

کمال اتاترک ۱۹۰۵ء میں ایک فوجی قائد کی حیثیت سے سامنے آئے۔ ۱۹۱۴ء میں ”گیلی پولی“ کے معرکہ میں ان کو فتح ہوئی، اس کے علاوہ بھی متعدد معرکوں میں انھوں نے فتح حاصل کی۔ جب یونانی فوجیں ترکی میں گھستی چلی آرہی تھیں انھوں نے ان کو شکست دی اور

ترکی سے نکالا۔ یہ ”معرکہ سقاریہ“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد سے عالم اسلام میں ان کو ”غازی“ کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ انھوں نے تخت سلطنت حاصل کیا۔ اس کے بعد کی ان کی اسلام دشمن کارروائیوں سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ وہ مغربی طاقتوں کے آگے کار تھے۔ ان کو سقوط ”خلافت اسلامیہ“ کے لیے کھڑا کیا گیا تھا اور اس مشن میں انھوں نے کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت سے اذانوں پر پابندی لگائی، دینی خانقاہیں اور مدارس بند کیے، رسم الخط بدلا، اسلامی شعائر کو مٹانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یہ سب کچھ ہوا، لیکن ہندوستان کے دینی حلقوں میں ان کو ”غازی کمال“ ہی کہا جاتا رہا اور قائد کی حیثیت سے ان کو جانا جاتا رہا۔ حضرت مولانا ۱۹۵۶ء میں ترکی تشریف لے گئے۔ سفر سے واپسی پر مولانا نے برملا اس بات کا اعلان کیا کہ ترکی میں اسلام پسند، اتاترک کو کس قدر ناپسند کرتے ہیں؟! اس کی ”اصلاحات“ سے ترکی میں اسلام کو جو نقصان پہونچا اور جو معنوی، روحانی اور علمی نسل کشی عمل میں آئی اس کو مولانا نے صاف صاف بیان فرمایا، خاص کر رسم الخط بدل جانے سے جو انقلاب برپا ہو گیا تھا اس کا تذکرہ کیا۔ لوگوں میں عام طور پر جو غلط فہمی پھیلی ہوئی تھی اس کو دور کرنے کی کوشش کی۔ انصاف پسند حلقوں نے اس کو قبول کیا اور ہندوستان میں پہلی مرتبہ یہ حقائق لوگوں کے سامنے آئے۔

اپنے بعض مضامین اور تقریروں کے علاوہ مولانا نے اپنی مشہور تصنیف ”مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش“ میں کمال اتاترک کے سلسلہ میں تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے، اور مستند تاریخی حوالوں سے اس کے بارہ میں حقائق واضح کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اتاترک کے ہمدرد و معتمد ترک سوانح نگار عرفان اورگا کی کتاب ”اتاترک“ کے حوالے حضرت مولانا نے پیش کیے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کس درجہ دین ییز اور ملحدانہ ذہن رکھنے والا شخص تھا۔ عرفان اورگا کی کتاب کے دو اقتباس یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

ایک جگہ وہ لکھتا ہے :

”وہ شراب نوشی سے تسکین حاصل کرتا تھا اس لیے کہ روحانی تسکین کے لیے اس کے اندر نہ خدا کا اعتقاد تھا نہ زندگی بعد موت کا یقین۔ دوسروں پر ظلم کر کے خوشی حاصل کرنے کی جو فطری خصوصیت اس کے اندر تھی اس کا اظہار ہوا، وہ دوسروں کے جذبات کو کبھی تسلیم نہیں کرتا تھا، اس لیے وہ کسی کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتا تھا، اس کے اندر دوسروں کو مفتوح و مغلوب بنانے اور ان کو اپنی مرضی کے سامنے سرنگوں کرنے کی فطری خواہش پائی جاتی تھی، وہ ہمیشہ چوٹی پر رہنا پسند کرتا تھا۔“ (۱)

دوسری جگہ اس کی مذہب بیزاری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :

”اس نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اس کی اصل جنگ مذہب کے خلاف ہے، بچپن سے اس کے نزدیک خدا کی کوئی ضرورت نہیں تھی، وہ محض ایک پراسرار اور مغالطہ آمیز مجرک نام تھا، وہ صرف اس چیز پر یقین رکھتا تھا جو دیکھنے میں آ سکتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ زمانہ ماضی میں اسلام محض ایک تخریبی طاقت رہا ہے اور اس نے ترکوں کو بہت نقصان پہنچایا۔“ (۲)

برسر اقتدار ہونے کے بعد اس نے ترکی کا رخ پلٹ دیا، نظام خلافت کو ختم کر دیا گیا اور دین کو طاق پر رکھ دیا گیا۔ حضرت مولانا اس کی تفصیل کو اختصار کے ساتھ بیان فرماتے ہیں :

”کمال اتاترک نے واقعتاً قوم پر فتح پائی، ملک کو سیکولر (نامذہبی) اسٹیٹ میں تبدیل کر دیا، جس میں اسلام کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل نہیں رہی، دین و سیاست میں تفریق ہو گئی، اور یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے، ہر شخص اپنے لیے کسی مذہب کا انتخاب کر سکتا ہے، بغیر اس کے کہ سیاست میں بھی اس کو دخل ہو۔ خلافت کے ادارہ کو ختم کر دیا گیا۔ شرعی اداروں اور محکموں اور اسلامی قانون شریعت کو ملک سے بے دخل

کر کے سوئزر لینڈ کا قانون دیوانی، اٹلی کا قانون فوجداری اور جرمنی کا قانون بین الاقوامی تجارت نافذ کیا گیا اور پرسنل لا کو یورپ کے قانون دیوانی کے مطابق و ماتحت کر دیا گیا، دینی تعلیم ممنوع قرار پائی، پردہ کو خلاف قانون قرار دیا گیا، مخلوط تعلیم کا نفاذ کیا گیا، عربی حروف کی جگہ لاطینی حروف جاری ہوئے۔ عربی میں اذان ممنوع قرار پائی، قوم کا لباس تبدیل ہو گیا، ہیٹ کا استعمال لازمی قرار پایا۔ غرض کہ کمال اتاترک نے سابق انگریز مورخ کے الفاظ میں ”ترکی قوم اور حکومت کی دینی اساس کو توڑ پھوڑ کے ختم کر دیا اور قوم کا نقطہ نظر ہی بدل دیا۔“ (۱)

مسئلہ فلسطین

ارض فلسطین کا تقدس تسلیم شدہ ہے، مسجد اقصیٰ اس کی گود میں ہے، جس کے بارہ میں قرآن پاک میں بار کتنا حوالہ (ہم نے اس کے ارد گرد برکت بخشی ہے) کی گواہی موجود ہے۔ وہی مسلمانوں کا پہلا قبلہ تھا۔

۶۳۶ء میں حضرت عمر فاروقؓ کی فوجوں نے اس کو فتح کیا۔ اس کے بعد صرف نوے سال مستثنیٰ کر دیے جائیں تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ مسلسل مسلمانوں ہی کی تولیت میں رہا۔ درمیان میں جب اس کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھینا گیا تو مسلمان تڑپ اٹھے، اور اس وقت تک ان کو چین نہیں آیا جب تک کہ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے دوبارہ اس کو فتح نہ کر لیا۔

خلافت عثمانیہ کے دور میں خلفاء ہی کے ہاتھ میں اس کی تولیت رہی، جب خلافت پر زوال آیا تو دشمنوں نے بال و پر نکالنے شروع کیے۔ ۱۹۱۷ء میں یہودیوں نے بہت ہی خفیہ طور پر وہاں قدم جمائے شروع کیے۔ ۱۹۲۰ء میں باقاعدہ انگریز ہائی کمشنر کے ذریعہ ملکی حکومت کا اعلان ہوا، اس کے بعد سے انگریزوں کی سرپرستی میں یہودیوں نے مضبوطی حاصل کرنی شروع کی اور دنیا کے مختلف ملکوں سے وہاں آکر آباد ہونے شروع ہوئے۔ ۱۹۳۹ء تک ان کی

تعداد چھ لاکھ کے قریب پہنچ گئی۔ نتیجہ ظاہر تھا، ان کی عربوں سے کشمکش شروع ہوئی۔ ۱۹۲۸ء میں خوں ریز فسادات کا سلسلہ شروع ہوا۔

۱۹۴۸ء میں باقاعدہ ”حکومت اسرائیل“ کے قیام کا اعلان کر دیا گیا اور یہودیوں نے کئی عرب ریاستوں پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس طرح فلسطین کی سرزمین پر ایک ایسا ناسور وجود میں آ گیا جس نے عرب مسلمانوں کو کمزور کرنے کی ہر ممکن تدابیر اختیار کیں، اور ایک ماسٹر پلان تیار کیا جس میں ”مملکت اسرائیل“ کے حدود اتنی وسعت کے ساتھ متعین کیے گئے جس میں متعدد عرب ملک شامل تھے۔ اس وقت مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کے لیے بڑا خطرہ پیدا ہو گیا، پوری دنیا کے مسلمانوں نے اس کو محسوس کیا۔

حضرت مولانا کی فکر و سعی

ملی مسائل سے مولانا کی دلچسپی اور فکر و سعی کا آغاز ہی مسئلہ فلسطین سے ہوتا ہے۔ ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۹ء کے درمیان کا قصہ ہے، عربوں کی یہودیوں سے سخت مزاحمت چل رہی تھی، پورا فلسطین فسادات کی لپیٹ میں تھا، حالات بگڑ رہے تھے، ہندوستان میں اہل علم و اہل دل اس کے لیے مضطرب تھے۔ اس وقت حضرت مولانا نے شیخ محمد العربی کے ساتھ بعض علاقوں کے دورے فرمائے، اور اس مسئلہ کی اہمیت تمام لوگوں کے سامنے بیان فرمائی۔ یہ مولانا کی تحریکات سے وابستگی اور ملی کوششوں کے باقاعدہ آغاز سے پہلے کا واقعہ ہے۔

۱۹۵۱ء میں حضرت مولانا نے فلسطین کا پہلا سفر کیا، مسجد اقصیٰ میں نمازیں پڑھیں، وہاں کے اہم علماء اور قائدین سے ملاقاتیں کیں اور حالات کا مطالعہ فرمایا اس وقت کے تاثرات قلم بند کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

”عمان و بیت المقدس کے سفر میں فلسطین کے بارہ میں معتبر و ذمہ دار اشخاص کے ذریعہ وہ افسوسناک حقائق معلوم ہوئے جن کا علم کسی کتاب کے مطالعہ سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ مسئلہ فلسطین ایک ڈرامہ تھا جس کو انگریزوں اور ان کے پٹھوں نے پہلے سے تیار کر رکھا تھا، اس کے کردار عرب، عرب بادشاہ اور حکومتیں تھیں۔ یہ ڈرامہ فلسطین کے اسٹیج

پر کھیلا گیا اور عالم عربی اور عالم اسلام کی آنکھوں میں دھول ڈال کر برطانیہ اور صیہونی یہودیوں کے منصوبے کو پورا کیا گیا۔ یہ ایک سوچی سمجھی شاطرانہ اسکیم تھی۔ مسلمانوں کی اس ذلت و رسوائی کے معاملے میں آزاد فلسطینی قوم سب سے زیادہ بے قصور ہے، اصلاً فلسطین کا خون عرب حکومتوں اور ان کے قائدین اور عرب لیگ کی گردن پر ہے۔“ (۱)

فلسطین کے سفر سے واپسی پر حضرت مولانا کی ملاقات شرق اردن کے حکمران شاہ عبداللہ سے ہوئی۔ حضرت مولانا نے ان سے دعوتی انداز میں بے تکلف گفتگو کی اور ان کو مسجد اقصیٰ اور فلسطین کی ذمہ داریوں کی نزاکت و اہمیت سے آگاہ کیا۔ شرق اردن کے قیام میں دو تین دن کے فصل سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو مولانا نے ان کو فلسطین جانے اور فلسطینی پناہ گزینوں کی طرف توجہ کرنے کا مشورہ دیا۔ تقدیری بات وہ اگلے جمعہ کو مسجد اقصیٰ نماز پڑھنے گئے اور وہیں شہید کر دیے گئے۔

اس سفر میں ۲۳ جولائی ۱۹۵۱ء کو دمشق یونیورسٹی کے ہال میں اہم ترین افراد کی موجودگی میں حضرت مولانا نے اس موضوع پر پُر مغز مقالہ پیش کیا جس میں مسئلہ کا پورا تجزیہ بھی فرمایا اور پہلی مرتبہ بہت سے وہ حقائق بیان فرمائے جن کی طرف عام طور پر تجزیہ نگاروں کی نگاہ نہیں پہنچتی۔ مولانا نے فرمایا:

”عام طور پر جو اسباب بیان کیے جاتے ہیں وہ اصل اور بنیادی نہیں ہیں۔ ہماری ذلت و رسوائی کے حقیقی اسباب کچھ اور ہی ہیں جن کی جڑیں گہری ہیں۔ مسئلہ فلسطین سے پہلے وہ اسباب وجود میں آنا شروع ہو گئے تھے، اور انھوں نے اپنا کام شروع کر دیا تھا، فلسطین کا مسئلہ اس کا ایک نتیجہ ہے۔ جس کی بھی نگاہ ان اسباب پر ہے اس کے لیے یہ نتائج کچھ تعجب خیز نہیں بلکہ اندیشہ کے عین مطابق ہیں۔“ (۲)

پھر حضرت مولانا نے فرمایا:

(۱) کاروان زندگی اول صفحہ ۳۸۷

(۲) المسلمون وقضية فلسطين صفحہ ۲۶

”ان میں پہلا سبب اپنے اصول و عقیدہ پر مر مٹنے اور جان کی بازی لگا دینے والے جذبے کا فقدان تھا۔ دوسرے اس ذہنی و نفسیاتی کیفیت کا فقدان جس کو اقبال نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے

بے خطر کو دہڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشا ئے لب بام ابھی

تیسرا سبب یہ ہے کہ عرب حکومتوں اور لوگوں میں کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا جس کے دل و دماغ پر فلسطین کا مسئلہ چھا جائے، اور اس کی صلاح الدین ایوبی کی طرح وہ کیفیت ہو جائے جس کو ان کے سرکیری ابن شداد نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ”معلوم ہوتا تھا کہ ماں کی گود میں اس کے اکلوتے بچہ کو حلال کر کے کسی نے ڈال دیا ہو“۔ فلسطین کا مسئلہ جب کبھی حل ہوگا اس طرح حل ہوگا۔ کانفرنسوں، ریزولیشنوں اور خوشامدوں سے حل نہیں ہوگا۔“ (۱)

بنیادی طور پر تینوں اسباب کا ذکر کرنے کے بعد مولانا نے حقائق و واقعات کی روشنی میں اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اخیر میں مولانا نے ایمان کی چنگاری کو فروزاں کرنے اور اس کو شعلہ جوالہ میں تبدیل کرنے پر زور دیا ہے اور اقبال کے ان اشعار پر اپنا خطبہ ختم فرمایا ہے:

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابلی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دور گراں خوابلی
عروق مردہ مشرق میں خون زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلمانوں کو مسلمان کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریایی سے ہے گوہر کی سیرابی

اس سفر کے علاوہ بھی مولانا نے کئی مواقع پر عربوں کو توجہ دلائی اور کئی مرتبہ اشارہ بھی دیا کہ اگر حالات نہ بدلے گئے تو خطرات کو نالنا آسان نہیں ہے۔ اور وہی ہوا جس کا اندیشہ مولانا ظاہر کر رہے تھے۔

مسلمانوں کی تاریخ کا ایک سیاہ دن

۹ جون ۱۹۶۷ء (۲۹ صفر ۱۳۸۷ھ) کا دن مسلمانوں کے لیے ایک روز بد بن کر آیا، اس دن تمام مسلمانوں کو رسوائی سے دوچار ہونا پڑا اور ان کا سر شرم اور احساس ذلت کے بار سے جھک گیا۔ یہودی فوجیں عالم عربی کے انتہائی اہم مقامات پر قابض ہو گئیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ آٹھ سو سال بعد یہ پہلا نامبارک دن تھا جس میں مسلمان بیت المقدس میں جمعہ کی نماز نہ پڑھ سکے۔

حضرت مولانا پر جو گزری اس کا اندازہ آسان نہیں۔ واقعہ کے بعد ہی حضرت مولانا نے زخمی دل اور اشک بار آنکھوں کے ساتھ جو مضمون قلم بند کیا اس میں پیمانہ چھلک چھلک گیا ہے۔ مضمون کے شروع ہی میں یہ الفاظ ان کے قلم سے نکل گئے ہیں:

”جمعہ اسلامی تقویم میں بہت مبارک دن ہے۔ لیکن یہ جمعہ (۲۹ صفر ۱۳۸۷ھ) ان کے لیے بد قسمتی کا پیغام لے کر آیا، ایسی بد قسمتی جس سے واسطہ مسلمانوں کو صدیوں سے نہیں پڑا تھا، آج ہر آنکھ اشکبار، اور ہر دل بے چین و بے قرار ہے، ہر مسلمان کے گھر میں صف ماتم بچھ گئی ہے، اور ہر شخص اپنے کو تعزیت کا مستحق سمجھ رہا ہے۔“ (۱)

مولانا کی نظر میں شکست کے اسباب

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے برابر صدا لگاتے رہے، خبردار کرتے رہے، اپنی دسیوں تقریروں میں انہوں نے یہ بات فرمائی کہ ”حالات موافق نہیں ہیں، حالات کو بدلنے کی ضرورت ہے، جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کے بنائے ہوئے نظام کے ماتحت ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی مدد و صفات پر آتی ہے، صرف بلند بانگ دعوؤں سے کچھ نہیں ہوتا، اس کے لیے حقیقی تیاری کی

ضرورت ہے۔“ مثالیں دے کر مولانا نے ایک جگہ یہ بات لکھی ہے کہ:

”پانچویں صدی ہجری میں بیت المقدس پر صلیبیوں کا تسلط اور اس کے بعد ساتویں صدی ہجری میں اسلام پر تاناریوں کی یورش اور بغداد کی پامالی محض بے سرپیر کے واقعات نہیں تھے، جن کو صرف تقدیر کی گردش اور قسمت کی خرابی اور اتفاق زمانہ کہہ کر اپنا پیچھا چھڑا لیا جائے، یہ دونوں واقعات دراصل اس طویل سلسلہ اسباب کا نتیجہ تھے جس میں اخلاقی امراض، حد سے بڑھی ہوئی بے اعتدالی اور کج روی، مجرمانہ افعال و حرکات، مسلسل مغالطے اور خود فریبیاں اور ایسے حالات کی موجودگی شامل ہے جس میں کسی زمانہ اور کسی جگہ بھی باقی رہنے کی صلاحیت نہیں اور سب سے بڑھ کر زندگی کا وہ طرز جو خدا اور رسول کو ناپسند ہے اور جو دین صحیح اور عقل سلیم کسی اعتبار سے بھی جائز نہیں۔“ (۱)

مولانا شروع سے اس کی طرف عربوں کو توجہ دلاتے رہے، اس خلا کو پر کرنے کی دعوت دیتے رہے، لیکن لذت پرستی اور عیش پسندی اور اس کے نتیجہ میں انتشار و تفرقہ کا جو گھن ان کو لگ چکا تھا اس نے ان کے درختِ اقبال کو چاٹ ڈالا اور آخرش وہی نتیجہ سامنے آیا جس کا اندیشہ تھا۔ اس واقعہ کے بعد مولانا نے قلم برداشتہ پہلا جو مضمون لکھا اس میں صدمہ دل کے اظہار کے بعد مولانا نے حادثہ کا پورا تجزیہ فرمایا ہے اور اس کے اسباب بیان کیے ہیں۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:

”شکست کا پہلا سبب مغربی تہذیب اور دولت و ثروت کا وہ سیلاب ہے جو ان ملکوں پر ایک طوفان کی طرح امنڈ آیا ہے، اس تہذیب اور اس دولت نے اس سپاہیانہ اور مجاہدانہ مزاج رکھنے والی امت پر جو اپنی فطرت اور اپنی تاریخ کے لحاظ سے جنگ آزما اور خطر پسند اور اپنے دعوت و پیغام کے لحاظ سے جفاکش اور سادگی پسند تھی، بہت گہرا اثر ڈالا، بلکہ اس کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی۔ اس میں عیش پسندی، آرام طلبی اور تن آسانی پیدا ہو گئی،

جاں بازی اور مہم جوئی، خطر پسندی اور حوصلہ مندی، خود اعتمادی و خود شناسی، مصائب و مشکلات پر صبر اور زندگی کے معرکے میں ثابت قدمی کے اوصاف داستان پارینہ بن گئے، اللہ کے احکام و فرائض کی قیمت لوگوں کی نگاہوں میں کم ہو گئی، منکرات و معاصی اور احکام خداوندی کی برسر عام نافرمانی اور سرتابی کی عادت پڑ گئی، علماء نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ترک کر دیا اور احتساب کا کام چھوڑ دیا، اور ظالم و جابر حکمرانوں اور مطلق العنان فرماں رواؤں کے سامنے حق بات کہنے کا رواج جاتا رہا، بے حیائی، فسق و فجور اور الحاد و زندقہ پھیلانے والے رسالے اور اخبارات گھر گھر پھیل گئے اور بے حیائی کی اشاعت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔

لذت پرستی، عیش پسندی، زندگی سے لطف اندوزی، نگاہ کی تفریح اور دل کی معصیت کی ایک طوفانی موج اٹھی اور اخلاق، ضمیر، اصول و تعلیمات اور حرام حلال کے امتیاز کی ساری متاع اپنے ساتھ بہا کر لے گئی۔“

”دوسرا سبب“ قومیت عربیہ“ کا ظہور اور عروج ہے، جس نے پہلی جنگ عظیم کے بعد عربوں کی زندگی اور ان کے جذبات و احساسات پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے، یہ عصبيت، اسلامی عصبيت کے نقصان کے ساتھ پروان چڑھتی رہی، یہاں تک کہ اس نے عقیدہ اور مذہب کی شکل اختیار کر لی، اور قوم پرست اس کی تعریف میں اس طرح رطب اللسان رہنے لگے اور اس کی اشاعت اور ترقی میں اتنی گرم جوشی اور ولولہ کے ساتھ حصہ لینے لگے جس طرح مختلف مذاہب کے ماننے والے اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت میں حصہ لیتے ہیں، اور اس کے لیے کھل کر تعصب برتتے ہیں، شعر و ادب، آرائش و تزئین کے لیے وقف ہو گئے اور اس کے نتیجے میں نعمت اسلام کی ناقدری اور نبوت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حق تلفی و ناشکری اور احسان

ناشای کارحان پیدا ہو گیا، جس کے دم سے اور جس کے طفیل میں یہ عالم عربی وجود میں آیا، اور بہت سے تعلیم یافتہ نوجوانوں، اہل فکر و نظر اور عربوں کے متعدد اہم رہنماؤں اور لیڈروں کے منہ سے ایسے الفاظ اور ان کے قلم سے ایسی تحریریں نکلیں جس کے بعد مرتد ہو جانے میں کوئی کمی باقی نہیں رہتی اور وہ شرعاً اس کا مستحق نہیں رہتا کہ اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں جگہ دی جائے۔“

”تیسرا سبب تقریباً ہر عرب ملک میں فوجی حکومت کا قیام، انقلابات اور بغاوتوں اور سازشوں کا وہ سلسلہ ہے جو ختم ہونے کو نہیں آتا، ان منہوس، مسلسل اور پے بہ پے انقلابات نے ان ملکوں کو اپنے بہترین فوجی قائد اور سیاسی لیڈروں سے (جو اپنی تجربہ کاری میں فائق اور سیاست و جنگ دونوں کے سرد گرم جھیلے ہوئے اور دونوں کے نشیب و فراز سے اچھی طرح آشنا تھے) محروم کر دیا، اور ان جنگ آزمودہ اور تجربہ کار فوجی و سیاسی شخصیتوں کی ایک بہت بڑی تعداد ان انقلابات اور سازشوں اور مطلق العنان و جاہرانہ حکومتوں کی نذر ہو گئی، ان میں بہت سے موت کے گھاٹ اتار دیے گئے، جو باقی بچے وہ جلا وطن کیے گئے، یا اپنی جان، ایمان اور عزت و آبرو لے کر خود اس ملک سے نکل گئے، اور اس کو ہمیشہ کے لیے خیر آباد کہہ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج یہ ممالک سخت قسم کے قحط الرجال کا شکار ہیں، اور ان کے یہاں ممتاز و فائق قائدین کا ایک مستقل مسئلہ پیدا ہو گیا ہے، اب وہاں صرف ایک سرکاری پارٹی اور ایک ٹولی کی حکومت ہے، اور صرف ایک نقطہ نظر کو پھلنے پھولنے کی اجازت ہے۔ ان مطلق العنان اور آمرانہ حکومتوں نے (جو انتہا پسندانہ اشتراکی حکومتوں کی شاگرد اور مقلد ہیں) سب سے بڑا کام اپنے پیش نظر یہ رکھا کہ ملک میں ہر اٹھتی ہوئی آواز، ہر دھڑکتے ہوئے دل اور ہر چلتی ہوئی نبض کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا جائے، اور وہ کاٹنا ہی

نکال دیا جائے جو پہلو میں چھسکتا ہو۔“ (۱)

آگے حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ ”یہ حکومتیں صرف بلند بانگ دعوں میں لگی رہیں، اور یہ نعرہ لگایا جاتا رہا کہ ہم اسرائیل کو، استعمار کو اور رجحیت پسندوں کو نیست و نابود کر کے دم لیں گے، لیکن جب عمل کا وقت آیا تو تین دن یہ ثابت قدم نہ رہ سکے۔“ مولانا نے اس کے تین بنیادی اسباب بیان فرمائیے ہیں، جن کا ذکر اوپر ہو چکا۔ اس کو اور واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ اسرائیل اپنی قوم، اپنی ریاست اور اپنی جدوجہد کو انبیاء کرام کی طرف منسوب کر رہے تھے۔ اس کے بالمقابل مصر کے بہت سے لوگ اپنے کو فرعون کی طرف منسوب کر رہے تھے۔ اسرائیلی اپنی اس لڑائی کو ”جہاد مقدس“ اور خالص دینی جنگ کہتے اور سمجھتے تھے، لیکن عرب اس وقت بھی عبادت و دعا اور انابت و توجہ الی اللہ سے غافل اور قومی غرور و تکبر میں گرفتار تھے، اور بس قومی نعرے لگا رہے تھے۔ لوگوں نے ٹیلی ویژن پر یہ دونوں تصویریں اور دونوں مناظر دیکھے۔ ۳۱ جون سنچر کے دن (جو مسلمانوں کے جمعہ کی طرح ان کا مذہبی مقدس دن ہے) سب اسرائیلیوں نے اس مقصد کی خاطر روزہ رکھا اور ”توریت“ اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر اپنی فتح و نصرت اور کامیابی کی دعائیں کیں۔

پھر اس کے بعد بالآخر وہ المیہ پیش آگیا جو مسلمانوں کی کمر توڑ دینے کے لیے کافی تھا۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ باہر کے مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں پر اس حادثہ سے کیسی بجلی گری! ان میں بہت سے لوگ بھی جو ایمان و عقیدہ کے ساتھ عربوں سے نسلی تعلق بھی رکھتے تھے، اور یہ سمجھتے تھے کہ عربوں کی ذلت مسلمانوں کی ذلت اور عربوں کی عزت مسلمانوں کی عزت ہے۔ ان میں بہت سے سمجھنے سے قاصر تھے کہ آخر یہ سب کیسے ہو گیا؟“ (۲)

(۱) عالم عربی کا المیہ صفحہ ۳۲-۳۹۔ باختصار

(۲) عالم عربی کا المیہ صفحہ ۴۳-۴۴

اس کے بعد حضرت مولانا بڑے خوبصورت انداز میں گریز فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

”قرآن مجید کا صاف اعلان ہے کہ جزا و سزا کا قانون عام بلا کسی تخصیص کے سب پر نافذ ہے، اس میں کسی کی بے جا رعایت یا جانب داری کا کوئی سوال نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی ایسی چیز نہیں جس کو آج کل حکومتوں اور اداروں میں خویش نوازی اور اقرباء پروری کہا جاتا ہے۔ اس نے بہت سختی کے ساتھ یہ وعید سنائی ہے:

لَيْسَ بِأَمَانِيكُمْ وَلَا أَمَانِي أَهْلَ الْكِتَابِ، وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا (نساء - ۱۲۳)

نہ تمہاری تمناؤں پر فیصلہ ہوگا اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر (اللہ کا قانون یہ ہے کہ) جو برائی کرے گا وہ اس کا بدلہ پائے گا اور اللہ کے آگے کوئی اس کا حمایتی اور مددگار نہ ہوگا۔“ (۱)

روشنی کی نئی کرن

مایوسی کی اندھیروں میں مولانا نے امید کے چراغ روشن کیے ہیں، اور شکست خوردہ اعصاب کے لیے ایمانی طاقت کا سامان فرمایا ہے، اسی مضمون میں آگے فرماتے ہیں:

”یہ حقیقت ہے کہ یہ حادثہ انتہائی جاں گداز اور روح فرسا ہے، اور اس نے عالم اسلام کے دل و دماغ کو بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے، لیکن اس سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ یہ امت ہمیشہ ان مصائب اور حوادث سے دوچار ہوئی ہے، وہ حادثات ایسے تھے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی قوم ان کی تاب نہ لا کر فنا ہو سکتی تھی لیکن امت اسلامیہ تباہی کے اس ملبہ اور گرد و غبار کے اس طوفان سے دوبارہ تازہ دم ہو کر نکل آئی، اور جس غبار اور مٹی کو دشمنان اسلام نے اس کا دفن سمجھ لیا تھا اس مٹی سے ایک ایسی نئی اور طاقتور قوم اٹھ کر دنیا کے سامنے آئی جس کی رگ رگ میں بجلیاں کوند رہی تھیں،

اس نے نئے ایمان و یقین، نئے اعتماد، نئے خون اور نئے جذبے اور قوت

عمل کے ساتھ روئے زمین پر اپنا سفر پھر شروع کیا۔“ (۱)

یہ حادثہ ایسا سخت تھا کہ عام مایوسی کی فضا پیدا ہونے لگی تھی، اور مسلمان اپنی صلاحیت سے مایوس ہونے لگے تھے۔ حضرت مولانا نے ایسے حالات میں امید کی شمع روشن کی اور اعتماد و یقین کی جوت جگائی، اور تاریخ کے حوالوں سے ثابت کیا کہ مسلمانوں کی کشتی بار بار گرداب میں پھنسی اور دشمنوں کو یقین ہونے لگا تھا کہ کشتی اب ڈوبی تب ڈوبی لیکن جب ایمان کی طاقت پیدا ہوئی تو سخت سے سخت حالات میں کشتی پار لگ گئی۔

مولانا فرماتے ہیں:

”تاریخ آج بھی اس واقعہ کو دوہرانے کے لیے تیار ہے بشرط یہ کہ

اس کی سچی طلب موجود ہو، اور مسلمان ”صراط مستقیم“ سے منحرف ہو کر کسی

غلط راستہ پر نہ پڑ گئے ہوں۔“ (۲)

مولانا نے دکھایا ہے کہ اب تک ہم نے جو راستہ اختیار کیا اس سے سوائے ذلت و

رسوائی کے اور کچھ نہیں مل سکتا۔ پھر مولانا نے از سر نو سفر شروع کرنے کی دعوت دی ہے، اور صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔

مولانا فرماتے ہیں:

”ہم کو بہادری کے ساتھ یہ بات قبول کر لینی چاہیے کہ ”عربی

قومیت“ کی دعوت و تحریک کھلے طور پر ناکام اور سرعام رسوا ہو چکی۔“ (۳)

”ہمیں جرات کے ساتھ اعتراف کرنا ہوگا کہ عربوں کو اپنے قدیم

وابدی دین (اسلام) پر نئے سرے سے ایمان لانے کی ضرورت ہے، ان کو

اپنے نشاط و زندگی کے سرچشمہ عزت و سر بلندی کے راز اور اپنی فتح

و ظفر مندی کی کلید یعنی محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب الہاشمی القرشی (صلی اللہ

علیہ وسلم) کی ذات گرامی سے اس عشق و شفیقتی کی ضرورت ہے جو ان کے

(۱) عالم عربی کا المیہ صفحہ ۴۸-۵۰ تک تلیخیص کے ساتھ

(۳) عالم عربی کا المیہ صفحہ ۵۳

(۲) عالم عربی کا المیہ صفحہ ۵۰

قلب و جگر میں اتر جائے اور ریشہ ریشہ میں سما جائے، اس لیے کہ عربوں، ترکوں اور ساری دنیا کے مسلمانوں کی حیات اور عزت و آبرو آپ ﷺ کی ابدی دعوت، لازوال امامت و قیادت اور آپ ﷺ کے طریق سنت کے ساتھ مربوط و وابستہ ہے۔

ہمیں اس حقیقت کو بھی مان لینا چاہیے کہ مسلمانوں اور عربوں کو وہ غیر ملکی طاقتیں اور سیاسی مصلحتیں جو ہوا کے ساتھ چلتی ہیں، اور اپنی اغراض و فوائد کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں ہرگز کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔ اس لیے ان کو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا چاہیے اور مانگنے کی طاقت کے بجائے اپنے ایمان و یقین، اپنے اخلاق و کردار، اپنی خصوصیات و صفات اور قوت و زور بازو سے کام لینا چاہیے۔

ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم سب شخصی اور جماعتی طور پر پوری خود شکنی اور انابت کے ساتھ گر گڑا تے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور اجتماعی طور پر اس کے سامنے سچی توبہ کریں اور ہر خارجی قوت اور بیرونی مدد اور ظاہری سیاروں سے اپنی برأت کا اظہار کریں اور اس پر پورا ایمان لائیں کہ اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں۔ (لا ملجأ من اللہ الا الیہ) (۱)

”ہم کو اب اللہ کے ساتھ اور اس کے بندوں کے ساتھ اپنا معاملہ درست کرنا چاہیے اور جو قوتیں اور وسائل اللہ نے ہم کو دیئے ہیں اس کا صحیح اور جائز استعمال کرنا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ اللہ سے جنگ اور اس کے رسول کے ساتھ دشمنی سے باز آجائیں اور اس کی شریعت و قانون کی مخالفت ترک کر دیں، اور اسلام میں اپنے پورے وجود اور پوری شخصیت کے ساتھ داخل ہوں۔“ (۲)

اخیر میں عزم و حوصلہ کے ساتھ سفر شروع کرنے کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

”اس گرد و غبار کو چھوڑ کر نئے سرے سے اپنے سفر کا آغاز کرنا چاہیے

اور اپنے اصل مقام اور ان صفات و خصوصیات کی طرف پھر واپس لوٹنا چاہیے جس پر ہماری آئندہ کامیابی کا مدار اور نصرت الہی کا مدار ہے:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَغْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ
إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِثْلُهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ
نُذِرُ لَهَا بَيْنَ النَّاسِ. (آل عمران ۱۳۹-۱۴۰)

(اور ہمت نہ ہارو اور رنج نہ کرو، انجام کار تم ہی سر بلند ہو گے اگر سچے مومن ہو۔ اگر اس جنگ میں تم پر چوٹ پڑی ہے تو دشمن قوم پر بھی ایسی چوٹ پڑ چکی ہے، اور ہم زمانہ کی تاریخ کو اسی طرح ادا لیتے بدلتے رہتے ہیں یعنی کبھی کسی کو فتح کبھی کسی کو شکست (اور اس میں بہت سی حکمتیں ہیں)۔“ (۲)

عربوں کا بے باکانہ احتساب

عرب حضرت مولانا کی امیدوں کا مرکز رہے ہیں۔ حضور اقدس ﷺ کی بعثت کے لیے عرب کی سرزمین منتخب کی گئی۔ آپ ﷺ کی اولین رفاقت کا شرف بھی عربوں کو حاصل ہوا۔ ان سے محبت ایمان کا تقاضہ ہے۔ حضرت مولانا کو ہمیشہ ان سے محبت رہی، اور وہ ان کو اسلام کے صحیح ترجمان اور دعوت اسلامی کے حامل کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے تھے۔ حضرت مولانا نے ہمیشہ عربوں کو توجہ دلائی اور ان میں ایمانی حمیت پوری قوت کے ساتھ پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن ۹ جون کے حادثہ کے بعد حضرت مولانا نے ان کا بے باکانہ احتساب کیا، ان کی خودی کو لاکارا اور بعض بہت اہم موقعوں پر سخت تنقید کی اور ان کی کمزوری کی نشاندہی فرمائی۔ عربوں کو بھی حضرت مولانا کے تعلق و اخلاص کا پورا احساس تھا۔ انھوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ شیخ جو کچھ فرماتے ہیں اس میں عربوں کی صلاح و فلاح ہی مقصود ہے۔ ۹ جون کے حادثہ کے صرف چند ہی ماہ بعد مکہ مکرمہ میں ایک اہم مجمع کو خطاب کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

”ہماری بد نصیبی ہے کہ جو لوگ اس شکست کے ذمہ دار ہیں وہ آج

بھی ہماری عقلوں پر چھائے ہوئے ہیں، اور ہمارے دل میں اب بھی ان کی پہلی سی عزت قائم ہے۔ اگر ہم میں ذرا بھی غیرت، حیا اور انسانیت ہوتی تو ہم ان سے مجرموں کا سا معاملہ کرتے جو قوموں کے قاتل ہوتے ہیں اور ملکوں سے بے وفائی کرتے ہیں۔ ان حالیہ مجرموں نے ہماری شخصیت، ہمارے شرف، ہماری تاریخ پر پانی پھیرا ہے۔“ (۱)

۱۹۶۸ء میں حضرت مولانا نے مدینہ منورہ میں ”نظامان الہیان“ کے عنوان سے بڑی موثر تقریر فرمائی جس میں مولانا نے فتح و غلبہ کے لیے دو نظام بیان کیے ہیں: ایک طبعی نظام جس میں طاقت کمزوری پر، اور اکثریت اقلیت پر غالب آتی ہے۔ اور دوسرا وہ اخلاقی و دینی نظام ہے جو اپنے حاملین کو فتح دلاتا ہے۔ جب کبھی اس کا طبعی نظام سے تصادم ہوتا ہے تو وہی غالب آتا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس کی وجہ سے ”اصحاب بدر“ کو فتح ہوئی، اسی نظام کی وجہ سے حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کی فوج نے دریائے دجلہ میں فوج ڈال دی، اور پوری فوج اس طرح پار ہو گئی جیسے وہ خشکی پر چل رہی ہو۔ اس کے بعد حضرت مولانا فرماتے ہیں:

”یہ دو خدائی نظام ہیں۔ لیکن جب کوئی فرد یا جماعت ان دونوں نظاموں کو چھوڑ دیتی ہے، اور ان دونوں سے بغاوت کرتی ہے یعنی نہ نظام طبعی کے تقاضے پورا کرتی ہے اور نہ دین و اخلاق ہی کے نظام کو اپناتی ہے تو اس کا کیا انجام ہو سکتا ہے؟!

آج کے عربوں میں خواہشات کی پیروی، باہمی رزم آزمائی، اپنی قومیت پر فخر اور صرف کھوکھلے دعوے اور بلند بانگ نعرے ہیں، بے معنی شور و غوغا ہے، بدظنی و بے تدبیری ہے۔ کیا ایسا ملک اور ایسی فوج فتح کی مستحق ہو سکتی ہے؟“ (۲)

آگے فرماتے ہیں:

”جب ہم (۵۰ جون کی) اس جنگ میں کودے تو گویا ہم تہی دامن تھے، نہ ہمارے پاس طبعی نظام تھا جو ہم میں بیداری، احتیاط، اتحاد باہمی، محبت، ایثار، قربانی، سرفروشی اور شجاعت پیدا کرتا، ہمیں محنت و مشقت کا

عادی بناتا اور دنیاوی چمک دمک کی حقارت ہمارے دلوں میں پیدا کرتا۔ ہم اس طبعی قانون کے بھی پوری طرح پابند نہیں تھے، نہ ہمارے پاس وہ مقدس نظام ہی تھا جس کی کامیابی کی ضمانت اللہ تعالیٰ نے لی ہے اور فرمایا ہے: وَإِنَّ جُنَدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ (الصّٰفّٰت ۱۷۳) اور بے شک ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ فرماتا کہ ”إِنَّ جُنَدَنَا غَالِبُونَ“ تو کافی تھا، یہ فرماتا کہ ”وَإِنَّ جُنَدَنَا لَغَالِبُونَ“ تب بھی کافی تھا، لیکن بات میں زور، یقین اور وزن پیدا کرنے کے لیے فرمایا گیا: إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ. وَإِنَّ جُنَدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ (الصّٰفّٰت ۱۷۲، ۱۷۳) (یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور بے شک ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا۔) إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهُادُ (المؤمن - ۵۱) (یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں، اور اس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے۔) (۱) مزید فرماتے ہیں:

”صرف زمانہ جنگ اور اس سے چند دن قبل کے اخبارات و رسائل پڑھیے۔ کیا یہ اخلاق اور یہ طریقہ زندگی اللہ اور اس کے رسول کی رضا کا موجب ہو سکتا ہے؟ کیا ام کلثوم (۲) کے گیت اللہ تعالیٰ اور رسول کی رضا اور فتح و کامرانی کے نزول کا ذریعہ بن سکتے ہیں؟ کیا یہ نائٹ کلب، عریانی و بے حیائی کے اڈے، جسے ہمارے بھائیوں نے اس ملک میں نئی زندگی بخشی، جس پر مقدس اسلامی مقامات کے دفاع کی سب سے بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے ہمیں رسوائی و ہزیمت سے بچا سکتے ہیں؟“ (۳)

عربوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مولانا خود ان کے شریک حال ہیں، اور یہ لقمہ باہر سے

(۲) مصر کی مشہور مغنیہ

(۱) عالم عربی کا المیہ صفحہ ۷۷

(۳) عالم عربی کا المیہ صفحہ ۷۸، ۷۹

نہیں دیا جا رہا ہے، یہ کہنے والے کا صرف قائل نہیں ہے بلکہ حال دل ہے، خون جگر ہے جو اس نے صفحات پر بکھیرا ہے، زبان اسی کی ترجمانی کر رہی ہے۔ خود مولانا نے ایک موقع پر فرمایا:

”میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اپنے عرب بھائیوں پر بہت تنقید کی ہے، جن سے مجھے محبت و عقیدت ہے، اور جن کی میں عزت کرتا ہوں، اور اللہ نے جن کے مستقبل سے میرا مستقبل اور جن کی عزت و ذلت سے میری عزت و ذلت وابستہ کر رکھی ہے۔ میں نے یہ بات ہندوستان میں بار بار کہی ہے کہ عالم اسلام کا مستقبل عربوں کے مستقبل سے وابستہ ہے، عربوں کی ذلت و عزت اسلام کی ذلت و عزت ہے۔ یہ وہ قوم ہے جسے چھوڑ کر میں کسی قوم کو اپنا نہیں سکتا، اور جس کی کتاب، جس کی زبان، جس کی تہذیب سے میں کسی قیمت پر دست بردار نہیں ہو سکتا، اسی پر میں جیتا رہا ہوں اور اسی پر مرنا چاہتا ہوں۔ یہ صراحت و تکی میں نے اس لیے اختیار کی ہے کہ میں بھی آپ کے انجام میں شریک ہوں اور جن حالات کے آپ شکار ہیں میں بھی انہیں میں اپنے کو مبتلا پاتا ہوں۔ لہذا پھر کہتا ہوں کہ محمدی جہنہ تلے جمع ہو جائیے، قومی، وطنی یا اور کسی جہنہ کے نیچے نہیں۔“ (۱)

قومیت و وطنیت کا فتنہ اور مولانا کی فکر و بصیرت

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے، کسی قوم یا نسل، یا زمان و مکان کے دائرہ میں وہ محدود نہیں۔ اس نے قومیت و وطنیت کے بتوں کو پاش پاش کیا ہے، اور پوری انسانیت کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ اسلام کا پیغام کسی نسل یا جگہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ پورے عالم انسانیت کے لیے ہے۔

یورپ کی ایک بڑی سازش یہ رہی ہے کہ وہ اسلامی ملکوں میں قومیت و وطنیت کے جذبہ کو فروغ دینے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا رہا ہے، اور جاذب نظر عنوانات سے یہ روگ مسلمان ملکوں کو لگا تا رہا ہے، تاکہ مسلمانوں کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے اور بحیثیت قوم مسلم کے

وہ دنیا کے اسٹیج پر کوئی بنیادی کردار ادا کرنے سے قاصر رہیں۔

حضرت مولانا نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں جا بجا قومیت و وطنیت کے بتوں پر کاری ضرب لگائی ہے، یہاں پر آکر مولانا کے قلم میں آبشار کا شور اور طوفان کا زور نظر آتا ہے۔ اور کئی جگہ مولانا کے زبان و قلم سے ایسے سخت الفاظ نکل گئے جو کم کسی جگہ نکلے ہوں گے۔ اور کیوں نہ ہو؟ جب حضور اقدس ﷺ کی زبان مبارک سے نسلی عصیت کے بارہ میں منقول ہے کہ ”ایسی عصیت کرنے والے کو کھل کر گالی دو، اور اشارے و کنایے سے کام نہ لو“۔ حضرت مولانا نے ہر طرح کی نسلی اور علاقائی گروہ بندی اور عصیت کو دعوت اسلامی کے لیے ”زہر قاتل“ قرار دیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ”اسلام کے آفاقی مزاج سے اس کا کوئی جوڑ نہیں“۔

”قومیت عربیہ“ پر سخت تنقید

حجاز مقدس سارے عالم اسلام کا قبلہ ہے، وہیں سے دنیا کو اسلام کی روشنی ملی، دین حق کی نعمت ملی، حق کا نظام وہیں سے جاری ہوا، وہیں کے چشمہ حیواں سے انسانیت کی کھیتی شاداب ہوئی۔ عالم عربی کو یہ شرف حاصل ہے کہ حجاز مقدس اس کی گود میں ہے، ایمان کی اولین کرنیں عالم عربی پر ہی پڑی پھر وہاں سے یہ روشنی ساری دنیا میں تقسیم ہوئی۔ اس مبارک سرزمین پر کسی ایسے فتنہ کا وجود جو اسلامی مزاج و منہاج سے میل نہ کھاتا ہو بلکہ اس کی جڑوں کو کھوکھلا کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہو پورے عالم اسلامی کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ تھا، جس کو اصحاب بصیرت نے محسوس کیا، جن میں سرفہرست حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی ہے۔

جب عالم عربی میں قومیت نے سر اٹھایا تو بہت سے دشمنان اسلام کو عربوں کا ہیرو قرار دیا جانے لگا، صرف اس لیے کہ وہ عربوں کے قدیم لیڈر تھے، خواہ وہ زمانہ جاہلیت سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں، ”بسم اللہ“ کی جگہ ”بسم الکرامۃ العربیہ“ لکھا جانے لگا، ناصر کو ”نبی القومیۃ العربیہ“ کے لقب سے یاد کیا جانے لگا تو حضرت مولانا نے اس کے خلاف ایک طرح کا جہاد چھیڑ دیا، مدلل مضامین اور پرجوش اور موثر تقریروں سے اس کے

نقصانات واضح کیے اور ثابت کیا کہ عربوں کی عزت اسلام ہی سے وابستہ ہے۔
 ۹ رجون کی پسائی کے اسباب میں حضرت مولانا نے قومیت کو بھی شمار فرمایا ہے اور
 اپنی متعدد تقریروں میں صاف صاف اس پر تنقید کی ہے۔ اپنی ایک تقریر میں دو ٹوک انداز
 میں فرماتے ہیں:

”مجھے بتلائیے کہ عالم انسانیت کے لیے ”قومیت عربیہ“ کے پاس کیا پیام
 اور کون سا فلاجی پروگرام ہے؟ تمام بنی نوع انسان کی کون سی بہتری کسی بھی
 قومیت کی دعوت میں ہے؟ قوم، جنس، رنگ و نسل کے حریف تو ہر جگہ ہیں۔
 اگر تمہیں اپنی عرب قومیت پر فخر ہے تو دنیا میں سیکڑوں قومیں ہیں جنہیں اپنی
 اپنی قومیت پر فخر ہے۔ کسی قومیت کو دوسری قومیت یا کسی قدیم تہذیب و کلچر
 پر دوسری قدیم تہذیب کو کوئی افضلیت نہیں، افضلیت تو اس پیام کے لیے
 ہے جسے حضرت محمد ﷺ پیش فرما گئے۔“ (۱)

قومیت عربیہ کے قائدین پر نقد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”ہمیں ان عرب قومیت کے زعماء اور انتہا پسند ملحد لیڈروں نے کیا
 دیا؟ کس برے انجام کے رخ کو انھوں نے موڑا؟ کون سی آفت ٹالنے میں
 یہ کامیاب رہے؟ کون سا کھویا ہوا اعتماد انھوں نے دوبارہ حاصل کیا؟
 اقتصادی اور معاشی خوش حالی لانے میں یہ کب کامیاب رہے؟ صنعت
 و حرفت، ایجاد و اختراع میں عرب ممالک کی پس ماندگی اور محتاجی کہاں ختم
 ہوئی؟ انھوں نے تو ہماری تابناک تاریخ پر سیاہی پھیر دی، ہمارے رعب
 و اثر کا بڑا حصہ لوگوں کے دلوں سے زائل کر دیا۔ ہم ہمیشہ اپنی اسلامی عربی
 تاریخ پر فخر کیا کرتے تھے۔ مگر آج.....! عام مجلسوں میں اس کا حوالہ دینا
 دشوار ہو گیا ہے۔ جو عظمت رفتہ ہمیں ہمیشہ حال و مستقبل میں حوصلہ دیتی رہی
 وہ ان لیڈروں کے بے دانشی کی نذر ہو گئی۔“ (۲)

۹ رجون کے حادثہ کے صرف پانچ ماہ بعد کی گئی ایک تقریر میں عربوں کو خطاب کرتے

ہوئے بڑے جوش کے ساتھ فرماتے ہیں:

”اے اہل عرب! اے اہل مکہ! اور اے خادمانِ حرم! آپ نے اپنے مقدس ہاتھوں سے اس گھر کو بنایا تھا کہ ہر گھر سے اونچا ہو جائے، اور ہر صنم و ہیکل سے بلند دکھائی دے۔ آپ کے لیے کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ پھر ان ناقابلِ ذکر بتوں کا سہارا لیں۔ یہیں سے عالمی انسانیت کی آواز اٹھی جس نے امتیازات کے بتوں کو توڑ کر اور نسلی، وطنی، غلامی کے طوق و سلاسل کو کاٹ کر رکھ دیا، جس نے تاریخ کا رخ پھیر دیا، جس نے حوادث کا منہ موڑ دیا۔ یہیں سے وہ روشنی کی کرن پھوٹی جو دنیا میں پھیل گئی اور جس نے انسانیت کے تنِ مردہ میں روحِ زندگی دوڑا دی۔

ہمیں حیرت ہے کہ آپ کیسے اس جاہلیت کی طرف جارہے ہیں جسے ہر ہوشیار قوم نے چھوڑ دیا ہے۔ آج یورپ بھی قومیت کی تباہ کاریوں کے بعد اس سے تائب ہو گیا ہے۔ یورپ کا اُگلا ہوا لقمہ اٹھاتے ہوئے میں آپ کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ آپ وہی قوم ہیں جس نے دنیا کو اپنے خوانِ کرم پر صلائے عام دیا تھا، اور تو میں آپ کے دستِ خوان پر مہمان ہوتی تھیں، جس کے لیے کہا گیا ہے کہ

۔ ادیم زمیں سفرۂ عام اوست

بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست

آپ کے لیے کیسے زیب ہو سکتا ہے کہ آپ خود ہی دوسروں کے ہاں طفیلی بن کر جائیں اور ان کے پس خوردہ پر قناعت کر لیں۔

اس ملک کے علاوہ ہمارے دوسرے عرب بھائیوں کے غلط موقف سے ہم عجیب کشمکش میں ہیں، خصوصاً ہندوپاک تو عجیب گھٹن میں ہیں۔ ان لوگوں کو جو قرآن کے سوا کوئی کتاب، شریعت کے علاوہ کوئی نظام اور محمد رسول اللہ ﷺ کے ماسوا کوئی امام و قائد نہیں جانتے تھے، انہیں یہ موقف بہت گھل رہا ہے۔ میں آپ سے رحم کی اپیل کرتا ہوں کہ ہمیں اپنے ملکوں میں رسوائی

کریں۔ آپ ہماری مدد نہیں کر سکتے، تو ہمیں کمزور بھی مت بنائیے۔
 ہمارے اسلام پر اعتماد، اپنی سلامیت پر اطمینان، اور تاریخ اسلام پر فخر کے
 مواقع سے مت روکیے۔ ہمارے اس پرانے یقین کو دھچکانہ لگائیے کہ آپ
 نے قوموں کو جہالت کی بو جھل زنجیروں سے چھڑایا تھا۔“ (۱)

صرف اسلامی وحدت کی دعوت

حضرت مولانا صرف قومیت عربیہ ہی کو اپنا موضوع نہیں بنایا بلکہ جہاں جہاں قومیت
 نے سر اٹھایا انہوں نے اس کے نقصانات کھول کھول کر بیان کئے اور اس کے علاوہ دوسری
 وحدتوں پر بھی سخت تنقید کی خواہ وہ لسانی وحدت ہو یا مذہبی و ثقافتی وحدت ہو۔

حضرت مولانا فرماتے ہیں ”اسلام نے ان مصنوعی وحدتوں کے معاملے میں دو حقیقی
 وحدتوں کو تسلیم کیا ہے اور ان کی وحدت دی ہے یہ دنیا کی معصوم ترین نمبر مضرت ترین مشیت اور
 تعمیری وحدتیں ہیں۔ ایک وحدت انسانی اور ایک وحدت ایمانی“ (۲) وحدت اسلامی کی
 ضرورت اور دوسری وحدتوں کے نقصانات کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”صرف وحدت ایمانی اور وحدت اسلامی ہی میں ہمارے لئے پناہ
 ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی ”وحدت“ پیدا ہوئی تو اس ملت اور ملک کا
 شیرازہ منتشر کر دے گی، طاقتیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں گی، اور جاہلی
 عصیتیں دوبارہ زندہ ہو جائیں گی، جس کو اسلام نے ختم کیا تھا۔ اذ جعل
 الذین کفروا فی قلوبہم الحمیۃ حمیۃ الجاہلیۃ (جب اہل کفر
 نے اپنے دلوں میں حمیت، حمیت جاہلیہ کو جاگیز کر لیا۔) آنحضرت ﷺ
 نے شاید کسی مسئلہ اور کسی موقع پر اتنی سخت زبان استعمال نہیں کی۔ مجھے آپ
 یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ زبان نبوت سے شاید پہلی مرتبہ ایسے سخت لفظ
 نکلے جو اس جاہلی عصیت کے بارہ میں آپ کی بان سے نکلے تھے۔ اس لیے
 کہ آپ ﷺ کو اللہ نے جو بصیرت عطا فرمائی تھی اور وحی الہی کے علاوہ جو اللہ

تعالیٰ نے آپ کا شرح صدر فرمایا تھا، اور آپ پر حقائق منکشف کر دیے تھے۔ اب قوموں اور ملتوں کی تاریخ جو آپ کے سامنے تھی، اس کی بنا پر سب سے بڑا فتنہ آپ اس کو سمجھتے تھے۔ اس عصیت جاہلیہ کے احیاء کو آپ نے فرمایا: ”من تغری علیکم بغراء الجاهلیة فاعضوه بهن ابيه ولا تکنوا“ اگر تمہارے سامنے کوئی جاہلی عصیت کا نام لے یا کہے کہ فلاں قبیلہ، فلاں قوم کی دہائی ہے، فلاں کی زبان کی دہائی ہے یا کسی قوم کی توہین کرے محض نسلی بنیاد پر، یا قبائلی بنیاد پر یا ایسے کسی عصیت پر تو آپ نے فرمایا کہ سخت سے سخت لفظ اس کے لئے بولو اور اشارے و کفائے سے بھی کام مت لو، یعنی جو سخت سے سخت لفظ تمہاری زبان میں ہے وہ لفظ تم اس کے لئے استعمال کرو۔ اس لیے کہ آپ نے دیکھا ہے کہ یہ وہ عصیت ہے جو دم کے دم میں ہزاروں برس کے علمی وادبی اور تہذیبی ذخیرے پر اور خدا کے مخلص اور بے لوث بندوں کی کوششوں پر اور ان کا خون پسینہ ایک کر دینے پر پانی پھیر کر رکھ دیتی ہے۔ یہ عصیت ایسی اندھی ہے جس سے بڑھ کر کوئی اندھا وجود دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ یہ کسی کی رعایت کرنے کے لئے تیار نہیں۔

میں آپ کو آگاہی دیتا ہوں اور اپنی بات پہونچانا چاہتا ہوں کہ اس ملک کے لیے سب سے زیادہ خطرناک چیز یہ لسانی یا تہذیبی عصیت یا قدیم تہذیب کے احیاء کی دعوت ہے۔ میں تنہا پاکستان کی بات نہیں کرتا، اور بھی دوسرے ممالک ہیں، مثلاً مصر میں جذبہ پیدا ہو جائے کہ فرعون تہذیب کو زندہ کیا جائے، جیسا کہ چند سال پہلے یہ فتنہ کھڑا ہوا تھا، یا ایران میں سائرس کی عظمت اور اس کو ہیر و بنانے کا فتنہ پیدا ہو جائے تو وہاں اسلام کی چولیس اہل جائیں گی۔ اس لیے اس وحدت اسلامی کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی وحدت اسلامی ہے جو امن پسند ہے، اور تعمیری صلاحیت رکھنے والی ہے، وہ انسانوں کو جوڑتی ہے توڑتی نہیں، اور انسانوں کے لئے تعمیر کا باعث ہے تخریب کا باعث نہیں، اللہ نے ہم کو، آپ کو بہت پہلے یہ نعمت عطا کی تھی :

وَادْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ
فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا. (۱) (خدا کے اس احسان کو یاد کرو جب تم
ایک دوسرے کے دشمن تھے، اللہ نے تمہارے دل ملا دیئے، تم اس کے فضل
سے بھائی بھائی ہو گئے) (۲)

مشرقی پاکستان میں لسانی و تہذیبی جاہلیت کا فتنہ

مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) اور مغربی پاکستان کے مابین کشمکش شروع سے رہی،
بالآخر زبان کے مسئلہ نے اتنا زور پکڑا کہ دونوں دھڑے علاحدہ ہو گئے، مسلمانوں نے
مسلمانوں کا گلا کاٹا، اور بعض اچھے خاصے دین داروں نے انتہائی بے شعوری کا ثبوت دیا، یہ
المیہ مسلمانوں کو ہلا دینے والا تھا، خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے سر شرم سے جھک گئے۔
حضرت مولانا پر اس حادثہ کا کتنا اثر پڑا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ مولانا
خود فرماتے تھے کہ ”ہم نہیں کہہ سکتے کہ والدہ صاحبہ کی وفات کا مجھ کو زیادہ صدمہ ہوا یا سقوط
ڈھا کہ کا“ حضرت مولانا نے اس کے بعد متعدد تقریروں میں لسانی تہذیبی جاہلیت کے لئے
اب المیہ کا درد انگیز تذکرہ فرمایا۔ اس کے نقصانات بتائے اور اس کے اسباب بیان فرمائے،
ان میں سب سے معرکہ آرا، تقریر کلکتہ کی ہے جو اس حادثہ کے کچھ ہی عرصہ کے بعد کی گئی اس
تقریر میں بڑے درد و فکر کے ساتھ مولانا اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”ابھی چند روز کا واقعہ ہے کہ ایک قدیم اسلامی ملک اور مسلمانوں
کے خاص اکثریت والے علاقہ میں جو علماء اور مشائخ اور مدارس و خانقاہوں
کی سر زمین تھی جس کے چپہ چپہ پر مسجدیں اور خانہ خدا تھے، جس کے لیے
صدیوں اولیائے کرام نے آب دیدہ اور خون جگر بہایا اور جس کی زمین ان
کے آنسوؤں سے نرم اور جس کی فضا ان کے نالہ ہائے نیم شبی سے گرم تھی،
زبان و تہذیب کے جنوں کی ایک تیز و تند لہر اٹھی اور دیکھتے دیکھتے صدیوں کی
محتنوں پر پانی پھر گیا، مسلمان نے بے تکلف مسلمان کا گلا کاٹا، بے گناہ

انسان اس طرح مارے گئے جیسے سانپ اور بچھو مارے جاتے ہیں اور ان پر کوئی رحم نہیں کھایا جاتا۔

جن لوگوں نے اس ملک میں پناہ لی تھی ان کے لئے اب اس ملک میں کہیں پناہ نہ تھی، نہ کسی دل میں ان کے لیے رحم کا جذبہ تھا، نہ کسی آنکھ میں ان کے لیے کوئی آنسو، انسانوں کا شکار اس طرح کھیلا جا رہا تھا جیسے کسی جنگل میں درندوں، پرندوں کا اور کسی تالاب و دریا میں مچھلیوں کا کھیلا جاتا ہے۔ نہ شریف عورتوں کی عصمت محفوظ رہی، نہ بوڑھوں کے بڑھاپے پر ترس کھایا گیا، نہ معصوم بچوں کی چیخ و پکار پر کان دھرے گئے، بھوک پیاس کا عذاب، سنگ دلی اور شقاوت کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو اپنے بھائیوں کے لیے روا نہ رکھی گئی ہو۔“ (۱)

اس کے اسباب کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”زبان کی“ و ”ثبیت“ (بت پرستی) عقیدہ توحید پر، قوم پرستی اور نسل پرستی پر اسلامی وحدت پر، اور حمیت جاہلیت اور عصبیت اخوت اسلامی پر اس طرح غالب آ کر رہی کہ ابتدائے اسلام سے آج تک کسی خطرہ زمین پر ابھی تک اس طرح غالب نہیں آئی تھی، اور اسلام اور مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھوں کبھی اس طرح ذلیل نہیں ہوئے تھے جس طرح اس زمانہ میں۔“ (۲)

حضرت مولانا آگے فرماتے ہیں کہ ”اس واقعہ سے اسلام کی ساکھ کو نقصان پہونچا، جس کی اصل بنیادی وجہ صحیح دینی شعور کی کمی ہے۔ قلب کے ساتھ دماغ کا مومن ہونا بھی ضروری ہے، تنہا اسلام کی محبت کافی نہیں، اس کے ساتھ خلاف اسلام فلسفوں اور دعوؤں کی نفرت بھی لازمی ہے، جاہلیت سے پوری واقفیت بھی ضروری ہے، جاہلیت خوردہ کیسا ہی لبادہ اوڑھ کر آئے، خلاف کعبہ پہن کر آئے یا قرآن مجید کو ہاتھ میں لے کر آئے لیکن اس سے دھوکہ نہ ہو۔“

(۱) لسانی و تہذیبی جاہلیت کا المیہ اور اس سے سبق صفحہ ۹

(۲) ایضاً صفحہ ۱۰

اس کے بعد حضرت مولانا نے عصبیت جاہلیت پر سخت تنقید کی ہے اور دکھایا کہ زبان اللہ کی رحمت ہے، اور زبانوں کا اختلاف بالکل قدرتی اور فطری ہے لیکن جب اس میں غلو اور مبالغہ کیا جاتا ہے، اور اس تقدیس شروع ہو جاتی ہے تو وہ رحمت کے بجائے عذاب بن جاتی ہے اور اس سے تعمیر کے بجائے تخریب کا کام لیا جانے لگتا ہے۔ تقریر کے اخیر میں حضرت مولانا اس کا علاج تجویز کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”عزیزان گرامی! زخم بہت گہرا ہے، لیکن کوئی زخم نہیں جس کا مرہم نہ ہو اور جو مندل نہ ہو سکے، عقل اور عزم شرط ہے، کھوئی ہوئی دولت کی باز یافت اور بھٹکے ہوئے گلے اور کھوئے ہوئے ریوڑ کو گھرانے کی کوشش میں لگ جاؤ۔ زبانوں سے اگر زہر پھیلایا جاسکتا ہے تو تریاق بھی مہیا کیا جاسکتا ہے، بلکہ یہ کام پہلے سے زیادہ فطری اور آسان ہے کہ زبان کے لیے بھی فطرت کا منشاء اور خدا کا حکم یہی ہے ۔“

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی یاد رکھیے! کسی زبان اور لٹریچر کا اسلامی روح، اسلامی تخیلات اور تعبیرات، اسلامی حقائق اور اصطلاحات سے نا آشنا ہونا اور دینی علوم کے خزانے سے محروم ہونا بہت بڑا خطرہ ہے، زبان کا دل و دماغ اور روح و ضمیر سے قرینہ تعلق ہے۔

جس زبان پر غیر اسلامی فکر اور غیر اسلامی ادب کا تسلط ہو، جس زبان پر غیر اسلامی چھاپ ہو، جس زبان کے بولنے والوں کا طریقہ اور اپنے مطالب کے ادا کرنے کا انداز دوسرا ہو، جس زبان کے استعارات و تشبیہات، محاورات و تلمیحات کسی مشرک نہ تہذیب یا فلسفہ سے ماخوذ ہوں، اور وہی شخصیتیں اور کردار، وہی ادیب و شاعر، اسی کے مصلح اور داعی، اسی کے فلسفی اور مفکر اس کے لیے قابل تقلید اور آئینہ دل ہوں، اس کو اسلامی شخصیتوں سے اور جس فضا میں اسلام پھلا پھولا، اس سے بیگانگی ہو، وہ قوم ہمیشہ ذہنی اور تہذیبی ارتداد کے خطرہ میں مبتلا رہے گی، اور اس کی جاہلی عصبیت کو ہر وقت

بیدار کیا جاسکے گا، نسل پرستی اور زبان پرستی کا ایک نعرہ اس کو مجنونی اور از خود رفتہ بنادینے کے لیے کافی ہے۔

حالیہ واقعات میں ہم نے اس کا نمونہ دیکھ لیا۔ اب آپ کا فرض ہے کہ آپ اس خطرہ کا سد باب کریں، ان زبانوں میں مہارت پیدا کریں، ان کی زبان و ادب کو نہ صرف اسلامیات سے مالا مال کر دیں بلکہ ان کی روح اور ضمیر کو مسلمان بنائیں اور ان کا مزاج اسلامی بنانے کی کوشش کریں، ان شخصیتوں کا رعب اور ذہنی تفوق دور کرنے کی کوشش کریں جو ان کو اسلام سے دور اور مشرکانہ تخیلات سے قریب کرتی ہیں، ان میں اسلام اور جاہلیت کے درمیان امتیاز کرنے، اول الذکر سے محبت کرنے اور آخر الذکر سے نفرت کرنے کی ایسی صلاحیت پیدا کر دیں کہ آئندہ کوئی جاہلی نعرہ اور زبان و نسل، ملک و وطن کی دہائی ان کو اسلام اور مسلمانوں سے کاٹ نہ سکے۔

اگر توفیق الہی سے آپ نے یہ فرض انجام دیا تو ہماری سابقہ غلطی جس کے نتیجے میں یہ ناشدنی واقعات پیش آئے، وہ ایک بڑی کامیابی کا پیش خیمہ بن جائے گی اور ملت اسلامیہ کے اس قیمتی خاندان کو جس میں ہزاروں کی تعداد میں علماء اور سیکڑوں کی تعداد میں اولیاء پیدا ہوئے اور جن کے اندر اب بھی اسلام سے محبت اور دین کے لیے حمیت پائی جاتی ہے، اور جن کے اسلاف نے ماضی قریب میں تیرہویں صدی کے مجاہد اعظم سید احمد شہیدؒ کے ساتھ وہ جاں بازیاں اور سرفروشیاں دکھائیں جنہوں نے ڈاکٹر ہنتر جیسے نقادوں کو بھی انگشت بد انداں بنا دیا، ایک جدید استحکام حاصل ہوگا اور ایک نئے دور کا آغاز ہوگا: **يَوْمَئِذٍ يُفْرِخُ الْمُؤْمِنُونَ ۖ يَنْصُرُ اللَّهُ يَنْصُرُ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ**۔ (اور اس روز مومن خوش ہو جائیں گے (خدا کی مدد سے) وہ جسے چاہتا ہے مدد دیتا ہے، اور وہ غالب (اور) مہربان

☆ ☆ ☆

ہے۔“ (۱)

﴿باب ہفتم﴾

اصلاحیات

اصلاح عقائد

دائرہ شاہ علم اللہ سے (جہاں حضرت مولانا کا خاندان صدیوں سے آباد ہے) توحید و سنت کی آواز ہمیشہ بلند کی جاتی رہی ہے، خاندان کے بزرگوں نے بڑی مضبوطی سے اس خصوصیت کو پکڑے رکھا، اپنے اپنے وقت میں بڑے مشائخ یہاں پیدا ہوئے لیکن نہ کسی کی قبر پختہ ہوئی، نہ سجادگی کا نظام جڑ پکڑ سکا، یہاں تک کہ قبروں پر کتبے لگانا بھی خاندان کے بزرگوں کو کبھی گوارہ نہ ہوا۔ ہمارے بڑے پھوپھا سید محمد مسلم حسنی بیان کرتے ہیں کہ خاندان کے ایک بزرگ میاں سید امین الدین صاحبؒ وفات سے کچھ پہلے فرمانے لگے: ”عقیدہ کا سوال ہوا تو انشاء اللہ بیڑا پار ہے اور عمل کی پوچھ ہوئی تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔“ اختصار کا وقت ہوا تو زبان سے ذکر جاری ہو گیا اور اسی حالت میں جان دی۔ تصوف سے اشتغال کے باوجود یہاں کبھی بدعات و خرافات نہیں پنپ سکیں۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کو ان کے شیخ نے ”تصور شیخ“ کی تلقین کی تو سید صاحبؒ نے فرمایا کہ ”مجھے اس سے شرک کی بو آتی ہے۔“

توحید

حضرت مولانا کی اسی ماحول میں پرورش ہوئی تھی، توحید کا صاف ستھرا اور کھرا عقیدہ مولانا کی کتابوں اور گفتگو میں ملتا ہے، مولانا کی ”اصلاحیات“ میں بھی اس کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، اپنی تقریروں میں بڑی وضاحت کے ساتھ حضرت مولانا عقیدہ توحید کا بیان

فرماتے تھے، عوام کے سامنے بہت کھول کھول کر ایک ایک چیز بیان فرماتے۔ بیعت ہونے والوں کے سامنے سب سے پہلے توحید پر مختصر تقریر فرماتے جس کے الفاظ آج بھی کانوں میں گونج رہے ہیں :

”سب سے پہلے توبہ، کہ عقیدہ درست رہے، یہ یقین ہو کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے اللہ کے کرنے سے ہوتا ہے، اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور اسی کا کام ہے نظام چلانا، پتہ اپنی جگہ سے اڑ نہیں سکتا، ذرہ ہل نہیں سکتا جب تک اللہ کا حکم نہ ہو، وہی روزی دیتا ہے، وہی اولاد دیتا ہے، وہی تقدیر بناتا ہے، نہ کسی پیر فقیر کے بس میں کچھ ہے نہ کسی نبی یا ولی کے، سب اسی کے تابع دار ہیں اور جو ہوتا ہے اسی کے حکم سے ہوتا ہے۔“ (۱)

شاہ اسماعیل شہیدؒ کی کتاب ”تقویۃ الایمان“ کا حضرت مولانا نے بڑے اہتمام سے عربی میں ترجمہ کیا اور حواشی لکھے ”رسالة التوحید“ کے نام سے یہ کتاب چھپی تو اس کو عرب علماء نے توحید کی مخنیق قرار دیا۔

”العقیدۃ والعبادۃ والسلوک“ کے نام سے مستقل کتاب تحریر فرمائی، اس کے شروع میں عقیدہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

”اس دین کا سب سے پہلا امتیاز اور نمایاں شعار ”عقیدہ“ پر زور اور اصرار، اور سب سے پہلے اس کا مسئلہ حل کر لینے کی تاکید ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین محمد ﷺ تک تمام انبیائے کرام ایک معین عقیدہ کی (جو ان کو وحی کے ذریعہ ملا تھا) دعوت دیتے اور اس کا مطالبہ کرتے رہے، اور اس کے مقابلہ میں کسی مفاہمت یا دست برداری پر تیار نہ ہوئے، ان کے نزدیک بہتر سے بہتر اخلاقی زندگی اور اعلیٰ سے اعلیٰ انسانی کردار کا حامل، نیکی و صلاح، سلامت روی اور معقولیت کا زندہ پیکر، اور مثالی مجسمہ خواہ اس سے کسی بہتر حکومت کا قیام، کسی صالح معاشرہ کا وجود، اور کسی مفید انقلاب کا ظہور ہوا ہو، اس وقت تک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا جب مفہوم یہی ہوتا تھا، الفاظ میں ممکن ہے کہ کچھ فرق ہو گیا ہو۔“ (۱)

تک کہ وہ اس عقیدہ کا ماننے والا نہ ہو جس کو وہ لے کر آئے، اور جس کی دعوت ان کی زندگی کا نصب العین ہے، اور جب تک اس کی یہ ساری کوششیں اور کاوشیں صرف اس عقیدہ کی بنیاد پر نہ ہوں۔ یہی وہ حدِ فاصل ہے اور واضح روشن خط ہے جو انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت اور قومی رہنماؤں، سیاسی لیڈروں، انقلابیوں اور ہر اس شخص کے درمیان کھینچ دیا گیا ہے جس کا سرچشمہ فکر و نظر انبیائے کرام کی تعلیمات اور سیرتوں کے بجائے کوئی اور ہو۔“ (۱)

موجودہ دور میں عقیدہ صحیحہ سے صرف نظر کر لینے کا جو مزاج بن گیا ہے اس پر نکیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”موجودہ دور کے بگڑے ہوئے حالات سے دل برداشتہ بہت سے لوگوں کے اندر یہ مزاج پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ہر اس شخص کے جو انقلاب کا نعرہ لگائے یا کسی بڑی طاقت کو چیلنج کرے، عقیدہ کے ہر بگاڑ، اور افکار و نظریات کی ہر کجی اور انحراف کو معاف کر دیتے ہیں، اور عقیدہ کے مسئلہ سے بالکل صرف نظر کر لیتے ہیں، بلکہ الٹے ان لوگوں کو ہدفِ ملامت بنا لیتے ہیں، اور کبھی باطل طاقتوں سے ساز باز کر لینے کا الزام بھی لگاتے ہیں جو اس موقع پر عقیدہ کی بحث کو اٹھائیں، اور اس شخص کے عقائد کے بارہ میں کوئی سوال کریں۔ یہ طرز فکر اور طرز عمل صحیح دینی مزاج اور نبوی طریق سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔“ (۲)

عقیدہ کی اہمیت کو اور وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”عقیدہ کی اہمیت اور اس کے وصل و فصل کا معیار ہونے کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ سورۃ ”الکافرون“ مکہ مکرّمہ میں اس وقت نازل ہوئی جب حالات نرمی، تلطف اور عبادت و عقیدہ کی بنیاد پر دشمنی پیدا نہ کرنے اور اس مسئلہ کو اس وقت تک کے لیے ملتوی رکھنے کے متقاضی تھے

جب اسلام کو طاقت حاصل ہو جائے، اور معتدل و مدسکون حالات ہوں۔
لیکن قرآن صاف صاف کہتا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کھل کر اعلان کرتے ہیں :

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ. لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ. وَلَا أَنْتُمْ عِبُدُونَ
مَا أَعْبُدُ. وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُمْ. وَلَا أَنْتُمْ عِبُدُونَ مَا أَعْبُدُ. لَكُمْ
دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ. (سورة الکافرون)

(اے پیغمبر! ان منکران اسلام سے کہہ دو کہ اے کافرو! جن
(بتوں) کو تم پوجتے ہو میں نہیں پوجتا، اور جس (خدا) کی میں عبادت کرتا
ہوں اس کی تم عبادت نہیں کرتے، اور میں پھر کہتا ہوں کہ جن کی تم پرستش
کرتے ہو ان کی میں پرستش کرنے والا نہیں ہوں، اور نہ تم اس کی بندگی
کرنے والے (معلوم ہوتے) ہو جس کی میں بندگی کرتا ہوں۔ تم اپنے دین
پر، میں اپنے دین پر)۔“ (۱)

تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا، ۱۹۵۰ء کے آس
پاس کی بات ہوگی کہ حضرت مولانا نے عقائد پر بڑے مفصل اور مدلل مضامین تحریر
فرمائے، جن میں خاص طور پر ان عقائد کی افادیت اور اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور ان کو
انسان کی ایک اہم ضرورت قرار دیا گیا ہے، توحید، رسالت اور آخرت کے عنوان سے الگ
الگ مضامین شائع ہوئے۔

توحید کے مضمون میں حضرت مولانا نے ثابت کیا ہے کہ عقیدہ توحید کے بغیر انسان
کس طرح گمراہیوں میں بھٹکتا ہے، دھوکہ اور غفلت کا شکار ہوتا ہے، اس کو صحیح زندگی کا
سرا ہاتھ نہیں آتا۔ پھر مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ توحید کا علم افضل ترین علم ہے جو صرف
حضرات انبیاء کرام سے حاصل ہوتا ہے، جو لوگ ان کی اتباع کرتے ہیں وہ صحیح راستہ پر
آ جاتے ہیں اور جو ان کا انکار کرتے ہیں وہ بھٹکتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد مولانا نے مشرکین
عرب کے یہاں شرک کی جو قسمیں رائج تھیں ان کا بیان فرمایا ہے، شرک کے مظاہر و اعمال

اور جاہلی رسم و رواج کا تذکرہ کیا ہے، اور تحریر فرمایا ہے کہ نبوت کا اصل مقصد ہی عالمگیر مشرکانہ جاہلیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے۔

ہندوستان جو عرصہ دراز سے شرک و بت پرستی کا مرکز رہا ہے، یہاں شروع سے مجددین و مصلحین امت نے عقیدہ توحید کی پوری حفاظت کی ہے۔ حضرت مولانا نے ان کی پوری تاریخ بیان فرمائی ہے۔

حضرت مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ توحید کا سرچشمہ آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی ہے، تحریر فرماتے ہیں :

”آنحضرت ﷺ توحید کے سب سے بڑے امین اور اس کے سب سے بڑے مبلغ و داعی اور اس کے عارف و حقیقت شناس تھے، صدیوں سے انہی کی لائی ہوئی دولت ہے جو اب تک بٹ رہی ہے اور قیامت تک بٹی رہے گی، ہمارے اور آپ کے دامن میں بھی خدا کے فضل سے وہی دولت موجود ہے۔ آنحضرت ﷺ (روحی فداہ) سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والے، سب سے زیادہ اللہ کو پہچاننے والے، سب سے زیادہ اللہ کو چاہنے والے، سب سے زیادہ اللہ پر قربان ہونے والے تھے، اس لیے آپ کی غیرت کا بھی یہ حال تھا کہ ایک شخص نے صرف یہ کہہ دیا کہ : من یطع اللہ ورسولہ فقد رشد ومن یعصہما فقد غوی۔ (جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ ہدایت پائے گا اور جو ان دونوں کی نافرمانی کرے گا وہ گمراہ ہوگا۔) آپ اس کو برداشت نہیں کر سکے، اور آپ سے سنا نہ گیا، فرمایا ”بنس الخطیب أنت ، قل ومن یعص اللہ ورسولہ“ (تمہیں بات کرنے کا سلیقہ نہیں (الگ الگ) یوں کہو کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ گمراہ ہوگا) ایسے ہی ایک شخص نے کہا ماشاء اللہ وشتت (اگر اللہ اور آپ چاہیں تو یہ کام ہو جائے گا) آپ نے فرمایا : جعلتني واللہ عدلا (تم نے مجھے خدا کا ہمسر بنا دیا) بل

ماشاء اللہ وحدہ (نہیں جو تنہا خدا چاہے)

یہ ہے غیرت کا عالم، ایک عاشق صادق کو جتنی محبت ہوتی ہے، اتنی ہی غیرت ہوتی ہے، غیرت تابع ہے محبت کے، غیرت تابع ہے علم کے، غیرت تابع ہے خلوص کے۔ (۱)

حضرت مولانا نے اپنی تقریروں میں بھی توحید کی پرزور دعوت دی ہے، اور شرک و مظاہر شرک کی بیخ کنی فرمائی ہے۔

کشمیر کی تقریروں میں حضرت مولانا نے بڑی قوت کے ساتھ شیخ علی ہمدانی کی دعوت توحید کا ذکر فرمایا ہے۔ ملک و بیرون ملک دسیوں تقریروں میں مولانا نے حضرت یعقوب علیہ السلام کا واقعہ سنایا ہے اور ان کی وصیت کا تذکرہ فرمایا ہے، اس کے بیان میں حضرت مولانا خاص اسلوب اختیار فرماتے تھے۔

حضرت مولانا نے عقیدہ توحید کو مسلمانوں کا بین الاقوامی شعار اور طاقت کا سرچشمہ قرار دیا ہے، اور شرک کو کمزوری کا سبب گردانا ہے، اور اس کے عقلی دلائل اپنی تقریروں میں پیش فرمائے ہیں۔

ردِ شرک و بدعت

حضرت مولانا نے جس طرح حقیقت توحید کو کھول کھول کر اپنی تحریروں اور تقریروں میں پیش کیا ہے اسی طرح کفر و شرک اور بدعت کی باریکیوں کو بڑے حکیمانہ طریقہ پر واضح کیا ہے اور ان سے دور رہنے کی جا بجا تلقین کی ہے۔

حضرت مولانا کے خاندانی بزرگ حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کا یہ امتیاز ہے کہ ان کو دور سے شرک و بدعت کی بو محسوس ہوتی تھی اور ان کی لطیف حس اس کے ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ کو گوارہ نہیں کر سکتی تھی، ان حضرات کا پورے خاندان پر اثر تھا، اسی سلسلہ کا فیض تھا کہ حضرت خواجہ احمد صاحب نصر آبادیؒ اور حضرت مولانا محمد امین صاحب نصر آبادیؒ کے قدم جہاں جہاں پہنچے وہاں شرک و بدعت کی بیخ کنی ہوئی اور عرصہ دراز

تک یہ اثرات قائم رہے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ کی اسی ماحول میں تربیت ہوئی تھی، مولانا کی حساسیت بھی اس بارے میں بہت بڑھی ہوئی تھی، مظاہر شرک و بدعت دیکھ ان کی رگِ حمیت جوش مارنے لگتی تھی، انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں صاف صاف اس کا اظہار کیا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں جبکہ مولانا کی عمر نے تیسری دہائی کو بھی پار نہیں کیا تھا، انہوں نے شرک و بدعت کے رد میں بڑا طاقتور اور مفصل مضمون قلمبند فرمایا تھا جو ”الفرقان“ اور ”الندوہ“ میں شائع ہوا، اس میں حضرت مولانا نے مناظرانہ اسلوب اختیار کرنے کے بجائے علمی طرز استدلال اختیار کیا ہے اور قلب و دماغ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے، شرک کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

”شرک ایک مستقل دین اور ایک مکمل حکومت ہے، اس کا اور دین اللہ کا کسی ایک جسم یا دل و دماغ یا خطہ زمین پر ایک ساتھ قائم ہونا ناممکن ہے، یہ غیر الہی دین جسم و نفس سے خارج اتنی ہی جگہ گھیرتا ہے جتنی دین اللہ کو کم سے کم درکار ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ (البقرة-۱۶۵)

(بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ کے برابر اوروں کو بناتے ہیں، ان کی محبت ایسی رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ کی)

تَا اللَّهُ إِنَّ كُنَّا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ، اِذْ نَسُوْا بَرِّكَ الْعَالَمِيْنَ . (الشعراء- ۹۵-۹۸)

(مشرکین نے کہا) خدا کی قسم ہم کھلی ہوئی گمراہی میں تھے جو تم کو (معبودوں کو) سارے جہانوں کے پروردگار کے برابر کرتے تھے۔)

اس لیے جب تک زمین سے شرک کی تمام جڑیں اور اس کی باریک سے باریک رگیں بھی اکھاڑ نہ دی جائیں، اس وقت تک دین اللہ کا پودا لگ نہیں سکتا، اس لیے کہ یہ پودا کسی ایسی زمین میں جڑ نہیں پکڑتا جس کی مٹی میں کسی اور درخت کی جڑ ہو، یا کوئی اور تخم ہو، اس کی شاخیں اسی وقت آسمان سے

باتیں کرتی ہیں اور یہ درخت اسی وقت پھلتا پھولتا ہے جب اس کی جڑ گہری اور مضبوط ہو۔“ (۱)

کفر کے ساتھ اسلام باقی نہیں رہ سکتا، اسلام کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ کفر و شرک اور اس کے تعلقات سے آدمی پوری طرح براءت ظاہر کر دے، حدیث صحیح سے استدلال کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں :

”اسلام کی صحت کی دلیل یہ ہے کہ کفر اور اس کے پورے ماحول، اس کے تمام تعلقات، اس کی تمام خصوصیات اور شعائر سے نفرت پیدا ہو جائے اور اس کی طرف واپسی، اور اس میں مبتلا ہو جانے کے تصور سے آدمی کو تکلیف ہو۔ اور ایمان کی پختگی یہ ہے کہ وہ کفر کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ کام کے مقابلہ میں موت کو زیادہ پسند کرتا ہو۔ بخاری کی حدیث ہے :

ثَلَاثٌ مِنْ كُنْهٍ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ: أَنْ يَكُونَ اللَّهُ وَرَسُولَهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْءُ لَا يُحِبَّهُ إِلَّا اللَّهَ، وَأَنْ يَكْفِرَ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْفِرُ أَنْ يَقْذِفَ فِي النَّارِ.

(تین باتیں جس شخص میں ہوں گی اس کو ایمان کی حلاوت محسوس ہوگی، ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ ان کے ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں، دوسرے یہ کہ کسی دوسرے انسان سے صرف اللہ ہی کے لیے محبت ہو، تیسرے یہ کہ کفر میں جانا اس کے لیے اتنا ہی ناگوار ہو جتنا آگ میں ڈالا جانا)۔“ (۲)

بدعت کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں :

”شرک و کفر اگر مستقل دین ہیں تو بدعت مستقل شریعت ہے، اور شرک و کفر اگر اسلام کے مقابلہ میں خارج کی چیزیں ہیں تو بدعت شریعت الہی کے اندر شریعت انسانی کی تشکیل ہے جو اندراندر نشوونما پاتی رہتی ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات (اگر اس کو آزادی کے ساتھ نشوونما پانے کا موقع

(۱) دین حق اور علمائے ربانی شرک و بدعت کے خلاف کیوں؟ صفحہ ۱۶

(۲) ایضاً صفحہ ۲۲

دیا جائے) اصل شریعت سے دو چند و سہ چند ہو جاتی ہے، اور رفتہ رفتہ شریعت الہی کی ساری جگہ اور انسان کے سارے وقت کو گھیر لیتی ہے، اُس شریعت کی فقہ الگ ہے، اس کے فرائض و واجبات اور سنن و مستحبات مستقل ہیں اور بعض اوقات تعداد میں شریعت الہی کے احکام سے کہیں زیادہ۔

بدعت سب سے پہلے اس حقیقت کو نظر انداز کرتی ہے کہ تشریع (قانون سازی) اللہ کا حق ہے، کسی چیز کو قانونی حیثیت دینا، اس کی پابندی ضروری قرار دینا، یہ منصب صرف شارع (اللہ) کا ہے، انسانی قانون سازی اسی منصب الہی کے خلاف بغاوت ہے، اسی لیے قانون ساز انسان کو قرآن ”طاغوت“ کہتا ہے: يُرِيدُونَ أَن يُتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ (النساء-۶۰) (چاہتے ہیں کہ اپنا مقدمہ ایک سرکش کے پاس لے جا کر فیصلہ کرائیں حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ اس سے اعتقاد نہ رکھیں) (۱)

بدعت کی دوسری بڑی خرابی کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں : بدعت دوسری جس حقیقت کو نظر انداز کرتی ہے، یہ ہے کہ شریعت مکمل ہو چکی ہے، جس کا تعین ہونا تھا اس کا تعین ہو گیا، ایک انسان کی نجات کے لیے جتنے اعمال ضروری ہیں اور تقرب الی اللہ کے لیے جتنے وسائل تھے ان سب کی وضاحت کر دی گئی، اور دین کی نکسال بند کر دی گئی، اب جو نیا سکہ اس کی طرف منسوب کیا جائے گا وہ جعلی ہوگا :

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا. (میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا، اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی، اور اسلام کو بطور دین کے تمہارے لیے پسند کیا)

تکمیل نعمت کے یہ خلاف ہے کہ دین و شریعت کا ایک بڑا حصہ مشتبہ اور غیر متعین چھوڑ دیا جائے، اور صدیوں تک مسلمان اس کی دریافت سے غافل

اور اس کے ثواب سے محروم رہیں، خصوصاً خیر القرون کے وہ لوگ جو ”اتممت علیکم نعمتی“ کے مخاطب اول تھے اور پھر صدیوں کے بعد اس کا انکشاف اور تعین ہو۔

اس شریعت میں جو شخص بھی کوئی نیا اضافہ کرتا ہے اور کسی خارج از دین بات کو دین کا جزء قرار دیتا ہے، کسی ایسی چیز کا اہتمام کرتا ہے جس کا اللہ کے رسول ﷺ نے اہتمام نہیں کیا یا تقرب الی اللہ کے کسی نئے ذریعہ کا انکشاف کرتا ہے وہ گویا زبان حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ دین میں یہ کمی رہ گئی تھی، اس کو اب پورا کیا جا رہا ہے، اور یہ آنحضرت ﷺ کی تبلیغ رسالت پر بڑا الزام ہے جن کو حکم تھا کہ :

يَا أَيُّهَا الرُّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ. (المائدة-۶۷)

(اے پیغمبر! پہنچا دو جو تمھاری طرف تمھارے رب کی طرف سے اتارا گیا، اور اگر ایسا نہیں کیا تو تم نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا) امام مالکؒ نے کیا خوب کہا ہے :

من ابتدع في الاسلام بدعة يراها حسنة فقد زعم أن محمد ﷺ خان الرسالة فان الله سبحانه يقول ”الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ“ فما لم يكن يومئذ دينا فلا يكون اليوم دينا.

(جس نے اسلام میں کوئی بدعت پیدا کی اور اس کو اچھا سمجھتا ہے، وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ محمد ﷺ نے (نعوذ باللہ) پیغام پہنچانے میں خیانت کی، اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے کہ میں نے تمھارے لئے تمھارے دین کو مکمل کر دیا، پس جو بات عہد رسالت میں دین نہیں تھی وہ آج بھی دین نہیں ہو سکتی)۔ (۱)

آخر میں ایک بڑے نکتہ کی بات بیان فرماتے ہوئے مولانا کہتے ہیں جس سے سنت و بدعت کا فرق واضح ہوتا ہے اور ہر خاص و عام کے لیے اس کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے :

یہ نکتہ بھی قابل لحاظ ہے کہ الہی دین و شریعت کی ایک خصوصیت ان کی عالمگیر یکسانی ہے، یہ یکسانی زمانوں کے لحاظ سے ہے اور مکانوں کے لحاظ سے بھی، اللہ چونکہ رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ہے، وہ زمان و مکان کے حدود و قیود سے بالاتر ہے، اس لیے اس کی شریعت میں کامل یکسانی پائی جاتی ہے۔ اس کی آخری شریعت جس کی تکمیل آخری پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ پر ہو چکی ہے آفتاب کی طرح سب کے لیے یکساں ہے، اس کی شکل جو قرن اول میں تھی وہی شکل پندرہویں صدی ہجری میں بھی ہے، وہ جیسی اور جتنی مشرق والوں کے لیے ہے ویسی ہی اور اتنی ہی مغرب والوں کے لیے بھی، جو قواعد و احکام، عبادت کے جو اشکال اور تقرب الی اللہ کی جو متعین شکلیں اہل عرب کے لیے تھیں وہی اہل ہندوستان کے لیے بھی۔ اسی لیے اگر دنیا کے کسی حصہ کا کوئی مسلمان باشندہ دنیا کے کسی دوسرے حصہ میں چلا جائے تو اس کو فرائض اسلام ادا کرنے میں اور مسجد میں عبادت کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی، نہ اس کے لیے کسی مقامی ہدایت نامہ اور رہبری کی ضرورت ہوگی، اس کو دینی حیثیت سے کوئی اجنبیت اور مسافرت محسوس نہیں ہوگی، علاوہ مقتدی ہونے کے وہ اگر صاحب علم ہے تو ہر جگہ امام بن سکتا ہے اور ہر جگہ فتویٰ دے سکتا ہے۔

لیکن بدعت کا یہ خاصہ نہیں، ان میں یکسانی اور وحدت نہیں ہوتی، ان میں زمان و مکان کا پرتو ہوتا ہے، وہ ہر جگہ مقامی سانچہ اور ملکی یا شہری ٹکسال سے ڈھل کر نکلتی ہیں اور خاص تاریخی و مقامی اسباب اور ماحول میں بنتی ہیں، ان کو تمام عالم اسلامی میں رواج نہیں دیا جاسکتا، نہ دنیا کے تمام مسلمانوں کو ان کا علم ہونا ضروری ہے، علم ہونے کے بعد یہ ضروری نہیں کہ وہ سب ان کو

قبول کر لیں، اس لیے کہ ہندوستان کی بدعات مصر کی بدعات سے مختلف ہیں اور ایران و شام کی بدعات میں کوئی اشتراک نہیں۔ ملکوں سے گذر کر بعض اوقات شہر شہر کی بدعات مختلف ہوتی ہیں، ایک شہر کے مسلمانوں کو دوسرے شہر کی مخصوص بدعات کا علم نہیں ہوتا، یہ بات بڑھتے بڑھتے محلوں اور گھروں تک پہنچ سکتی ہے، اور گھر گھر کا دین مختلف ہوتا ہے۔“ (۱)

رسالت

رسالت کا عقیدہ اسلامی عقائد میں عقیدہ توحید کے بعد بنیادی حیثیت رکھتا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ حقیقت توحید تک رسائی رسالت کے عقیدہ و ایمان کے بغیر ممکن نہیں، توحید کا صحیح علم اور اللہ کی صحیح معرفت انبیاء کرام ہی کے واسطے سے دنیا کو حاصل ہوئی ہے۔

حضرت مولانا نے اس موضوع پر متعدد مضامین و مقالات کے علاوہ مستقل کتاب تصنیف فرمائی ہے، ”منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین“ کے نام سے یہ کتاب تین سو صفحات میں مکمل ہوئی ہے اور اس میں وہ حقائق آگئے ہیں جو کم دوسری کتابوں میں مل سکتے ہیں۔ یہ حضرت مولانا کے وہ آٹھ پر مغز خطبات ہیں جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں دیئے گئے ہیں، یہ عربی خطبات تھے اور کتابی شکل میں ”النبوۃ والانبیاء فی ضوء القرآن“ کے نام سے شائع ہوئے تھے جو بعد میں اردو کے قالب میں ڈھالے گئے اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بنی نوع انسان اور تمدن انسانی پر نبوت کے احسانات کا ذکر کیا گیا ہے اور انسانیت کے لیے نبوت کی ضرورت کو عقلی دلائل کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انبیاء کرام ہی ہدایت کا واحد ذریعہ ہیں، ان کی رہنمائی حاصل کیے بغیر انسان کس طرح درد کی ٹھوکریں کھاتا ہے اور ناکامی کا منہ دیکھتا ہے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں :

”اللہ کی ذات اور اس کی حقیقی صفات کی نشاندہی کرنے والے

صرف انبیاء کرام ہی ہیں، اور وہی اللہ کی صحیح معرفت کا، جس میں نہ جہالت

وگمراہی کا شائبہ ہو، نہ غلط فہمی یا غیر مناسب انداز بیان کا شبہ واحد وسیلہ ہیں،

اور ان کے بتائے ہوئے طریقوں کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے وہ معرفت حاصل ہو بھی نہیں سکتی، نہ تنہا عقل رہنمائی کر سکتی ہے، نہ ذہن کی تیزی و ذکاوت کافی ہو سکتی ہے، نہ فطرت کی سلامتی اس کا ذریعہ بن سکتی ہے، نہ ذہن کی بلند پروازی کی وہاں گزر ہے، نہ عقل و خرد کی کاوشیں اس تک پہنچا سکتی ہیں، نہ تجربات کا خزانہ ہی مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ اللہ نے اسی حقیقت کا اظہار اہل جنت کی زبانی کیا ہے جو سچے بھی ہیں اور صاحب تجربہ بھی، اور یہ موقع بھی ایسا ہے کہ وہاں غلط بیانی اور مبالغہ آمیزی کا کوئی گزر نہیں: **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیْ لَوْلَا اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ.** (سورۃ الاعراف-۴۳)

(خدا کا شکر ہے جس نے ہم کو یہاں کا رستہ دکھایا اور اگر خدا ہم کو رستہ نہ دکھاتا تو ہم رستہ نہ پاسکتے۔)

اور اس اعتراف و اقرار کے ساتھ ہی وہ انبیاء کا تذکرہ کرتے ہیں کہ وہی معرفت صحیح کا ذریعہ اور اس راستہ کے رہنما تھے، جو اس منزل تک پہنچاتا ہے۔ **لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ** (سورۃ الاعراف-۴۳)

(بے شک ہمارے پروردگار کے رسول حق بات لے کر آئے تھے) (۱)

آگے حضرت مولانا نے تحریر فرمایا کہ :

یونانیوں کی ناکامی کا راز یہی تھا کہ: انہوں نے مابعد الطبیعیات اور الہیات میں بھی عقل کے گھوڑے دوڑائے، اور سمجھا کہ وہ اس میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔

لیکن اس دماغ سوزی کا جو نتیجہ انہوں نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، وہ بوالعجبیوں کا ایک مرقع، دانائوں کی نادانی کا ایک شاہکار اور باہم متضاد دو مختلف اقوال و آراء اور قیاسات اور دعاوی کا مجموعہ ہے، حجتہ الاسلام امام

غزائی نے اس پر بالکل صحیح تبصرہ فرمایا ہے: ”تہ بہ تہ تاریکیاں ہی تاریکیاں، اگر کوئی انسان اس طرح کا اپنا خواب بیان کرے تو اس کو سوء مزاج کا نتیجہ قرار دیا جائے۔“ (۱)

انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات سے بے نیازی کے انجام کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا تحریر فرماتے ہیں :

”مہذب اور ترقی یافتہ قومیں جو اپنے اپنے زمانہ میں تہذیب و ثقافت، ذہانت اور علمی ایجادات میں بلند ترین معیار پر پہنچی ہوئی تھیں وہ بھی انبیاء کرام کی لائی ہوئی تعلیمات اور ان کے مخصوص علم کی اتنی ہی ضرورت مند تھیں جتنا کہ دریا میں ڈوبنے والا سہارے کے لیے کسی کشتی کا محتاج ہوتا ہے یا زندگی سے مایوس مریض کو اکسیر دوا کی ضرورت ہوتی ہے، ان ترقی یافتہ قوموں کے افراد اس مخصوص اور ضروری علم کے اعتبار سے (دوسرے علوم یا تہذیب و تمدن میں جتنے بھی آگے رہے ہوں) طفل شیر خوار، جاہل محض اور تہی دست و بے بضاعت تھے، اور انہوں نے اپنی علمی کامیابیوں اور تمدنی ترقیات کے باوجود جب اس علم کو رد کر دیا اور اس کا مذاق اڑایا تو انہوں نے اپنے لیے اور اپنے قوم و معاشرہ کے لیے تباہی و ہلاکت کو دعوت دی، متعدد ترقی یافتہ اور متمدن قومیں جو علم و ادب کے بیش بہا خزانوں سے مالا مال تھیں اور ذکاوت و عبقریت میں جن کی مثال دی جاتی تھی، اس انکار، تکبر، غرور، خود پرستی اور اپنے علوم اور صنعتوں پر فخر کا شکار ہو چکی ہیں، اپنے زمانہ کے نبی کی لائی ہوئی تعلیمات کو انہوں نے حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھا، اس سے بے نیازی برتی، اس کو بیکار اور بے قیمت سمجھا، تو وہ اسی غرور ہی کی نذر ہو گئیں، اور وہ حماقت جو اعلیٰ ذہانت نظر آتی تھی، وہ تنگ نظری جس کو اس وقت دور اندیشی اور حقیقت شناسی کہا جاتا تھا، ان کو لے ڈوبی اور انہوں نے اپنے کیے کا مزہ چکھ لیا۔“ (۲)

پہلے خطبہ کا اختتام مولانا نے ایک خاص مضمون پر کیا ہے، جس میں انسانیت کی خیر و برکت اور تمدن کے ارتقاء کا بنیادی سبب حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

”انسانوں کی تہذیب و تمدن اور ان کی ارتقاء پر اس مبارک و مقدس طبقہ کے جس قدر احسانات ہیں کسی اور طبقہ کے نہیں ہیں، الطاف و عنایات کا خشک سایہ، انسانوں کی عزت، ان کی شرافت، ان کے اعتدال، ان کے توازن اور ان کی پوری زندگی پر چھایا ہوا ہے، ان ہی الطاف و عنایات کے زیر سایہ حیات انسانی کی بقاء کا امکان ہے، اگر انبیاء کرام علیہم السلام نہ ہوتے تو انسانیت کا سفینہ اپنے علم، فلسفہ، حکمت اور تہذیب و تمدن سمیت طوفان کی نذر ہو جاتا، اور روئے زمین پر انسانوں کے بجائے جنگلی جانوروں اور درندوں کے ریوڑ کلیلیں کرتے ہوئے نظر آتے، جو اپنے خالق اور رب کو پہچانتے نہ دین و اخلاق سے آشنا ہوتے، نہ رحمت و محبت کا احساس رکھتے اور نہ آب و دانہ یا گھاس چارہ سے بلند کوئی بات ان کے ذہن میں آتی۔“ (۱)

دوسرے خطبہ میں حضرت مولانا نے انبیاء کرام کی امتیازی خصوصیات، ان کے مزاج اور طریقہ کار کا تذکرہ فرمایا ہے، اور انبیاء کرام اور دوسرے رہنماؤں کے بنیادی فرق کو واضح کیا ہے۔ سب سے اہم خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”پہلی اور اہم ترین خصوصیت، جس میں انبیاء کرام علیہم السلام دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں، یہ ہے کہ جس علم کی وہ لوگوں میں نشر و اشاعت کرتے ہیں، جس عقیدہ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں، اور جس پیغام کی تبلیغ کہ ذمہ داری ان کے سپرد کی جاتی ہے، وہ نہ تو ان کی ذہانت کی پیداوار ہے، نہ اس فاسد اور تکلیف دہ صورت حال کا رد عمل ہے، جس میں وہ زندگی گزارتے ہیں، نہ ان کے لطیف و نازک شعور یا ذہن

وحساس قلب کا ساختہ پر داختہ، نہ ان کے وسیع اور حکیمانہ تجربات کا نتیجہ، بلکہ اس کا منبع و مأخذ وحی آسمانی اور الہی پیغامات ہیں، جن کے لیے وہ منتخب کیے گئے ہیں، اور جس کا ان کو شرف بخشا گیا ہے، لہذا کبھی بھی دوسرے حکماء، زعماء، مصلحین اور ان تمام رہنماؤں پر ان کو قیاس نہیں کیا جاسکتا، جن کا انسانیت اور اصلاح و عزیمت کی طویل تاریخ نے تجربہ کیا ہے، جو یا تو معاشرہ کی پیداوار ہوتے ہیں یا اپنی حکمت و ذہانت کا نتیجہ یا ماحول کی صدائے بازگشت یا اپنے ارد گرد ایلتے ہوئے فساد اور انارکی کے لاوہ کار و عمل اور اس کے خلاف ایک صدائے احتجاج۔“ (۱)

رسول اور ایک عام قائد کے درمیان فرق کو اور واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”رسول نہ تو داخلی نفسیاتی عوامل کے سامنے جھکتا ہے، نہ خارجی وقتی حادثات کے سامنے، اور نہ اپنی رسالت کو اس رخ پر موڑتا ہے جدرہ ماحول یا حالات مڑتے ہیں، یا معاشرہ چاہتا ہے۔

اسی طرح رسول اس کی بھی استطاعت نہیں رکھتا کہ وہ احکام رسالت میں کوئی تبدیل کر سکے، اللہ اپنے رسول کی طرف سے فرماتا ہے:

قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَبَدِّلَهُ مِنْ تَلَقَّائِي نَفْسِي. إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ. (یونس - ۱۵)

(”کہہ دو کہ مجھ کو اختیار نہیں ہے کہ اسے اپنی طرف سے بدل دوں میں تو اسی حکم کا تابع ہوں جو میری طرف آتا ہے۔“ (۲))

وہ عام مصلحین اور قائدین جن کی ساری تنگ و دو ان کے احساس و شعور اور ماحول کی پیدا کردہ ہوتی ہے، اور رد عمل کے طور پر سامنے آتی ہے، ان کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

”یہ رہنما ہمیشہ مصلحت اور ضرورت وقت کا لحاظ رکھتے ہیں، اکثر

حالات کے سامنے جھک بھی جاتے ہیں، جس کے نتیجہ میں بعض اصولوں کو ترک کرنا پڑتا ہے، اور کبھی دوسری جماعتوں سے معاملہ بھی کرتے ہیں ”دین

دین“ کا طریقہ اپناتے ہیں، اور ان میں سے اکثر کا اصول یہ ہوتا ہے

ع چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔“ (۱)

حضرت مولانا نے لکھا ہے کہ:

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام بھی حکمت و تیسیر کو اختیار فرماتے ہیں
لیکن صرف تعلیم و تربیت اور جزوی مسائل میں، جن چیزوں کا تعلق عقائد
یادین کے بنیادی اصولوں یا فرائض و منصوصات سے ہوا ان میں وہ حضرات
فولاد سے زیادہ سخت اور پہاڑ سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں، ان میں وہ نہ کوئی
زہری دکھا سکتے ہیں، اور نہ کسی قسم کا معاملہ یا سمجھوتا کر سکتے ہیں۔“ (۲)

پھر تحریر فرماتے ہیں کہ وہ توحید کے بارے میں سب سے زیادہ حساس ہوتے ہیں،
یہی ان کی دعوت کا محور ہے، شرک کی ادنیٰ سے ادنیٰ شکل وہ برداشت نہیں کر سکتے، یہی شرک
و بت پرستی اپنی تمام واضح اور غیر واضح شکلوں کے ساتھ ان کے جہاد کا موضوع رہی ہے۔
صحابہ کرام نے بھی اسی مزاج کے ساتھ دین کی دعوت دی، اور پھر قیامت تک کے لیے یہ
سلسلہ جاری ہو گیا، دین کو اپنی پوری حقیقی شکل کے ساتھ ہر دور میں امت کے باصلاحیت
افراد نے پیش کیا ہے، کوئی دور اس سے خالی نہیں رہا کہ دین کو پورے طور پر سمجھنے والے موجود
نہ رہے ہوں۔

ایمان بالآخرت اور ایمان بالغیب کی دعوت کو مولانا نے حضرات انبیاء کرام علیہم
السلام کی خصوصیات میں شمار فرمایا ہے، اور اس کے بہتر اثرات و نتائج کا مثالیں دے کر تذکرہ
فرمایا ہے۔

تیسرے خطبہ میں حضرت مولانا نے ثابت کیا ہے کہ حضرات انبیاء ہی ہدایت کے
امام اور انسانیت کے قائد ہیں، ہر طرح کی غلطیوں سے پاک ہیں اور یہی عصمت امت کے
لیے تحفظ کی ضمانت ہے، حضرات انبیاء کرام کے بارے میں عصمت کا عقیدہ رکھنا انسانیت کی
ایک ضرورت ہے اور ان کی اطاعت و محبت ہی میں قوم کی کامیابی کا راز ہے۔

چوتھے خطبہ میں مولانا نے ارادہ الہی کی کارفرمائی اور ایمان کی اصل طاقت کا ذکر فرمایا

ہے۔ قرآن مجید میں بیان کردہ واقعات سے مولانا نے دکھایا ہے کہ کس طرح انبیاء کرام اپنی ایمانی طاقت سے بڑی بڑی طاقتوں پر غالب آئے۔

حضرات ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کا عنوان ہی مولانا نے ”مادیت کے لیے سب سے بڑا چیلنج اور اسباب کی خدائی کے خلاف سب سے بڑی بغاوت“ قرار دیا ہے، پھر نصرت الہی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فتح کو بیان کیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کو تنگ اور محدود مادی ذہنیت کے لیے ایک چیلنج قرار دیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کو اپنی ندرت و غرابت اور حوادث کے متعین طبعی اسباب، قانون، اور علت و معلول کے عام قانون کی کارفرمائی کے خلاف ایک تاریخی شہادت بتایا۔ ہے اور فرمایا کہ :

”انھیں بھائیوں کے حسد اور فریب، کنویں کی اندھیاری میں ایک مدت تک قیام، قافلہ والوں کی غلامی سے سابقہ پڑا جس میں ہلاکت، تکلیف، اور بے عزتی کا قوی اندیشہ تھا، لیکن وہ ان سب سے صحیح سالم بچ نکلے اور زندہ رہتے ہیں۔“ (۱)

پھر ان واقعات کو حضرت مولانا نے داعیوں اور دین کا کام کرنے والوں کے لیے قوت و اعتماد کا سرچشمہ قرار دیا ہے، اور فرمایا ہے کہ ”امت مسلمہ کا مستقبل حضرات انبیاء کرام کی سیرت سے وابستہ ہے۔“

پانچویں خطبہ کا عنوان ہی ”رسالت محمدی ﷺ کی عظمت“ ہے، جس میں مولانا نے عصر جاہلی کا ایسا تجزیہ فرمایا ہے جس سے ایک آفتاب تازہ کی ضرورت سامنے آتی ہے جو علم صحیح، قوی ارادہ، خیر کے ساتھ طلوع ہوتا ہے، اور حق کی حامی و ناصر ایک جماعت اس پر ایمان لاتی ہے اور پھر ایک عالمگیر دعوت ایمانی کے نتیجہ میں جاہلی ماحول میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے، اور بعثت محمدی ﷺ کی اس انقلابی تاثیر کے فیض سے ایک نئی دنیا ظہور میں آ جاتی ہے، ایک نیا عالمی رجحان بنتا ہے، اور ایک پوری امت برپا ہوتی ہے جو آنحضرت ﷺ کا ایک عظیم معجزہ ہے۔

چھٹے خطبہ کا موضوع ”نبوت محمدی ﷺ کا کارنامہ“ ہے اس میں حضرت مولانا نے

انسانی فطرت کے اسرار و عجائبات کا تذکرہ فرمایا ہے، اور انسان کے وجود کو ہر خیر و برکت اور اقبال و سعادت کی کنجی قرار دیا ہے، پھر فرماتے ہیں کہ :

”جب اس کی ساخت میں کچی آجاتی ہے اور اس کی تہذیب فاسد ہو جاتی ہے، حقیقی انسان نادر و نایاب ہو جاتے ہیں، اور جب اچھے انسان بنانے کا رواج اٹھ جاتا ہے تو یہی چیز تمام نبوتوں کا موضوع بنی ہے۔ ہر نبی اپنے زمانے میں اسی مہم کو لے کر اٹھا ہے، اور ایسے انسانوں کا اتنی کمیت اور ایسی کیفیت میں اٹھ کھڑا ہونا جس کا منظر تاریخ کی آنکھوں نے کبھی نہ دیکھا ہو، نہ ایسا نظارہ چشم فلک کے سامنے آیا ہو، وہ ایک سلک گہر، ایک سیسہ پلائی دیوار اور مضبوط ملت و جماعت بن گئے ہوں، اور ایک مشترکہ مقصد و عقیدہ کے لیے باہمی تعاون کرنے لگے ہوں، یہ نبوت محمدی ﷺ کا کارنامہ اور عظیم معجزہ ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے مردم سازی اور آدم گری کا کام اس سطح سے شروع کیا، جہاں سے کسی نبی یا مصلح کو نہیں کرنا پڑا تھا، اور نہ وہ اس کا مکلف بنایا گیا تھا، اس لیے کہ عام طور پر دیگر انبیاء کرام کی قوموں کی معاشرتی سطح زمانہ جاہلیت سے بہت بلند تھی، اس کے باوجود آنحضرت ﷺ نے اپنے اس عظیم کام کو اس سطح تک پہنچا دیا جہاں تک کسی نبی کا عمل نہیں پہنچا تھا۔

آپ ﷺ نے اس سطح سے کام شروع کیا، جہاں حیوانیت کی انتہا اور انسانیت کی ابتدا ہوتی تھی، اور اس اعلا سطح تک پہنچا دیا جو انسانیت کی انتہائی منزل ہے، اور جس کے بعد نبوت کے سوا کوئی اور درجہ نہیں اور جسے محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ختم کر دیا گیا۔

امت محمدیہ ﷺ کا ہر فرد اپنی ذات سے ایک مستقل معجزہ نبوت کی نشانیوں سے ایک نشانی، اس کے ابدی کارناموں میں سے ایک کارنامہ اور نوع انسانی کے اشرف و افضل ہونے کی ایک روشن دلیل ہے، کسی مصوّر نے

اپنے فن کار موئے قلم اور صنائع ذہن سے اس سے بہتر تصویر نہیں بنائی ہوگی، جیسے کہ حقیقت واقعہ، اور تاریخ کی شہادت کی روشنی میں وہ افراد موجود تھے۔ کسی شاعر نے بھی اپنے شاداب تخیل، مؤاج طبعیت اور شعری صلاحیت سے کام لے کر ایسے اوصاف جمیلہ، ایسی پاکیزہ سیرتوں اور ایسے برگزیدہ محاسن کا خیالی پیکر نہیں تیار کیا ہوگا جس کا نمونہ ان کی ذات میں موجود تھا، دنیا کے اگر تمام ادیب جمع ہو کر انسانیت کا کوئی بلند ترین نمونہ پیش کرنے کی کوشش کریں، تو ان کا تخیل اس بلندی تک نہیں پہنچ سکتا، جہاں واقعاتی زندگی میں وہ لوگ موجود تھے، جو آغوش نبوت کے پروردہ اور تربیت یافتہ تھے، اور جو درس گاہ محمد ﷺ سے فارغ ہو کر نکلے تھے، ان کا قوی ایمان، ان کا عمیق علم، ان کا خیر پسند دل، ان کی ہر تکلف اور ریا و نفاق سے پاک زندگی، انانیت سے ان کی دوری، ان کا خوف خدا، ان کی عفت و پاکیزگی اور انسان نوازی، ان کے احساسات کی نزاکت و لطافت، ان کی مردانگی و شجاعت، ان کا ذوق عبادت اور شوق شہادت، ان کی دن کی شہسواری اور راتوں کی عبادت گذاری، متاع دنیا اور آرائش زندگی سے بے نیازی، ان کی عدل گستری، رعایا پروری اور راتوں کی خبر گیری اور اپنی راحت پر ان کی راحت کو ترجیح، ایسی چیزیں ہیں کہ اگلی امتوں اور تاریخ میں ان کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔“ (۱)

اوپر کے اقتباس میں عقیدہ رسالت محمدی ﷺ سے متعلق دواہم باتیں بڑے حکیمانہ انداز سے آگئی ہیں، ایک عقیدہ ختم نبوت، دوسرے عقیدہ عظمت صحابہ، جو سب کے سب دامن رسالت کے پھول اور آپ ﷺ کے پروردہ و فیض یافتہ تھے۔

بعد کے دو خطبوں میں حضرت مولانا نے ختم نبوت ہی کو موضوع بنایا ہے، ان دو خطبوں میں حضرت مولانا نے صریح آیات و احادیث سے عقیدہ ختم نبوت کو پیش کیا ہے، صحابہ کرام اور ملت اسلامیہ کا حضرت محمد ﷺ کے خاتم النبیین ہونے پر اجماع اور ان کے بعد

دعویٰ نبوت پر ان کی نفرت کا ذکر کیا ہے، اور عقلی طور پر بھی اس کی ضرورت کو ثابت کیا ہے۔ مولانا نے ”ختم نبوت“ کو ملت اسلامیہ کے لیے اللہ کی رحمت اور احسان و عنایت قرار دیا ہے، اس کو فکری انارکی سے نجات کا ضامن بتایا ہے اور فرمایا ہے :

”اس عقیدہ نے جہاں انسان میں اپنے سن بلوغ کو پہنچنے کا احساس و شعور پیدا کیا، وہیں اس نے اسے تمدن کی دوڑ میں آگے بڑھنے اور روزمرہ کی زندگی میں علم و تجربہ پر اعتماد کرنا بھی سکھایا، اس لیے کہ آج دنیا کو اس کی فرصت و ضرورت نہیں کہ اب وہ پھر کسی نئی آسانی و جی کے لیے آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھتی رہے۔“ (۱)

مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ ”محمد ﷺ کی سیرت و حیات میں قیامت تک کے انسانوں کے لیے قابل تقلید نمونہ واسوہ ہے، اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کے غیبی انتظامات فرمائے اور آپ ﷺ کی تیس سالہ زندگی کا ایک ایک لمحہ احادیث و شمائل کی کتابوں میں محفوظ ہے۔“

اخیر میں حضرت مولانا نے لکھا ہے کہ:

”تاریخ اسلام اور مسلمان، مدعیان نبوت کے فتنہ سے زیادہ کسی بڑے اور نازک فتنہ سے دوچار نہیں ہوئے، لیکن اکثر ایسے مدعیوں کو کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں ہوئی، وہ حباب کی طرح اٹھے اور بیٹھ گئے، لیکن برصغیر ہند میں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں دعویٰ نبوت کرنے والے مرزا غلام احمد قادیانی کا معاملہ بعض سیاسی وجوہ سے مختلف ہے۔“ (۲)

رد قادیانیت

عقیدہ رسالت کا ایک اہم جزء ”عقیدہ ختم نبوت“ بھی ہے، اگر کوئی شخص حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو آخری نبی نہیں مانتا تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ امت کو متعدد مدعیان

نبوت سے سابقہ پڑا مگر سب نامراد ہوئے، اخیر دور میں غلام احمد قادیانی نے جو سیاست اختیار کی اور اس کو حکومتوں کی پشت پناہی حاصل ہوئی، اس کے نتیجے میں یہ فرقہ باقاعدہ وجود میں آ گیا اور اس نے ایک مشن کی طرح اپنے کام کو آگے بڑھانے کی کوشش کی، بہت سے ناواقف سادہ لوح لوگ دھوکے میں آ گئے اور بڑی تعداد دلالت کا شکار ہوئی۔

مرزا نے سب سے پہلے مجدد ہونے کا دعویٰ کیا، پھر اپنے آپ کو مسیح موعود بتایا اور آخر میں باقاعدہ نبوت کا دعویٰ کر دیا اور اس کو مستقل ایک فلسفہ بنا کر پیش کیا۔

ہر دور میں علماء نے اس کی سرکوبی کی، اس کی حقیقت سے پردہ اٹھایا، اس کے ناپاک عزائم کو صاف صاف بیان کر دیا، علمی انداز میں بھی اس کا تعاقب کیا اور اس کے فتنے سے لوگوں کو آگاہ کیا۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا اصل موضوع مثبت انداز میں دین حق کی مکمل اور متوازن ترجمانی ہے، لیکن جب جب ضرورت پڑی تو انہوں نے فتنوں کا مقابلہ بڑی قوت کے ساتھ کیا اور قادیانی پوزیشن اختیار کی۔

خارجی فتنوں میں مغربی تہذیب کا فتنہ بڑی شد و مد کے ساتھ اٹھا تھا، حضرت مولانا نے کس طرح اس کی سرکوبی کی، اس کا تفصیل سے پہلے باب میں تذکرہ ہو چکا ہے۔

داخلی فتنوں میں قادیانیت کا فتنہ بڑا سخت تھا، اس لیے کہ اس کو حکومتوں کی پشت پناہی حاصل تھی، خاص طور پر حکومت برطانیہ اس کی سرپرستی کر رہی تھی، یہ اسلام کے بنیادی عقیدہ اور اصول پر ایک ڈاکہ تھا جس کو حضرت مولانا نے اسلام اور نبوت محمدی ﷺ کے خلاف ایک بغاوت قرار دیا ہے، جس کا اصل مقصد ہی امت میں انتشار پیدا کرنا اور اس کو مختلف فرقوں میں بانٹنا تھا۔

حضرت مولانا کے شیخ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری کا وطن پنجاب تھا اور یہ فتنہ بھی پنجاب ہی سے اٹھا تھا، اس لیے حضرت شاہ صاحب کو اس کی بڑی فکر تھی، شاہ صاحب کے متعدد خلفاء و متوسلین نے اس کی سرکوبی کے لیے جدوجہد کی، جن میں نمایاں نام مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ کے ہیں۔

۵۸-۱۹۵۷ء میں پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام ”مجلس مذاکرات اسلامی“ کا

انعقاد ہوا جس میں عرب ملکوں میں ممتاز اہل علم و اہل فکر شریک ہوئے، قادیانیت کا فتنہ پنجاب ہی کی سرزمین سے اٹھا تھا، اس لیے انہوں نے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہی، اس وقت علماء کو احساس ہوا کہ عربی میں جدید طرز پر ایسی کوئی کتاب نہیں ہے جو ان کو مطمئن کر سکے۔ حضرت رائے پوری کو معلوم ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ ”علی میاں آئیں گے تو میں ان سے کتاب لکھواؤں گا“ حضرت مولانا کو خود بھی اس ضرورت کا احساس تھا، حضرت رائے پوری کے ارشاد پر حضرت مولانا نے وہیں لاہور میں قیام فرمایا اور ایک ماہ کے اندر اندر پورے قادیانی لٹریچر کا جائزہ لے کر کتاب تیار کر دی۔

اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ پہلے مرحلہ پر اگر کوئی قادیانی بھی یہ کتاب اٹھائے گا تو فوراً اس کو بند نہیں کر دے گا بلکہ وہ بھی کچھ سوچنے پر مجبور ہوگا۔ حضرت مولانا نے اس کتاب میں خالص معروضی انداز اختیار کیا ہے، اور خود قادیانی لٹریچر سے اقتباسات منتخب کر کے اس انداز سے پیش کر دیئے ہیں کہ اس کی حقیقت واضح ہوگئی ہے۔

کتاب کے اسلوب کے بارے میں حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں :

”اس کتاب میں مناظرانہ جوش کے بجائے مورخانہ متانت زیادہ ملے گی، اور جو لوگ مناظرانہ و فریقانہ کتابوں کے ایک خاص طرز اور لہجہ کے عادی ہیں، شاید ان کو اس کتاب کو پڑھ کر مایوسی ہو، لیکن مصنف اس کی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا، اس نے یہ کتاب جس طبقہ اور جس مقصد کے لیے لکھی ہے اور جو معیار اس کے لیے مقرر کیا ہے، اس کے لیے یہی طرز مناسب تھا۔“ (۱)

کامیاب مناظر وہ سمجھا جاتا ہے جو خود غصہ میں نہ آئے اور اپنے فریق کو طیش میں لے آئے۔ حضرت مولانا نے یہ طرز نہیں اختیار فرمایا بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ فریق مخالف غور کرنے پر آمادہ ہو، حق کی طرف اس کی طبیعت مائل ہو، اور جن باطل عقائد میں وہ گرفتار ہے ان کی حقیقت خود اس کے سامنے آجائے۔

کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا اپنے مقصد میں کس درجہ

کامیاب ہیں۔ انہوں نے شروع سے اخیر تک جس طرح تدریجاً اس کا جائزہ لیا ہے اس سے اس کے دعووں کی حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ کس طرح اس نے مشورہ سے ”مہدویت“ کا دعویٰ کیا اور پھر جب زمین خود اس کے خیال میں ہموار ہو گئی تو ”نبوت“ کا اعلان کیا۔ اس کا مقصد کیا تھا اس کو مولانا نے خود اس کی تحریروں سے صاف کر دیا ہے، حکومت برطانیہ اور انگریزوں کے بارے میں اس کے خیالات حضرت مولانا نے واضح کر دیئے ہیں، خود اس نے اپنے آپ کو ”گورنمنٹ عالیہ“ کا خود ساختہ پودا ”خیر خواہ و خدمت گزار“ لکھا ہے۔

پادریوں سے مناظروں میں جوش کی وجہ خود اس نے لکھی ہے کہ مسلمانوں میں ان کے خلاف اشتعال کم ہوا اور بد امنی پیدا نہ ہو سکے، تاکہ حکومت برطانیہ کو کوئی دشواری نہ پیش آئے، اسی لیے اس نے جابجا جہاد کی حرمت کا اعلان کیا ہے۔ ایک مکتوب میں خود وہ لکھتا ہے کہ ”میرے جتنے متبعین ہیں میں نے ان میں جہاد کی روح ختم کر دی ہے۔“

حضرت مولانا نے خود ان کی کتابوں سے مرزا کے کھلے ہوئے دسیوں جھوٹ دکھائے ہیں، اور اس کے گھر میں عیش و طرب کے واقعات ان ہی کی کتابوں سے نقل کیے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ پوری کتاب پڑھ کر ان کی تصویر خود ان ہی کے آئینہ میں اس طرح سراپا ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ پھر اس پر مزید تبصرہ کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں باقی رہ جاتی۔

حضرت مولانا سیاسی پشت پناہی اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر اس فتنہ کے خطرہ کو محسوس فرماتے تھے، اس کتاب (۱) کے علاوہ بھی حضرت مولانا نے متعدد رسائل اس موضوع پر لکھے، تقریریں فرمائیں، اور لوگوں کو اس کے خطرہ سے آگاہ فرمایا۔

رد شیعیت

شیعیت کے بارے میں بھی حضرت مولانا نے صاف صاف تحریر فرمایا ہے کہ اس سے عقیدہ رسالت پر زد پڑتی ہے، اور عقیدہ ختم نبوت باقی نہیں رہتا، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ”فرقہ کامیہ اثنا عشریہ“ کے یہاں امامت کا عقیدہ اور امام کی تعریف اور خصائص ختم نبوت

(۱) کتاب اصلا عربی میں لکھی گئی، پھر حضرت مولانا ہی نے اس کا اردو میں ترجمہ فرمایا۔

کے معنای اور ”مشارکت فی البوۃ“ کے مرادف ہیں۔

دوسری طرف صحابہ کرام کے بارے میں ان کا یہ عقیدہ ہے کہ تین چار کے سوا (معاذ اللہ) وہ سب مرتد ہو گئے تھے، صحابہ جن کے تقدس اور عظمت پر امت متفق ہے، ان کے بارے میں شیعوں نے وہ تصور پیش کیا ہے اور ان کی ایسی خود ساختہ تصویر پیش کی ہے جس سے خود اسلام اور رسول اکرم ﷺ پر الزام آتا ہے کہ تیس سال کی مدت تک رسول اللہ ﷺ تربیت فرماتے رہے، ان کے نقوش و اثرات اتنے مبہم اور مدہم تھے کہ لمحوں میں سب مٹ کر رہ گئے، خود اسلام کی تعلیمات میں کوئی کشش نہ تھی جو اپنی جماعت کو اسلام پر باقی رکھتی۔ واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کے بارے میں خود یہ عقیدہ یا تصور کہ معاذ اللہ وہ دین سے پھر گئے تھے اسلام پر سے اعتماد کو ختم کرنا ہے، اور عقیدہ رسالت کو بھی متاثر کرنا ہے۔

حضرت مولانا نے مستقل اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، عقائد اہل سنت اور عقائد فرقہ انشاء شریہ کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے، اور ”دین اسلام اور اولین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں“ اس طرح دکھادی ہیں کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا ہے، جس سے اہل ضلال کی افتراء پرداز یوں اور دروغ گوئیوں کا پردہ فاش ہو جاتا ہے۔

حضرت مولانا نے کتاب کے آغاز ہی میں ثابت کیا ہے کہ عالمگیر اور دائمی دین کے لیے جو اصلاح انسانیت اور انقلاب عالم کا علمبردار ہو چار بنیادی شرطیں ہیں :

۱- اس دین کے داعی اول اور پیغمبر کی تعلیم و تربیت اور صحبت میں عربی و رواجی طریقوں اور وسائل کو اختیار کیے بغیر ایسی تاثیر، انقلاب انگیزی اور قلب ماہیت کی طاقت اور ایسی آدم گری و مردم سازی کی شان ہو کہ اس کے سامنے ”پارس“ اور ”کیمیا“ کی اعجوبہ گری کا ذکر اس شان تاثیر کی توہین اور تاریخی حقائق سے ناواقفیت کی دلیل ہو۔ (۱)

۲- خاندانی سلطنت کے قیام و عروج کے بارے میں پیغمبر کا بائیان سلطنت اور دنیا قائدین اور رہنماؤں سے کھلا امتیاز ظاہر ہو۔ (۲)

۳- پیغمبر کا لایا ہوا آسمانی صحیفہ محفوظ، قابل فہم اور عام دسترس میں ہو۔ (۳)

(۱) دین اسلام اور اولین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں صفحہ ۱۳-۱۴

(۲) دو متضاد تصویریں صفحہ ۱۶ (۳) ایضاً صفحہ ۱۸

۴- نبی کی ذات ہی واحد مرکز ہدایت اور تہا شارع و مطاع ہو۔ (۱)
 اس کے بعد حضرت مولانا نے ان چاروں صفات کے بارے میں معتبر تاریخ کی روشنی میں اور مسلم و غیر مسلم فضلاء، مفکرین و مؤرخین کی شہادتوں اور واقعات کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ کس طرح ان کا انطباق اسلام پر اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی پر ہوتا ہے۔

حضور ﷺ نے صحابہ کی تربیت کس انداز سے کی اور وہ کہاں پہنچ گئے! حضرت مولانا کے قلم معجز رقم سے اس کی تصویر ملا خطہ ہو جس کا عنوان ہی مولانا نے ”انسانی عالمی مرقع کی سب سے حسین تصویر“ رکھا ہے، مولانا فرماتے ہیں :

”آپ کے تیار کئے ہوئے افراد میں سے ایک ایک نبوت کا شاہکار ہے، اور نوع انسانی کے لیے باعث شرف و افتخار ہے، انسانیت کے مرقع میں بلکہ اس پوری کائنات میں پیغمبروں کو چھوڑ کر اس سے زیادہ حسین و جمیل، اس سے زیادہ دلکش و دل آویز تصویر نہیں ملتی جو ان کی زندگی میں نظر آتی ہے، ان کا پختہ یقین، ان کا گہرا علم، ان کا سچا دل، ان کی بے تکلف زندگی، ان کی بے نفسی، خدا ترسی، ان کی پاکبازی، پاکیزگی، ان کی شفقت و رأفت، اور ان کی شجاعت و جلالت، ان کا ذوق عبادت اور شوق شہادت، ان کی شہسواری اور ان کی شب زندہ داری، ان کی سیم وز سے بے پروائی اور ان کی دنیا سے بے رغبتی، ان کا عدل، ان کا حسن انتظام دنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ نبوت کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے جو انسانی افراد تیار کئے ان میں ایک ایک فرد ایسا تھا جو اگر تاریخ کی متواتر شہادتیں نہ ہوتیں تو ایک شاعرانہ تخیل اور ایک فرضی افسانہ معلوم ہوتا، لیکن اب وہ ایک تاریخی حقیقت اور ایک مسلم الثبوت واقعہ ہے جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔“ (۲)

اس کے بعد حضرت مولانا نے اسلامی و غیر اسلامی مؤرخین کی شہادتیں اس سلسلہ میں پیش کی ہیں۔ اخیر میں صحابہ کرام کے بارے میں فرقہ آئنا عشریہ کے عقائد و خیالات واضح

کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”ان کے نزدیک محمد رسول اللہ ﷺ کی تین سو سالہ کوششوں کا نتیجہ صرف تین ہستیاں (اور بعض روایات کے مطابق چار تھیں) جو آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی اسلام پر قائم رہیں، باقی سب نے (معاذ اللہ) آپ کی آنکھ بند ہوتے ہی اسلام سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا اور آپ کی صحبت و تربیت کو دنیا کے سامنے ناکام ثابت کیا۔“ (۱)

اسی ذیل میں حضرت مولانا نے امام شعی کا یہ نکتہ نقل فرمایا ہے کہ:

”یہود و نصاریٰ، اہل تشیع کے مقابلہ میں اپنے پیغمبر کے زیادہ مرتبہ شناس اور قدرداں ہیں، یہودیوں سے پوچھا گیا، تمہاری ملت میں سب سے بہتر کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا حضرت موسیٰ کے ساتھی، ان کے اصحاب عیسائیوں سے پوچھا گیا تمہاری ملت میں سب سے بہتر کون ہیں؟ انہوں نے کہا عیسیٰ کے حواری۔ شیعہ صاحبان سے پوچھا گیا تمہاری ملت میں سب سے بدتر کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا اصحاب نبی ﷺ۔“ (۲)

عالمگیر اور دائی دین کی دوسری صفت حضرت مولانا نے بیان فرمائی تھی کہ اس دین کے داعی اور حامل رسالت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا مقصود عام قائدین کی طرح رابطہ عوام کے ذریعہ خاندانی سلطنت کا قیام اور موروثی حکومت کی تاسیس نہ ہو۔ حضرت مولانا نے واقعات سیرت سے اس کے بیسیوں شواہد پیش کیے ہیں اور دکھایا ہے کہ آنحضرت ﷺ انعام و اکرام کے موقع پر اہل قرابت کو پیچھے رکھتے اور خطرات میں آگے۔ یہ نبوی مزاج اس جملہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے جس میں فرمایا گیا ”إنا معشر الانبیاء لا نورث، ماتر کنا صدقہ“ (۳) (ہم گروہ انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا، ہم جو کچھ چھوڑ کر جائیں وہ صدقہ) اور عام مسلمانوں کا حصہ ہے) (۴)

(۱) دو مقنا و تصویریں صفحہ ۵۶

(۲) دو مقنا و تصویریں صفحہ ۶۲ بحوالہ منہاج السنہ اول صفحہ ۶

(۳) صحیح بخاری، سنن أبی داؤد

اس کے بالکل برخلاف فرقہ اثناعشریہ کا عقیدہ یہ ہے کہ خلافت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا حق تھا اور آپ ﷺ نے ان کے لیے وصیت فرمائی تھی، (معاذ اللہ) حضرت ابو بکرؓ اور دوسرے صحابہ نے اس کو دیا اور حضرت علیؓ نے تقیہ کر لیا اور اس پر خاموش ہو گئے۔

حضرت مولانا نے تیسری چیز یہ بیان فرمائی تھی کہ اس دین کی کتاب سماوی محفوظ رہے، اس میں تحریف نہ ہو، پھر اس میں عمومیت ہو، عام فہم اور انسانی دسترس میں ہو، قرآن مجید کی اس صفت پر خود قرآن مجید گواہ ہے، اور دوست دشمن سب اس کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں، لیکن فرقہ اثناعشریہ کا کہنا یہ ہے کہ دو تہائی حصہ غائب ہے اور اس میں تحریفات کر دی گئی ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کی نعمت سے محروم کر دیے گئے، نہ ان میں حفاظ ملیں گے اور نہ ہی قرآن مجید سے اشتغال رکھنے والے، حضرت مولانا نے اس سلسلہ کے بعض واقعات بھی نقل کیے ہیں۔

”نبوت دائمی“ اور ”امت خالدہ“ کی چوتھی شرط حضرت مولانا نے یہ قرار دی تھی کہ نبی ہی کی ذات مرکز ہدایت اور امت کی قلبی وابستگی اور دینی سپردگی کا محور ہو، اور اسی کو ”دائے سب، ختم الرسل اور مولائے کل“ سمجھا جائے۔ اس کے بالکل برخلاف فرقہ اثناعشریہ نے امامت کے بارے میں وہ تصور قائم کیا جس سے عقیدہ ختم نبوت پر ضرب آتی ہے، اور صرف نبی ہی کی ذات تنہا ”واجب الطاعت“ نہیں رہ جاتی بلکہ ائمہ بھی اس میں شریک ہو جاتے ہیں، اور ”مشارکت فی النبوة“ کا عقیدہ سامنے آتا ہے، ان کے نزدیک ائمہ بھی نبی کی طرح معصوم اور مفترض الطاعت ہوتے ہیں، ان کا درجہ رسول اللہ ﷺ کے برابر اور سب نبیوں سے بلند ہوتا ہے، وہ جو چیز چاہیں حلال کریں اور جو چاہیں حرام کریں، موت ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے، بندوں کے اعمال دن و رات ان پر پیش ہوتے ہیں، ائمہ کے بارے میں ان کے عقائد ایسے ہیں جو مشارکت فی النبوة تک ہی نہیں رہتے بلکہ ”شُرک فی الالوہیت“ تک پہنچ جاتے ہیں۔ حضرت مولانا نے ان کے یہ عقائد خود ان کی کتابوں سے نقل فرمائے ہیں، ایرانی انقلاب کے قائد آیت اللہ خمینی جن کو بعض حلقوں میں بڑا متوسخ الخیال سمجھا جاتا ہے، خود ان کی کتابوں میں بھی ائمہ کے بارے میں یہی عقائد موجود ہیں۔

حضرت مولانا آگے تحریر فرماتے ہیں :

”ائمہ اہل بیت کے بارے میں ایسے غالباً نہ عقائد و بیانات کے ساتھ جو ان کو مافوق البشر ہستی ثابت کرتے ہیں، اور بعض حیثیتوں سے ان میں بعض صفات الوہیت پیدا کر دیتے ہیں، کتب شیعہ میں ان کی ایسی تصویر پیش کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ (خاکم بدہن، مع حضرت علیؑ شیر خدا کے) شجاعت کے جوہر اور اعلان حق کی جرأت سے محروم، خطرات و مخاوف سے لرزاں و ترساں، مسلسل طریقہ پر حق پوشی، مصلحت اندیشی سے کام لینے والے، تقیہ کو نہ صرف ایک وقتی ضرورت اور حفاظت خود اختیاری کا ہتھیار سمجھنے والے بلکہ اس کو عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ جاننے والے اور اس سے بضرورت و بلا ضرورت کام لینے والے، امت محمدی ﷺ کو (تھوڑا سا خطرہ مول لے کر) اصل تعلیمات نبوی کے علم سے دور اور اپنے کو تھوڑے سے خطرہ میں ڈال کر دین کو عزت و غلبہ سے محروم رکھنے والے ہیں، ان کتب مناقب و فضائل سے ان ائمہ والاشراف کی (أعاذہم اللہ) جو تصویر سامنے آتی ہے وہ فری مین (Freemason) جمعیۃ اخوان الصفا اور مختلف ملکوں کے خفیہ اور زیر زمین (Underground) تنظیموں سے قطعاً مختلف نہیں۔“ (۱)

اس کے بعد حضرت مولانا نے تاریخی حقائق کی روشنی میں حضرات اہل بیت کی صحیح تصویر پیش کی ہے، اور ان کی دینی حمیت و غیرت و استغناء اور خودداری، پاکیزہ نفسی، تقویٰ اور احتیاط کا تذکرہ فرمایا ہے، اور اس کے واقعات نقل فرمائے ہیں۔

حضرت مولانا نے اس کتاب میں عام مناظرانہ اسلوب سے ہٹ کر ایسا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے، جس کو پڑھ کر خود بخود حق اور باطل کا فرق سمجھ میں آتا جاتا ہے، اور شیعوں کے باطل عقائد و نظریات سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور عقائد اہل سنت پورے توازن کے ساتھ سامنے آتے جاتے ہیں۔

عقیدہ کی اہمیت اور ایک اہم اصول

کتاب کے آخر میں حضرت مولانا نے اصولی طور پر عقیدہ کی اہمیت بیان فرمائی ہے، اور اس سے صرف نظر کرنے کے خطرناک نتائج کا تذکرہ کیا ہے، اور دو باتوں کی طرف خاص طور پر متوجہ کیا ہے، اور مسلمانوں کے ایک طبقہ میں اس سلسلہ میں جو تباہی پیدا ہو گیا ہے اس کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہ ایک نہایت اہم مضمون ہے، اس لیے اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

”۱۔ بہت سے حلقوں میں مدح و ذم اور تعریف و تنقید کا معیار کتاب و سنت، اسوہ سلف اور عقائد اور مسلک کی صحت نہیں رہا، بلکہ اسلام کے نام پر مطلق حکومت کا قیام، طاقت کا حصول، کسی مغربی طاقت کو لکا کر دینا، اس کے لیے مشکلات پیدا کر دینا اس کو محبوب و مثالی قائد بنادینے کے لیے کافی ہے۔

۲۔ عقیدہ کی اہمیت ہمارے نئی تعلیم یافتہ نسل میں خطرناک حد تک کم ہوتی جا رہی ہے، اور یہ بڑی تشویش انگیز اور قابلِ فکر بات ہے، انبیاء اور غیر انبیاء کی دعوتوں میں ان کی جدوجہد کے مقاصد اور محرکات میں سب سے بڑی حد فاصل یہی عقیدہ ہے جس پر وہ کسی سمجھوتہ اور اونے پونے سودا کر لینے کے لیے تیار نہیں ہوتے، ان کے یہاں رد و قبول، پسندیدگی و ناپسندیدگی کا معیار اور وصل و فصل کی شرط ہی عقیدہ ہوتا ہے، یہ دین (جو مسلمانوں کی ساری کمزوریوں کے باوجود) اپنی اصلی شکل پر اس وقت تک موجود ہے، وہ اسی ”عقیدہ“ کے معاملہ میں صلابت و استقامت اور حمیت و غیرت کا رہنما ہے، دین کے شارحین و محافظین نے اس سلسلہ میں کسی باجبروت طاقت اور کسی وسیع سے وسیع تر بادشاہی کے سامنے سپر نہیں ڈالی اور اس کے کسی غلط عقیدہ اور دعوے پر سکوت جائز نہیں سمجھا، چہ جائیکہ اس کو اسلام اور مسلمانوں کے دنیاوی منافع اور اختلاف و تفریق سے بچنے کی لالچ میں قبول کر لیتے یا ہموائی کرتے۔ امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ) کا ”خلق قرآن“ کے عقیدہ میں نہ صرف مسلمانوں کے دو سب سے بڑے حکمرانوں بلکہ اس دور کے

سب سے بڑے فرماں رواؤں خلیفہ مامون الرشید (فرزند خلیفہ ہارون رشید) اور معتصم بن ہارون رشید کے مقابلہ میں صف آرا ہو جانا اور تازیانوں اور زنداں کی تکلیف برداشت کرنا۔ حضرت مجدد الف ثانی، شیخ احمد فاروقی، (م ۱۰۳۴ھ) کا شہنشاہ اکبر کے عقیدہ ہزارہ دوم، دعوائے امامت واجتہاد، اور وحدت ادیان کی مخالفت کرنا، پھر جہانگیر کے عہد تک اس کو اس وقت تک جاری رکھنا جب تک کہ حکومت مغلیہ کا رخ بدل نہیں گیا، اس کی دو مثالیں ہیں، ورنہ تاریخ اسلام اپنے اندر ”کلمۃ حق عند سلطان جائن“ اور ”لا طاعة لمخلوق فی معصیۃ الخالق“ کی تابناک مثالیں رکھتی ہے، یہ سلطان جائز کبھی شخصی بادشاہ ہوتا ہے، کبھی رائے عامہ، کبھی شہرت عام، کبھی دل فریب کامیابیاں اور بلند بانگ دعاوی، اور تاریخ و تجربہ شاہد ہے کہ آخر الذکر صورتیں زیادہ آزمائش کی چیزیں ہیں۔

حقیقت میں اسلام کی حقیقی تعلیم اور صحیح عقیدہ وہ دریا ہے جو کبھی اپنا رخ نہیں بدلتا، اور کبھی پایاب نہیں ہو سکتا، سیاسی طاقتیں، وقتی انقلابات، حکومتوں کا قیام و زوال اور دعوتیں اور تحریکیں موجیں ہیں جو آتی اور گزر جاتی ہیں، دریا اگر صحیح رخ پر بہہ رہا ہے اور آب جاری ہے تو کوئی خطرہ نہیں، لیکن اگر عقیدہ میں فساد آگیا تو گویا دریائے اپنا رخ بدل دیا، یا اس میں آب صافی کے بجائے گندلا اور ناصاف پانی بہنے لگا، اس لیے فساد عقیدہ اور زلیغ و ضلال کے ساتھ کوئی دعوت و تحریک، کسی ملک کا عروج و اقبال، کسی معاشرہ کی جزئی اصلاح یا کسی فساد و خرابی کو دور کرنے کا دعویٰ یا وعدہ قبول نہیں کیا جاسکتا، یہ وہ حقیقت ہے جس میں اس ملت کی بقاء اور دین کی حفاظت کا راز مضمر ہے، اور یہی وہ حقیقت ہے جو اپنے دور کے علماء و خادمین اور محافظین شریعت و سنت کو اس دشوار اور بعض اوقات ناخوشگوار فرض کو ادا کرنے پر مجبور کرتی رہی ہے۔“ (۱)

عقیدہ آخرت

اسلام کے تین بنیادی عقیدوں میں تیسرا عقیدہ ”آخرت“ کا ہے یعنی اس چیز کا یقین کہ دنیا میں انسان جو عمل کرتا ہے مرنے کے بعد اس کے بارے میں پوچھا جائے گا، اور جیسا عمل ہوگا اس کے مطابق جزا یا سزا کا فیصلہ ہوگا، انسان کی اصلاح کے لیے ایمان بالآخرت سب سے طاقتور چیز ہے، یہ وہ علم ہے جو صرف حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے حاصل ہو سکتا ہے، اللہ کی ذات و صفات کے بعد یہی وہ دوسرا علم ہے جو انبیاء دنیا کو عطا کرتے ہیں۔

اپنی تقریروں میں حضرت مولانا نے جا بجا آخرت کو مختصر رکھنے پر زور دیا ہے اور اس کو قوت عمل کی کنجی قرار دیا ہے، اس کے علاوہ مستقل ایک مقالہ بھی اسی موضوع پر سپرد قلم فرمایا جو حضرت مولانا کی تازہ کتاب ”اسلام کے تین بنیادی عقائد“ کا آخری باب ہے۔

اس باب میں حضرت مولانا نے سب سے پہلے یہی حقیقت بیان فرمائی ہے کہ اس علم کا سرچشمہ وحی الہی ہے، جو حضرات انبیاء علیہم السلام کے واسطے سے لوگوں کے لیے مشعل راہ ہے۔

اس کے سوا علم آخرت کے حصول کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے، انسان کے پاس جتنی بھی طاقتیں ہیں، ان سے نہ یہ علم ابتداءً حاصل کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کی تردید کی جاسکتی ہے، اس لیے یہ سب معلومات غیب سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے بعد حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں :

”انسان کے لیے دو ہی باتیں باقی رہ جاتی ہیں یا انبیاء پر اعتماد کر کے

اور ان کے دعویٰ کی صداقت کے شواہد و قرائن کو دیکھ کر ان کے بیان کی

تصدیق یا بغیر کسی علمی ثبوت اور دلیل کے اس کا انکار۔“ (۱)

اس کے بعد حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ ”انکار کی کیا وجہ ہو سکتی ہے جب کہ اس کے شواہد موجود ہیں؟“ خود انسان کی زندگی کے بارے میں فرماتے ہیں :

”اس کا ایک بڑا قرینہ اور اس کا ایک شاہد خود انسان کی پیدائش اور

اس کی زندگی ہے، اس نے عدم سے وجود تک، پھر وجود کے بعد تکمیل وجود

تک کتنے منازل طے کیے ہیں، اس نے منی سے نطفے، نطفے سے جے ہوئے خون کی یا جو تک کی شکل اختیار کی، پھر ایک مشکل یا غیر مشکل گوشت کا ٹکڑا بنا، پھر ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا، پھر اس کو گوشت کا جامہ پہنایا گیا، پھر وہ ایک دوسری مخلوق بن کر نمودار ہوا، پھر اس پیٹ کی اندھیری کوٹھری سے نکلنے کے بعد وہ کچھ مدت تک طفولیت کے گہوارہ میں رہا، پھر جوانی کے سرسبز میدان میں قدم رکھا، پھر یا تو اس کا دوسرا قدم موت کی چوکھٹ پر پڑا یا اس کو اتنی مہلت ملی کہ زندگی کی اس بہار کو دیکھ کر اس نے بڑھاپے کی فصل خزاں بھی دیکھی اور زندگی کا الٹا سفر شروع کیا، یعنی جوانی کے بعد بڑھاپے میں پھر اس پر بچپنے کی کیفیتیں طاری ہونے لگیں، اس کی قوتوں نے ایک ایک کر کے جواب دیا، ذہن اور حافظہ نے ساتھ چھوڑا، وہ بچہ کی طرح بے بس، دوسروں کی دست گیری اور خبر گیری کا محتاج ہوا، اس پر خود فراموشی طاری رہنے لگی، اس کے لیے ہر جانی پہچانی چیز انجانی ہو گئی۔

اس منزل پر سفر کا ایک حصہ ختم ہو گیا، لیکن اس کا سفر ختم نہیں ہوا، صرف سفر کی ایک درمیانی منزل پیش آئی جس کا نام موت اور عالم برزخ ہے۔

موت ایک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

پس جس کو انسان کی اصل و حقیقت (مٹی اور پانی) اور پھر اس کا آغاز اور اس کی خلقت معلوم ہے، اس کے نزدیک مرکز زندہ ہونے میں کون سا عقلی اشکال ہے اور جس نے انسان میں اتنے انقلابات کا مشاہدہ کیا اس کے لیے آخری انقلاب کو ممکن ماننے میں کیا دشواری ہے؟! (۱)

دوسرے نمونہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”زندگی بعد موت کا دوسرا کھلا ہوا نمونہ زمین کی دوبارہ زندگی کے مناظر ہیں جو بار بار آنکھوں کے سامنے آتے رہتے ہیں، یہ زمین جس کے

سینہ میں ہزاروں پیدا ہونے والے انسان اور زندہ ہونے والے حیوانات کی زندگی کی امانتیں اور خزانے ہیں، وہ خود مردہ پڑی ہوتی ہے، اس کے ہونٹوں پر سوکھ کپڑیاں جم جاتی ہیں، وہ مٹی کا ایک بے حس و بے جان لاشہ ہوتا ہے جس میں نہ خود زندگی ہوتی ہے اور نہ کسی اور چیز کے لیے زندگی کا سامان، لیکن جب اس کے ہونٹوں پر آسمانی آب حیات کے قطرے گرتے ہیں اور اس کا حلق تر کرتے ہوئے سینہ تک پہنچ جاتے ہیں تو وہی زمین، موت کی نیند سے دفعہٴ بیدار ہو جاتی ہے، اس میں زندگی کی توانائی اور جوانی کی رعنائی دوڑ جاتی ہے، وہ گویا جھومتی اور مست ہوتی ہے، اس کا دہانہ دلتوں، شادابیوں اور زندگی کا خزانہ اگل دیتا ہے، مہکتا ہوا سبزہ، لہلہاتی ہوئی کھیتی، اور سطح زمین پر ابھرے ہوئے اور پھیل جانے والے کیڑے اور حشرات زمین کی اندرونی زندگی اور حیات بخشی کا پتہ دیتے ہیں، برسات اور بہار کے موسم میں زمین کی اس زندگی کا منظر کس نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا؟ (۱)

ان دو شواہد کے علاوہ دوسری نشانیوں کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :

”ان دو نشانیوں اور کھلے ہوئے دو نمونوں کے علاوہ کائنات کی یہ عظیم وسیع کارگاہ زندگی بعد موت کے نمونے اور منظر دن رات پیش کرتی رہتی ہے، یہاں دم بدم بن بن کر چیزیں بگڑتی اور ٹوٹ کر بنتی رہتی ہیں، ایک بے جان و بے شعور چیز سے اچھی خاصی، جیتی جاگتی، ذی حیات ہستی اور ایک اچھی خاصی جاندار ہستی سے بالکل بے جان اور مردہ چیز برآمد ہوتی ہے، بہت سی اشیاء سے ان کے متضاد آثار و نتائج کا ظہور ہوتا ہے، بہت سی مخلوقات میں خلقت کا اعادہ اور زندگی کی بازگشت ہوتی رہتی ہے۔ جس نے خالق کائنات کی اس لا انتہا قدرت، مخلوقات کی ابتدائی خلقت اور تکوین و تخلیق کی وسعت کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہے اس کو ایک لمحہ کے لیے بھی حیات بعد الموت میں شک نہیں ہو سکتا اور اس کے لیے اس میں قطعاً کوئی عقلی

اشکال نہیں ہے۔“ (۱)

مزید فرماتے ہیں :

”اس عالم پر تفکر کی نظر ڈالنے اور اس مجموعہ کائنات کو بحیثیت مجموعی اور اس کے اجزاء کو فرداً فرداً موجد اور بامقصد پانے سے انسان کا اندرون اور اس کا وجدان سلیم خود شہادت دیتا ہے کہ اس عالم کے بعد ایک دوسرا عالم اور اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ہونی چاہیے جو اس عالم اور زندگی کا تتمہ ہو جس میں اس زندگی کے اعمال کے نتائج ظاہر ہوں، اگر یہ عالم اور زندگی نہیں تو انسان کی خلقت ایک فعل عبث اور یہ سارا کارخانہ بے مقصد اور

بے غایت ہے۔“ (۲)

حضرت مولانا نے پورے مضمون میں جگہ جگہ قرآن مجید کی آیات سے استدلال فرمایا ہے، اور قرآن کی مثالیں پیش کی ہیں، گویا پورا مضمون آیات قرآنیہ کی کھلی ہوئی تفسیر ہے۔ مضمون کے آخر میں حضرت مولانا نے ایمان بالآخرت کے خواص بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :

”ایمان بالآخرت بھی ایک ختم ہے جو اپنے ذاتی خواص رکھتا ہے، جب اس کا صحیح اور طبعی نشوونما ہو جاتا ہے تو پھر اخلاق و اعمال، سیرت و کردار، رفتار و گفتار کو کوئی چیز اس کے اثر سے خارج نہیں ہوتی۔ ایک معتقد آخرت اور منکر آخرت کی زندگی اور سیرت میں وہی فرق ہوتا ہے جو مختلف بیجوں سے پیدا ہونے والے درختوں کی شاخوں، پتوں اور پھولوں میں ہوتا ہے۔ معتقد آخرت کی نفسیت و مزاج، اس کی عقلیت، اس کے اخلاق سب منکر آخرت سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ دو بالکل مختلف سانچے ہیں جن سے دو بالکل مختلف قسم کی ذہنیتیں ڈھل کر نکلتی ہیں۔ ان دونوں میں اصولی اور مرکزی فرق یہ ہوتا ہے کہ معتقد آخرت عاجل کے مقابلہ میں آجل، نقد کے مقابلہ میں قرض، مسرت فانی کے مقابلہ میں راحت جاودانی کا طلب گار ہوتا ہے۔

(۱) تین بنیادی عقائد صفحہ: ۱۳۰

(۲) اسلام کے تین بنیادی عقائد صفحہ: ۱۳۳-۱۳۵

قرآن مجید نے اس اصولی فرق کو اپنی آیات میں بار بار واضح کیا ہے اور اہمیت کے ساتھ اس کو پیش کیا ہے۔“ (۱)

ایمان بالآخرت کے خواص پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا مزید تحریر فرماتے ہیں :

”ایک معتقد آخرت کی زندگی میں ذاتی سر بلندی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا، اس سے حکومت و اقتدار کی حالت میں بھی بندگی اور نیاز مندی کی خو نہیں جاتی بلکہ جس قدر اس کی گردن فراز ہوتی ہے اسی قدر اس کا سر نیاز جھکتا ہے۔“ (۲)

”وہ دنیا کی اس حکومت پر مطمئن اور قانع نہیں ہوتا، وہ جانتا ہے کہ اصل عزت آخرت کی عزت ہے اور اصل دولت خدا کی سچی غلامی کی دولت ہے۔ معتقد آخرت دنیا کی رسوائی کے مقابلہ میں آخرت اور میدان حشر کی رسوائی سے زیادہ ڈرتا ہے، اور اس کے تصور سے لرزاں رہتا ہے۔“ (۳)

”اسی کا نتیجہ ہے کہ آخرت کے اس ابدی عذاب اور حشر کی اس ذلت و رسوائی پر دنیا کی بڑی سے بڑی اذیت و تکلیف اور بڑی سے بڑی رسوائی و بدنامی کو ترجیح دیتا ہے۔“ (۴)

”نیز اس عقیدہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی جلوت اور خلوت میں یکساں طور پر پابند قانون، محتاط اور خدا پرست رہتا ہے، اور جہاں اس کو دیکھنے والا اور اس سے باز پرس کرنے والا کوئی نہیں ہوتا، وہاں بھی اس سے اخلاق و دیانت کے خلاف کوئی عمل صادر نہیں ہوتا۔“ (۵)

حضرت مولانا نے یہ ساری تفصیلات، آیات و احادیث اور حقائق و واقعات کی روشنی میں پیش کی ہیں، راقم نے ان کا لب لباب پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۲) ایضاً صفحہ: ۱۵۰

(۱) اسلام کے تین بنیادی عقائد صفحہ: ۱۳۶

(۳) اسلام کے تین بنیادی عقائد صفحہ: ۱۵۲

(۳) ایضاً صفحہ: ۱۵۱

(۵) اسلام کے تین بنیادی عقائد صفحہ: ۱۵۵

اصلاح معاشرہ

حضرت مولانا کی اصلاحیات میں اصلاح معاشرہ کو خاص اہمیت حاصل ہے، اپنی تقریروں میں، گفتگو میں، تحریروں میں مولانا ہمیشہ اس پر زور دیتے رہے ہیں، مولانا کا خیال یہ ہے کہ اسلامی نظام کے قیام کے لیے اس کی حیثیت بنیاد کی ہے، اگر معاشرہ درست نہ ہو تو کسی چیز کا کوئی اعتبار نہیں۔ مولانا نے معاشرہ کی مثال شاخ نشین سے دی ہے، شاخ اگر قائم ہے تو نشین کیسا ہی بنا لیا جائے لیکن اگر شاخ ہی نہیں تو نشین کا وجود بھی ممکن نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

”وہ شاخ جس پر نشین ہوگا، وہ شاخ ہے ”معاشرہ“، وہ شاخ ہے کسی ملک کی عام زندگی، شہر میں چلنے والے، بازار میں خرید و فروخت کرنے والے، کارخانوں میں کام کرنے والے اور مدرسوں میں، دانش گاہوں میں پڑھنے اور پڑھانے والے انسان، یہ عام انسان جن سے زندگی عبارت ہے، جن سے شہروں کی رونق ہے، یہ اصل آبادی ہے، یہ کیا ہے؟ اس کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے پیمانے کیا ہیں؟ اس کے احساسات کیا ہیں؟ اس میں نشین کو اٹھانے، نشین کو برداشت کرنے کی کتنی صلاحیت ہے؟..... سارا انحصار اس پر ہے کہ ہمارا معاشرہ کیسا ہے؟ ہمارا معاشرہ اعتقادی طور پر اور اخلاقی طور پر کیسا ہے؟ زندگی کی بنیادی چیزیں، اولین اصول، انسانیت کی ابتدائی شرائط کو پورا کر رہا ہے یا نہیں؟“ (۱)

مولانا کا خیال یہ ہے کہ اگر گناہ کی رغبت، نفس پرستی، بوالہوسی معاشرہ کا مزاج بن گئی ہے تو اس کو نظر انداز کر کے کوئی نقشہ، کوئی نظام کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”اگر آپ کو نشین تعمیر کرنا ہے تو اس شاخ کی فکر کیجئے جس پر نشین تعمیر ہونا ہے، وہ کس حالت میں ہے؟ اگر اس شاخ پر تیشہ چلانے والے سیکڑوں

ہیں اور نشیمن بنانے والا ایک ہے، اور میں مانتا ہوں کہ وہ اعلیٰ درجہ کی صلاحیت اور پورے وسائل رکھتا ہے، لیکن جہاں ہزار آدمی تیشہ چلا رہے ہوں تو وہ ایک آدمی جو نشیمن بنا رہا ہے یا کوئی تعمیری کام کرنا چاہتا ہے، وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔“ (۱)

حضرت مولانا نے یہ فکر پیش کی ہے کہ معاشرہ افراد سے اور مختلف طبقات سے وجود میں آتا ہے، اس لیے افراد کی اصلاح اپنی جگہ نہایت اہم ہے۔ مولانا فرماتے ہیں :

”یہ خام خیالی جو لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھ گئی ہے کہ افراد کا معاملہ اتنا اہم نہیں ہے، اصل معاملہ ہے مجموعہ اور اجتماعیت کا..... یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ (۲)

اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو بڑا احساس اور امت کے لیے تڑپنے والا دل دیا تھا، ان کی پوری زندگی امت کی اصلاح و ترقی کی فکر میں گزری، انہوں نے امت کے ہر طبقہ کو خطاب کیا، اس کی خامیاں بتائیں، امراض کی نشاندہی کی اور اس کے علاج کی تدبیریں بتائیں، لیکن اس کے لیے انہوں نے وہ اسلوب اختیار کیا جو اسوۂ رسول اللہ ﷺ کا نقش تھا۔ مولانا نے کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی، کسی کی ذات پر حملہ نہیں کیا، ہر ایک کی خوبیوں کا اعتراف کیا، اور اس کی پوری قدر کی، پھر جہاں ضرورت پیش آئی بڑی محبت و اپنائیت کے ساتھ اس کی اصلاح کی، اور افراد کے ساتھ اکثر ایسا ہوا کہ حضرت مولانا کی صحبت کی میا اثر سے خود بخود تبدیلی پیدا ہوئی۔

دعوت و اصلاح کا آغاز

وہ ۱۹۳۰ء سے پہلے کا زمانہ تھا، مولانا کا سنہرہ آغاز ہی ہوا تھا لیکن ماں اور بھائی کی تربیت سے طبیعت میں نکھار پیدا ہو چکا تھا، وہ عمر کہ جب آدمی کو اپنی فکر بھی کم ہوتی ہے، مولانا کی اس عمر میں امت کی فکر ہونے لگی تھی، حالات کے مطالعہ نے ان کے معصوم دل پر کچھ کے لگائے تھے، مولانا نے عید کے دن عید گاہ میں لوگوں کو خطاب کیا، شاید یہ مولانا کی پہلی تقریر تھی

لیکن وہ دلوں کو تڑپا گئی، ہمارے بڑے پھوپھا سید محمد مسلم حسنی صاحب سے راقم نے خود سنا وہ کہہ رہے تھے کہ ”عجب منظر تھا ایک نوخیز نوجوان تقریر کر رہا ہے اور لوگوں کی آنکھیں نم ہیں، دلوں پر عجیب کیفیت طاری ہے، تقریر کے بعد ہی خاندان کے ایک بزرگ کہنے لگے ”علی میاں! عید میں تو نہ رلا یا کرو“۔

یہ حضرت مولانا کی اصلاحی و دعوتی کوششوں کا آغاز تھا، جس کا زمانی رقبہ سات دہائیوں کو سیٹھ ہوئے ہے، اور مکانی رقبہ اگر دیکھا جائے تو کرہ ارض کے کم حصہ بچے ہوں گے جہاں مولانا کے قدم نہ پہنچے ہوں۔ قلم کی بازگشت تو ان کے جانے کے بعد بھی ساری دنیا میں سنائی دے رہی ہے، اور شاید صدیوں سنائی دیتی رہے۔

وہ پہلی تقریر ظاہر ہے ریکارڈ تو نہیں ہو سکی، لیکن مولانا نے اپنی یادداشت سے اس کو قلمبند فرمادیا، تقریر کے موضوع اور اس کے مشتملات کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس نوعمری میں اتنی فکر انگیز باتیں! ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

مولانا نے اس تقریر میں فرمایا تھا کہ اس وقت مسلمانوں کے مجمع کو دیکھ کر قلب پر تین قسم کے بالکل الگ الگ اثرات مرتب ہوتے ہیں :

(۱) مسرت (۲) حیرت (۳) حسرت

مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کو دیکھ کر مسرت ہوتی ہے، اور حیرت اس بات پر ہے کہ جب وہ محدود تعداد میں تھے تو دنیا پر چھا گئے اور اس سے زیادہ حیرت اس پر ہے کہ آج اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود وہ بالکل جھاگ کی مانند ہیں۔ اور مسلمانوں کے حالات کا علم جتنا زیادہ ہوتا جاتا ہے حسرت بڑھتی جاتی ہے۔ پھر حضرت مولانا نے صحابہ کرام کے حالات کا آج کے مسلمانوں کے حالات سے موازنہ کیا ہے، اور فرمایا کہ یہ مقام عبرت ہے۔ اخیر میں حضرت مولانا اپنے مبلغ انداز میں فرماتے ہیں۔

”جس وقت اس نادان کسمن بچے (امت) نے اس اتالیق اعظم، اس مربی اکبر، اس دانا جہان دیدہ کی انگلی چھوڑ دی، وہ پچھار گلیوں میں، بھیڑ میں پڑ گیا، وہ جتنا چلتا ہے، اپنے گھر سے دور ہوتا جاتا ہے، چلاتا ہے اور روتا

ہے، مگر کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑتا، وہ بھوکا ہے اور پیاسا ہے، مگر کسی کو اس پر ترس نہیں آتا۔

وہ اتالیق اب بھی ان تمام لوگوں سے اس بچے سے زیادہ قریب ہے، لہذا زیادہ شفیق ہے، جن کی صورت یہ تکتا ہے مگر وہ منہ پھیر لیتے ہیں، جن کا ہاتھ یہ پکڑنا چاہتا ہے، مگر وہ چھڑا لیتے ہیں۔ لیکن وہ بچہ اس کی طرف کسی طرح متوجہ نہیں ہوتا۔

معلوم ہوا کہ ہم میں اور ان میں جو فرق ہے وہ اتباع کا ہے، وہ نسخہ کیمیا (قرآن) اب بھی موجود ہے، استعمال کرنے کی دیر ہے، نسخہ استعمال کرنے والا اور پڑھنے والا برابر نہیں ہو سکتے۔

قرآن مجید پڑھو یا پڑھو کر سنو، فرائض و احکام کی فہرست دیکھو، جو کسی ہو پوری کرو، اپنی اپنی اصلاح کرو کہ قوم کی اصلاح اسی طرح ہوگی۔“ (۱)

علماء سے خطاب

حضرت مولانا نے ہر طبقہ سے خطاب فرمایا ہے اور اس کو اس کی خامیاں بتائی ہیں، علماء سے بھی مولانا نے بار بار خطاب کیا ہے اور ان کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلانے کے ساتھ ساتھ ان کو اصلاح حال کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔ پاکستان میں کی گئی ایک تقریر میں وہ فرماتے ہیں :

”علماء ایسی زندگی کا نمونہ پیش کریں کہ یہ معلوم ہو کہ یہ کسی اور ہی طبقہ کے لوگ ہیں، یہ وارث انبیاء کے وارث ہیں، یہ ناسین انبیاء ہیں، یہ مادیت کے زخم خوردہ اور اس کے قاتل و شہید نہیں، جن کے پاس جا کر دنیا کی بے ہمتی ظاہر ہو اور کم سے کم یہ معلوم ہو کہ دولت ہی سب کچھ نہیں ہے، جس کو سو بار غرض ہو وہ یہاں آئے، ہم کسی کے دروازے پر نہیں جاتے، اگر جاتے ہیں تو دین کی دعوت لے کر جائیں گے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے جائیں گے، کسی فریضہ، کسی سنت کے احیاء کے لیے جائیں گے، اپنی

غرض کے لیے، کسی کی سفارش کے لیے نہیں جائیں گے۔“ (۱)

لبنان کے شہر صیدا میں علماء کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”اس میں کوئی شک نہیں کہ قوم کی اصلاح اور درستگی کا دار و مدار علماء کی اصلاح و درستگی پر ہے، علماء اگر صحیح راستہ پر ہوں گے تو قوم بھی صحیح راستہ پر ہوگی، اور اگر علماء میں انحراف ہوگا، بے یقینی اور کمزوری ہوگی، اگر ان کے اندر مادی خواہشات کے مقابلہ میں سپر اندازی اور حالات کے سامنے جھکنے کا رجحان ہوگا، ان کا معیار زندگی بلند ہوگا، ان کے اندر سادگی اور قناعت کا فقدان ہوگا، وہ تنعم پسندی اور راحت طلبی کے عادی ہوں گے تو اس کا اثر لازمی طور پر مسلم عوام پر بھی پڑے گا، اسی موقع کے لیے کسی شاعر نے کہا تھا :

مژدہ باداے مرگ! عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

انسان کی فطرت ہے کہ وہ ہر ایسی چیز پر فریفتہ ہوتا ہے جو اس کے پاس موجود نہیں ہوتی، پہلے اسلامی معاشرہ علماء کا ادب کرتا تھا، اور ان کو بڑے احترام اور عظمت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، جب وہ زہد و قناعت، بے نیازی و بلند نفسی اور کسی قدر تقشف و سادگی سے مالا مال تھے، یہاں تک کہ سلاطین و امراء ان سے ڈرتے تھے، ان کا احترام کرتے تھے اور ان کو اپنے سے بلند سمجھتے تھے۔

لیکن آج علماء کا یہ حال ہے کہ وہ بھی راحت طلبی کی دوڑ میں سب کے ساتھ مصروف ہیں، اور اب ان کے درمیان اور ان کے ہم وطن و ہم نسل افراد کے درمیان کوئی امتیاز نہیں رہا، اس لیے معاشرہ بھی انھیں اسی نگاہ سے دیکھنے لگا جس نگاہ سے وہ عوام کو دیکھتا ہے، اور اب لوگوں کے دلوں میں علماء کی کسی نصیحت یا تنقید کی وقعت نہیں پیدا ہوتی۔

دعوت و تبلیغ کے لیے نہایت ضروری ہے کہ علماء اپنے کھوئے ہوئے مقام کو حاصل کریں، اپنا اعتبار اور اپنی دینی اور اجتماعی قیمت کا شعور پیدا کریں۔

اصلاح و تجدید کی تاریخ میں ہم نے دیکھا ہے کہ جب بھی اسلام اور مسلمان کسی زبردست بحران سے دوچار ہوئے ہیں، ہر طرف ناامیدی اور بے یقینی کے بادل چھا گئے ہیں، ایک عالم نمودار ہوا، اصلاح و جہاد کے میدان میں آیا، حالات کو چیلنج کیا اور تاریخ و واقعات کا رخ موڑ کر رکھ دیا، اسلامی عقائد کی سلامتی اور اسلامی شریعت کی عظمت کے تحفظ کا فرض انجام دیا، قوم کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دی اور اسے ایک نئی زندگی بخش دی۔ یہ عمل ہم مسلسل دیکھ رہے ہیں، امام حسن بھڑی سے شیخ عبدالقادر جیلانی تک، ابن تیمیہ حرانی تک، شیخ احمد سرہندی اور اس صدی کے علماء ربانین اور ائمہ مصلحین تک ہر زمانہ اور ہر صدی میں یہ ہوتا آیا ہے، اور قیامت تک اس دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تذکیر کے سلسلہ کو جاری رہنا چاہیے۔ (۱)

علماء، دانشوروں اور مدارس و تحریکات کے ذمہ داروں کو ایک اہم فریضہ کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”علماء اور دانشوروں کا دوسرا فریضہ یہ ہے کہ اسلام کے مفاد کو ہر جماعت، ہر ادارہ، ہر مدرسہ اور ہر گروہ کے مفاد پر ترجیح دیں۔ میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اگر ہمیں معلوم ہو کہ سب جماعتوں کو مٹا دینا پڑے گا، سارے نشانوں کو نکال دینا پڑے گا، سارے ناموں کو ختم کر دینا پڑے گا، سارے بورڈوں کو ہٹا دینا پڑے گا، اور اسلام اس ملک میں غالب رہے گا تو ہمیں ایک منٹ بھی اس میں پس و پیش نہیں ہونا چاہیے، ہمیں دین و ملت کا مفاد ہر جماعت سے عزیز ہونا چاہیے، سہرا کسی کے سر بندھے سہرا ہونا چاہیے، حضور ﷺ کا معجزہ یہ تھا کہ صحابہ کرامؓ کے دل سے یہ شوق نکل گیا تھا کہ ان کا کارنامہ سمجھا جائے۔“ (۲)

(۱) دریائے کابل سے دریائے یرموک تک صفحہ ۱۳۳-۱۳۵

(۲) دعوت فکرو عمل صفحہ ۸۶-۸۷

طالبان علوم نبوت کی ذمہ داریاں

مدارس کے طلبہ حضرت مولانا کی امیدوں کا مرکز رہے ہیں، خود دار العلوم ندوۃ العلماء میں بار بار حضرت مولانا نے ان کو خطاب کیا ہے، اور اصلاح حال کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کے مختلف ملکوں میں مولانا نے طلبہ کو خطاب کیا ہے، ان خطابات میں مولانا بار بار یہ فرماتے ہیں کہ ”میں تمہارے ہی خاندان کا ایک فرد ہوں، اور خاندان کا ایک فرد جتنا افراد خاندان سے واقف ہوتا ہے دوسرا نہیں ہوتا۔“

اسی اپنائیت کے ساتھ مولانا نے ان کے سامنے لائحہ عمل پیش کیا ہے۔ مولانا کے ان مؤثر خطابات کا ایک مجموعہ..... ”پاجاسراغ زندگی“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے، جس کے بارے میں اس کے مرتب مولانا سید محمد احسنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

”مولانا مدظلہ نے تقریریں جس درد و سوز سے کیں اور اپنے طویل علم و مطالعہ اور تجربہ و مشاہدہ کا انچوڑ جس طرح پیش کیا وہ کتاب کی سطر سطر سے نمایاں ہے

ع ہے رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو۔“ (۱)

مولانا نے ان خطابات میں کیا فرمایا اور کن چیزوں پر زور دیا اس کا مختصر تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے؛ انتشارِ دینی و قلبی سے بچنے اور یکسوئی اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں :

”کتنا بڑا ظلم ہے کہ لوگ ساری دنیا کے راستے بند کر کے اور ساری کشتیاں جلا کر یہاں آ کر پڑ گئے ہوں، تم یہاں رہ کر یہ معاملہ کرو کہ تمہارا ایک پاؤں یہاں رہے، اور ایک پاؤں خدا کے دشمنوں کے ساتھ، دشمنان اسلام کے قلعہ میں! تمہارا جسم یہاں رہے، اور تمہارا دل باہر! تم یہاں رہو، تمہاری آنکھیں باہر رہیں، اس کی کون اجازت دے سکتا ہے!“ (۲)

اساتذہ و طلبہ کے ربط و تعلق کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”خوب سمجھ لیجیے کہ ان ہی اساتذہ کی محفلوں میں شرکت کر کے آپ صحیح ذوق و شوق پیدا کر سکتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ آپ اعتماد اور ایک حد تک اعتقاد اور اتحاد کے ساتھ بیٹھیں۔ یاد رکھئے کہ مخلص و غیر مخلص اچھے اور برے بلکہ انسان اور غیر انسان کا فرق سمجھنے کے لیے کہیں بھی اصول و ضوابط منضبط نہیں ہوتے بلکہ یہ بات صرف ذوق ہی سے معلوم ہوتی ہے۔

آج تمام مدارس میں ایک خلا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اساتذہ اور طلباء میں ربط نہیں ہے، بلکہ ان کے درمیان ایک خلیج حائل ہے، اور وہ صرف درس کے اساتذہ اور درس کے طلباء ہو کر رہ گئے ہیں، اس خلا کو پر کر دینے کی اور اس خلیج کو پاٹنے کی ضرورت ہے، اس میں مدارس کی کامیابی و ترقی مضمر ہے۔“ (۱)

ذاتی محنت کی اہمیت و ضرورت پر زور ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں :

”تاریخ و تذکرہ میرا موضوع ہے، اور میں اپنے مطالعہ اور تجربہ پر اعتماد کر کے کہتا ہوں کہ کوئی مدرسہ اور کوئی کتب خانہ کسی انسان کو نہیں بناتا، انسان خود اپنی قوت بازو سے اپنی محنت اور کاوش سے بنتا ہے، اگر آپ بزرگی کے شعبہ میں دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہی برگزیدہ بندے تھے، جن کے سرپرست ولی نہیں تھے، ان کے لیے ماحول ناساز گار تھا، لیکن وہ اپنی محنت سے اپنی ٹرپ اور پیاس سے ولی کامل بن گئے۔“ (۲)

طالبان علوم نبوت کی ذمہ داریاں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”آپ میں یہ حوصلہ اور ہمت ہونی چاہیے کہ ساری دنیا ملتی ہو تو اس کے ایک نقطہ سے بھی دستبردار ہونے کے سوال پر غور نہ کر سکیں، آپ کے دلوں میں اس کی حمایت و نصرت کا جذبہ موجزن ہونا چاہیے، آپ کا دل اس بے بدل دولت پر فخر اور شکر سے لبریز ہو، آپ کو اس کی صداقت، اس کی معقولیت، اس کی ابدیت، اس کی ہر زمانہ میں صلاحیت، اس کی بلندی

دربری، اور اس کی معصومیت پر غیر متبدل یقین ہو، آپ اس کے مقابل ہر چیز کو پورے اطمینان کے ساتھ جاہلیت اور جاہلیت کی میراث سمجھتے ہوں، آپ جہاں احکام خداوندی اور تعلیمات اسلامی کو سن کر ”سمعنا و اطعنا“ کہیں، وہاں جاہلیت کے نظام اور جاہلیت کے علمبرداروں کو مخاطب کر کے کہیں کہ ”كُفِّرْنَا بِكُمْ وَبَدَّيْنَنَا وَيَبْنِكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُوْمِنُوا بِاللَّهِ وَحَدُّهُ“، آپ اسلام ہی کی رہنمائی اور اسوہ محمدی ﷺ ہی کی روشنی میں دنیا کی نجات کا یقین رکھتے ہوں، اور آپ کا اس پر عقیدہ ہو کہ اس طوفانِ نوح میں سفینہ نوح صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور امامت ہے۔ آپ یقین کرتے ہوں کہ افراد اور اقوام کی سرفرازی اور سربلندی کی شرط صرف رسول اللہ ﷺ کا اتباع ہے، اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ

محمد عربی کہ آبروئے ہر دوسراست

کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

آپ تعلیمات نبوت کو علم کالب لباب اور حقیقۃ الحقائق سمجھتے ہوں، آپ اس کے مقابلہ میں تمام دنیا کی الہیات اور فلسفہ مابعد الطبیعات اور قیاسات و روایات کو افسانہ و خرافات سے زیادہ وقعت دینے کے لیے تیار نہ ہوں، آپ توحید کی حقیقت سے واقف اور اس پر مصر ہوں، اور شرک اور تمام دنیا کے علم الاضنام کو خواہ وہ کیسے ہی پر جلال علمی اصطلاحات اور فلسفہ کی زبان میں بیان کیا گیا ہو، حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوں اور ”زخرف القول غرورا“ سے زیادہ مرتبہ دینے کے لیے آمادہ نہ ہوں، آپ سنت کے اتباع کے حریص اور ”خیر الہدیٰ ھدیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم“ پر یقین رکھتے ہوں، اور بدعات کے مضر اور نامقبول ہونے پر آپ کو شرح صدر ہو، غرض آپ اعتقادی، ذہنی، فکری، قلبی ذوقی اور عملی حیثیت سے نبوت

محمدی ﷺ کی جامعیت اور عملیت کے قائل اور اس کی عملی تفسیر ہوں۔

دوستو! دنیا کے دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں آپ کا امتیاز یہ ہے کہ ان حقائق پر دوسروں کا اجمالی ایمان کافی ہے مگر آپ کو اس پر پورا ذہنی اطمینان اور شرح صدر ہونا چاہیے، آپ کا صرف قائل ہونا کافی نہیں، اس کا داعی ہونا ضروری ہے، دوسروں کا یقین لازمی ہو تو کافی ہے، آپ کا یقین متعدی ہونا چاہیے، جو سیکڑوں ہزاروں انسانوں کو یقین سے لبریز کر دے، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ آپ کا یہ سرور سرخوشی و سرمستی اور بے خودی کی حد تک نہ پہنچا ہو، اور آپ میں ”یکرہ أن يعود الی الکفر کما یکرہ أن یقذف فی النار“ کی حقیقت نہ پائی جاتی ہو، تعلیمات نبوت سے دوسروں کی سرسری واقفیت کافی ہے، مگر آپ کے لیے علوم نبوت میں رسوخ، علوم نبوت سے عشق، علوم نبوت میں مقام فنایت، علوم نبوت پر اصرار ضروری ہے، اس کے بغیر دعوت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا بلکہ دعوتوں اور تحریکوں کے اس طوفانی دور میں اس کے بغیر اپنی خصوصیات اور سرمایہ کی حفاظت بھی مشکل ہے۔“ (۱)

دینی مدارس کے طلبہ میں جو ایک کمتری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”عزیزو! آپ احساس کہتری کا کیوں شکار ہوں؟ دوسروں کا احساس کہتری ایک نفسیاتی مرض ہے، مگر آپ کا احساس کہتری دینی کمزوری، ضعف عقیدہ، اور ضعف ایمان کی دلیل ہے، جس کے نتائج بہت سنجیدہ اور دور رس ہیں، انبیاء کے نائبین اور علوم نبوت کے حاملین کو اپنی کمتری اور حقارت کا احساس ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نبوت کے مقام سے نا آشنا اور یقین سے خالی ہیں، آپ تو ان ہستیوں کے جانشین ہیں، جن کے متعلق عارف رومی نے بجا طور پر کہا تھا

نخوتے دارند وکبرے چوشہاں
چاکری خواہند از اہل جہاں
اور جن کے متعلق سعدیؒ کے الفاظ میں یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ
ع شہان بے کلمہ و خسروان بے کمراند۔“ (۱)

وسیع تیاریوں اور متنوع صلاحیتوں کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں :
”عزیزو! اس عہد انقلاب میں دین کی نمائندگی، تعلیمات اسلام کی
ترجمانی اور نہ صرف ان کی تشریح و تفہیم بلکہ ان کی بلندی و برتری کا نقش قائم
کرنے کے لیے بڑی وسیع تیاریوں اور بڑی متنوع صلاحیتوں کی ضرورت
ہے، آپ اسلام کے سپاہی ہیں، اور زندگی کے معرکہ کے لیے تیار ہو رہے
ہیں، کسی فوجی تربیت گاہ اور وہاں کی تیار ہونے والی فوج کے لیے سب سے
زیادہ ناموزوں، سب سے زیادہ خطرناک بحث، قدیم و جدید اسلحہ اور طریق
جنگ کی بحث ہے۔ سپاہی کے لیے نہ کوئی ہتھیار قدیم ہے نہ جدید، اس کو تو یہ
دیکھنا ہے کہ میدان جنگ کے لیے کون سا ہتھیار کارگر ہے، اور کون
سا طریق جنگ موزوں، تیار ہونے والے سپاہی کے لیے تعصب کی کوئی
گنجائش نہیں، اس کا نہ کسی خاص اسلحہ سے رشتہ ہے نہ کسی خاص فن جنگ
سے، اس کو تو تمام ضروری اسلحہ سے مسلح ہونا چاہیے، عرب شاعر نے بہت
پہلے کہا تھا :

کل امرئ یسعی الی یوم الہیاج بما استعدا۔“ (۲)

طالبان علوم نبوت کے بلند مقام اور کام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :
”آپ یہ ثابت کیجئے کہ آپ ایک ایسے مورچے اور زندگی کے ایک
ایسے محاذ پر کھڑے ہوئے ہیں کہ اگر آپ نے وہ محاذ چھوڑ دیا تو اس کو
سنجھانے والا کوئی نہیں، آپ ثابت کریں کہ آپ اخلاق کے محاذ پر کھڑے
ہیں، آپ روحانیت کے محاذ پر کھڑے ہیں، خدمت خلق کے محاذ پر کھڑے

ہیں، علمی بلندی کے محاذ پر کھڑے ہیں، علمی تحقیق کے محاذ پر کھڑے ہیں۔ آپ نے اگر اپنی جگہ چھوڑ دی یا آپ کو اپنے محاذ سے ہٹا دیا گیا، تو زندگی میں اتنا بڑا خلا پیدا ہوگا جس کو نہ یونیورسٹیاں پر کر سکیں گی، نہ علمی مجالس پر کر سکیں گی، نہ کوئی اکیڈمی پر کر سکے گی، اور نہ کوئی اور کوشش پر کر سکے گی، یہ ہے خدا کا بنایا ہوا وہ ابدی قانون جس کو قرآن مجید کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ ”فَأَمَّا الزُّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً أَمْ وَأَمَّا مَآيِنُفُوعُ النَّاسِ فَيَمُوتُ فِي الْأَرْضِ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ.“ (۱)

اسلامی افواج کو خطاب

حضرت مولانا نے عمومی طور پر اپنی تحریروں میں کئی جگہ مجاہدین کی ذمہ داریاں بیان کی ہیں، لیکن دو تین موقعوں پر انہوں نے براہ راست اسلامی افواج کو خطاب کیا ہے، خطاب کے وقت حضرت مولانا پر جو کیفیت طاری ہوتی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”جب مسلح نوجوان صف بستہ کھڑے ہوئے اور اسلامی طریقہ کے مطابق ہم کو سلامی دی (اور یہ منظر میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا) تو میرے جسم میں عزم و ایمان اور سرخوشی و سرشاری کی ایک لہر دوڑ گئی اور طرب و ہتزاز کی ایسی کیفیت طاری ہوئی جو اس سے پہلے کبھی نہیں محسوس نہیں ہوئی تھی، اس کیفیت سے میری آنکھوں میں آنسوؤں آ گئے اور میری طبیعت رواں ہو گئی۔“ (۱)

حضرت مولانا نے تقریر میں جہاد کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اخیر میں دو باتوں کی طرف خاص طور پر متوجہ کیا: ایک تصحیح نیت اور دوسرے گناہوں سے اجتناب۔ خود مولانا تحریر فرماتے ہیں :

”دوسری چیز جس کی طرف میں نے توجہ دلائی وہ معاصی اور ہر ایسی چیز سے اجتناب جو اللہ تعالیٰ کے غضب کا باعث اور نصرت الہی کے تقاضوں کے خلاف ہو، سیدنا عمر بن عبدالعزیزؓ نے اپنے ایک سپہ سالار کو ایک خط لکھا

(۱) پاجاسراغ زندگی صفحہ ۱۶۲

(۱) دریائے کاہل سے دریائے یرموک تک صفحہ ۲۶۷

تھا جس میں فرمایا تھا کہ ”وہ دشمن کی قوت و کثرت اور اسلحہ سے اتنا نہ ڈرے، جتنا گناہوں اور خدا کی نافرمانی سے ڈرے کیونکہ میرے نزدیک لوگوں کے لیے گناہ دشمن کی چالوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔“ (۱)

خواص کی ذمہ داریاں

ملت کے سربراہ اور وہ لوگوں اور خواص کے لیے حضرت مولانا نے کئی جگہ یہ بات فرمائی کہ ان پر ملت کا دار و مدار ہوتا ہے، اگر یہ طبقہ ملت فروش ہو جائے تو اس کے بڑے خطرناک نتائج سامنے آتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں :

”ملتوں اور قوموں کی تاریخ اور خصوصیت کے ساتھ اس ملت کی تاریخ شاہد ہے کہ اسی طبقہ کی ضمیر فروشی یا بے ضمیری، مفاد پرستی، جاہ طلبی اور اقتدار کی ہوس نے بڑی بڑی مستحکم اور طویل العمر سلطنتوں کا چراغ گل کر دیا اور پوری ملت کو آن کی آن میں ذلیل کر کے رکھ دیا، خلافت عباسیہ کا خاتمہ، بغداد کی تباہی، بیت المقدس پر صلیبیوں کا قبضہ، سلطنت مغلیہ کا زوال، میسور کی ابھرتی ہوئی طاقت کا خاتمہ اور ٹیپو کی ناکامی، ترکوں کی شکست اور مقامات مقدسہ اور ممالک عربیہ کا اتحادیوں کے زیر اثر آنا، سب اسی طبقہ کی ملت فروشی، جاہ و اقتدار کی ہوس اور انانیت کا نتیجہ ہے۔“ (۲)

آگے فرماتے ہیں کہ ”اگر یہ طبقہ درست ہے تو بہتر سے بہتر نتائج سامنے آتے ہیں۔“ ایک جگہ مولانا نے تقریر میں اس کی مثال دل سے دی تھی کہ اگر اس کی اصلاح ہو جائے تو پورا جسم صحیح ہو جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں :

”اس طبقہ کی دینی حمیت و ملی غیرت، اخلاقی جرأت، معمولی قربانیاں، صدیوں کے لیے ملت کا مستقبل محفوظ کر دیتی ہیں، اور جو کام بعض اوقات لاکھوں کروڑوں انسان انجام نہیں دے سکتے وہ یہ مٹھی بھر جماعت انجام

(۱) دریائے کاٹل سے دریائے یرموک تک صفحہ ۲۷۲

(۲) خواص۔ ملت میں ان کا مقام اور ذمہ داریاں صفحہ ۲۲

دے دیتی ہے۔“ (۱)

خواص کے ضروری اوصاف کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہر فرد دوسرے فرد کے لیے باعث تقویت، اس کا پشت پناہ، اپنی جگہ پر صابر و مستقیم اور دوسروں کے لیے صبر و استقامت کا داعی و مبلغ ہو، اس کی زندگی، اس کا ایمان و یقین، اس کا صبر و توکل، اس کا عزم و حوصلہ، اس کا بلند کردار، دوسروں میں اعتماد پیدا کرنے کا ذریعہ اور ان کے لیے مشعل راہ ہو، اس کو دیکھ کر اکھڑتے ہوئے قدم جم جائیں، افسردہ طبیعتیں اور پست ہمتیں بلند و مستحکم ہو جائیں، اس فضا میں بے ہمتی اور بے صبری کی بات کہنا اور کرنا ایسا ہی مشکل ہو جائے اور معیوب سمجھا جائے جیسے تردد و تذبذب کے ماحول اور خوف و ہراس کے عالم میں صبر و ہمت کی تلقین اور ثبات و استقامت کی ہدایت۔“ (۲)

غیر اسلامی ماحول میں رہنے والے مسلمانوں کے امراض کی نشاندہی اور علاج کی دعوت

حضرت مولانا نے دنیا کے اکثر ملکوں کے سفر کیے، امریکہ و یورپ کے ملکوں میں وہ دسیوں بار گئے اور انہوں نے وہاں بسنے والے مسلمانوں کو بار بار خطاب کیا ان کے امراض کی نشاندہی فرمائی اور علاج تجویز کیا اور ان کی اصلاح کی تجاویز بتائیں۔ امریکہ میں کی گئی ایک تقریر میں فرماتے ہیں :

”ان مسلمانوں کی ذمہ داری (جو امریکہ و یورپ میں مقیم ہیں) بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے، اگر اسلام اور ادیان کی طرح صرف عقیدہ، یا صرف اعمال و عبادات کا نام ہوتا تو معاملہ بہت آسان تھا، لیکن اگر وہ ایک رنگ ہے، اگر وہ ایک طرز زندگی، جذبہ و شعور، ذوق و وجدان اور احساس بھی ہے، اور دوسرے مذاہب کی بہ نسبت زیادہ نازک اور لطیف طبع بھی ہے، اور اشیاء

کے معیار و اقدار اور چیزوں کے حسن و قبح کے تصور میں بنیادی تبدیلی کا داعی بھی، تو اس کا معاملہ بہت نازک اور مشکل بن جاتا، اور اس کی ذمہ داری بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

اس لیے ہم صرف کتابوں کے مطالعہ اور مقالات کے سننے سنانے پر ہی اکتفا نہیں کر سکتے، خواہ وہ کیسے ہی بلند پایہ اور علمی کیوں نہ ہوں، ہم اسلام کا ذوق و احساس صرف ان کتابوں اور مقالوں سے حاصل نہیں کر سکتے، اگرچہ یہ کتابیں اور مقالات بھی ضروری اور مفید ہیں، لیکن ان پر اکتفا و انحصار صحیح نہیں، بلکہ ہماری اصل ضرورت ایک اسلامی خطہ، اسلامی فضا، اسلامی رنگ کا وجود ہے، جہاں ہم اپنی آنکھوں سے اسلام کو دیکھ سکیں، اپنے کانوں سے اس کی آواز سن سکیں، اسے اپنے ہاتھوں سے چھو سکیں اور اپنے حواس سے اسے محسوس کر سکیں۔ اس کے لیے ملاقاتوں اور ملنے جلنے کی ضرورت ہے، اس کے لیے ہمیں اسلامی زندگی گزارنے کی حاجت ہے کہ ہم ان علاقوں میں جائیں جہاں اسلامی زندگی اور کسی بھی درجہ کا مثالی مسلم معاشرہ پایا جاتا ہے، جہاں ہم اسلام کو ایک زندہ و توانا انسان کی طرح چلتے پھرتے اور متحرک و تنفس دیکھ سکیں۔“ (۱)

اسلامی معاشرہ کو پروان چڑھانے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

”یہاں اسلامی معاشرہ ابھی اپنے دور طفولیت اور نشوونما کے ابتدائی مراحل میں ہے، اس لیے ہمیں اس نوخیز معاشرہ کے سلسلہ میں باشعور اور اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے، ہمیں یقین ہے کہ اللہ کے فضل سے قائم ہونے والا یہ معاشرہ نہ صرف قائم رہے گا بلکہ اپنی پختگی اور سن شعور کو پہنچنے گا اور اس کے پاس تربیت کے اسباب و وسائل ہوں گے۔ وہ اسباب تربیت کیا ہیں؟ وہ عقیدہ و ایمان، تحقیق و مطالعہ، علم و ثقافت، صحبت صالح اور

مجاہدہ ہے۔“ (۱)

ایک بہت اہم خطرہ کے طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”انہیں میں مجھے یہاں امریکہ اور ہر جگہ اس وقت کا خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ جب ہم اپنی ذات تک محدود اور اپنے خول میں سمٹ جائیں جیسے سانپ اپنی کچلی میں بند ہو جاتا ہے، اور صرف مطالعہ کتب اور علمی تحقیقات میں الجھ کر رہ جائیں، اور اسلام کے حقیقی سرچشموں اور اسلام کے ان مرکزوں سے ہمارا رشتہ باقی نہ رہے، جن میں کمزوریوں کے باوجود اسلام زندہ ہے، اور جن کی فضاؤں پر اسلام چھایا ہوا ہے، اور ہمارے قلب و روح کے اندر موجزن اسلامی جذبات و احساسات کے سرچشمے خشک ہو جائیں تو پھر امریکی اسلام، یورپی اسلام، جاپانی و ایرانی، ہندوستانی اور پاکستانی اسلام ابھرنے لگے گا، جن میں سے ایک دوسرے کو پہچان بھی نہ سکے گا، اور وہ آپس میں اس طرح مختلف ہوں گے جیسے امریکی ایشیائی سے، اور جاپانی انسان افغانی انسان سے مختلف ہوتا ہے، اور ایسے مسلم معاشرے وجود میں آجائیں گے جن کے ذوق و ذہن، اور اقدار و معیار بالکل الگ ہوں گے۔“ (۲)

کینیڈا میں گئی ایک تقریر میں بڑے دو ٹوک انداز میں فرماتے ہیں :

”یہاں رہنے کے بعد اپنے ایمان اور اپنی آئندہ نسلوں کے اسلام کی حفاظت کا انتظام اور اطمینان آپ نے کر لیا ہے، اور یہاں رہ کر آپ دعوت کا کام کرتے ہیں، اور ایسی اسلامی زندگی کا مظاہرہ کرتے ہیں جو دوسروں کے لیے کشش کا باعث ہو تو آپ کے یہاں رہنے کا جواز ہے، جواز ہی نہیں بلکہ یہ بہت بڑا جہاد اور بہت بڑی خدمت ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے، اور آپ کا رخ نظر صرف کھانا کمانا ہے، تو یہ مقصد مسلمانوں کے مقام اور مقصد حیات سے میل نہیں کھاتا، صرف کھانے کمانے کے لیے اتنی دور دراز کی مسافت

طے کرنا کسی مسلمان کے شایان شان نہیں۔“ (۱)

امریکہ کی آخری تقریر میں حضرت مولانا نے بڑی قوت کے ساتھ چھ باتیں بیان فرمائیں :

۱- ”پہلی بات تو یہ کہ آپ اس بات کی بھرپور کوشش کریں گے کہ آپ کے پاس اسلام کا جو سرمایہ ہے وہ کھونے نہ پائے، اگر آپ کو ذرا سا تصور آجائے کہ دنیا کی زندگی کتنی مختصر ہے اور آنے والی زندگی کتنی طویل ہوگی اور آخرت میں کن مراحل سے گزرنا پڑے گا تو آپ کے روٹنے کھڑے ہو جائیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ آپ کا شدت پریشانی میں دم نکل جائے۔ اگر ہم نے اس ملک میں سب کچھ کیا لیکن آخرت کے استحضار اور خدا کے خوف کی یہ کمائی لٹا دی تو ہم سے بڑھ کر کوئی بد نصیب نہ ہوگا۔ میں ایک حقیقت پسند انسان کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ خدا کی قسم دانے دانے کا محتاج ہونا اس سے کہیں بہتر تھا کہ ہم اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈالیں، اور اپنی اولاد کے دینی مستقبل کو داؤں پر لگائیں، سب کچھ ملا اور ہم اپنے ایمان کی دولت کھو بیٹھے تو یہ سب سے بڑا خسارہ ہے۔“ (۲)

۲- ”دوسری بات یہ کہ اپنی نیت کی تصحیح کرتے رہیں، جو کام کریں وہ رضائے الہی کے واسطے کریں اور کسی جاہ و منصب، عہدہ و غرض کو بیچ میں نہ لائیں۔“ (۳)

۳- ”تیسری بات یہ ہے کہ اپنی طرف سے غافل نہ رہیں، بلکہ اپنے دل کا، اعمال کا، نفس کا محاسبہ کرتے رہیں، خود اپنے ممتحن بن جائیں، اور اس کو ٹٹولتے رہیں، اس کے لیے میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ سال دو سال کے بعد اپنے اپنے ملک کچھ عرصے کے لیے ضرور جایا کریں، وہاں سے رابطہ قائم رکھیں، ہندوستان پاکستان اور حرمین شریفین ہو تو اور زیادہ بہتر ہے، اور وہاں رہ کر اچھے بھائی، رہتانی لوگوں کے خدمت میں حاضر ہوں جو بے غرض ہیں، جن کے پاس بیٹھ کر خدا یاد آتا ہو، ان سے ملاقات کریں، یا کسی دینی ماحول

(۱) نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں، صفحہ ۹۷

(۲) ایضاً صفحہ ۱۲۶-۱۲۷ (۳) ایضاً صفحہ ۱۲۹

میں تھوڑا وقت گزاریں، اگر یہیں رہیں گے تو تعلق باللہ اور ایمانی کیفیات کا سرمایہ خرچ ہوتا جائے گا، جیسے کہ بیٹری برابر استعمال میں رہے تو اس کا سالہ ختم ہوتا جائے گا، اس کو نئے سیلس (Cells) کی ضرورت ہوگی، اس طرح سے اپنے دلوں کی بیٹری کو بھی ہمیشہ نئے سیل دیتے رہیں۔“ (۱)

”چوتھی بات یہ ہے کہ آپ سلف صالحین سے اور امت کے ان لوگوں سے جنہوں نے اپنے اپنے دائرہ میں دینی و ملی کام کیا ہے بدگمان نہ ہوں، یہ بڑے خطرہ کی بات ہے۔“ (۲)

اسی بات کو مولانا اور وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”یہ کبھی نہ سمجھئے گا کہ اسلام کو اب کچھ لوگ سمجھتے ہیں، اس سے پہلے کوئی پورے اسلام کو سمجھا ہی نہیں، یہ اسلام پر بڑا الزام ہے، یہ اسلام کی صلاحیت پر دھبہ ہے، اس سے قرآن شریف کی زندگی اور اس کا واضح اور قابل فہم ہونا مشکوک بن جاتا ہے، جس کو ”کتاب عربی مبین“، ”لسان عربی مبین“ کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے، اس کے علاوہ جو کتاب ہزار بارہ سو برس تک نہ سمجھی گئی ہو، اب کیا اطمینان ہے کہ وہ صحیح سمجھی گئی ہو؟ اس لیے میں ہر اس تحریر کو مضر سمجھتا ہوں جو یہ تاثر دے کہ پورے اسلام کو ہزار بارہ سو برس تک نہیں سمجھا گیا، یا بعض بعض اسلامی حقیقتیں اس وقت تک بالکل تاریکی میں ہیں، میں اس کو بالکل ماننے کے لیے تیار نہیں، اسلام کے بنیادی اصول، قرآن کے حقائق، اور دین کے قطعیات تسلسل کے ساتھ چلے آرہے ہیں، اگر کوئی سمجھتا ہے کہ وہ عرصہ تک نہیں سمجھے گئے تو یہ اس کے نظر کی کوتاہی ہے، ایک بات بھی کوئی ثابت کر دے کہ یہ حقیقت بالکل عالم اسلام بھول گیا، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ایک سنت بھی نہیں ہے جو پورے عالم اسلام سے کلیۃً اٹھ گئی ہو، اگر اس کو نہ پر موجود نہیں تھی، تو اس کو نہ پر موجود بھی، گویا بقول اقبال

جہاں میں اہل ایمان صورت خورشید جیتے ہیں

ادھر ڈوبے ادھر نکلے، ادھر ڈوبے ادھر نکلے۔“ (۱)

۵- ”ایک چیز یہ کہ اس ملک میں ایمان کے حفاظت کی صورت یہ ہے کہ آپ نمازوں کو ہاتھوں سے نہ جانے دیں، نمازوں کو وقت پر پڑھنے کی پوری کوشش کریں، حضرت عمرؓ نے ایک گشتی فرمان میں لکھا تھا، ”تمہارے تمام امور و معاملات میں سب سے اہم نماز ہے، جس نے اس کی حفاظت کی وہ تمام چیزوں کی حفاظت کرے گا اور جن سے اس کو ہاتھ سے جانے دیا اور ضائع کر دیا وہ کوئی چیز باقی نہیں رکھے گا“، پس نماز کو قائم رکھیے، چاہے بازار میں یا کہیں بھی ہوں فرض پڑھ ہی لیجئے باقی سنتوں کو بھی حتی الامکان ادا کرنے کی کوشش کیجئے، یہ سنتیں اور نوافل فرائض کو بھی محفوظ رکھتے ہیں۔“ (۲)

۶- ”اور آخری بات یہ ہے کہ یہاں کی تہذیب سے جو اپنے نقطہ عروج پر ہے، اپنی حفاظت کیجئے، مجھے یہاں بعض باتوں میں بہت تساہل نظر آیا، میں صاف کہے دیتا ہوں کہ یہاں مردوں اور عورتوں کا اختلاط بہت زیادہ ہو گیا ہے، حتی الامکان مخلوط جلسوں اور مجالس سے بچنے کی کوشش کیجئے، اگر کہیں مجلس ہو جہاں عورتوں کی شرکت ہو، اور وہاں آپ کی شرکت ضروری ہو، تو ان کا حلقہ الگ رکھئے، یہاں تک کہ ان کا راستہ تک الگ رکھئے، اس میں بڑی حفاظت ہے، اسلامی معاشرت بڑی حکمتوں پر مبنی ہے، اور حدیثوں میں مردوں اور عورتوں کے تھلیے کے لیے بہت سخت الفاظ آئے ہیں، بہت ڈرایا گیا ہے، امر کی تہذیب کے ان اثرات کو آپ قبول نہ کریں، جہاں تک ہو سکے اسلامی تمدن، اسلامی معاشرت کی حفاظت کریں اور اس کی اچھی خصوصیات اور ان کے اچھے اجزاء کو باقی رکھنے کی کوشش کریں۔“ (۳)

خواتین سے خطاب

خواتین کو حضرت مولانا نے اسلامی سوسائٹی کا عظیم رکن اور جسم اسلامی کا موثر و فعال عضو قرار دیا ہے، اور صحیح اسلامی معاشرہ کے وجود و بقاء کے لیے ان کے کردار کو موثر اور اہم بتایا ہے، ان کو اسلامی معاشرت اختیار کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ قطر میں ”کلیۃ البنات“ کے جلسہ میں خواتین کو خطاب کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں :

”آج بھی ہمیں اسلامی سوسائٹی کے اس عظیم رکن اور جسم اسلامی کے اس موثر و فعال عضو سے توقع ہے کہ وہ مغربی تہذیب کا سایہ بننے کے بجائے اپنے اوپر مغربی تہذیب کا سایہ بھی نہ پڑنے دیں گی، ان کو چاہیے کہ اس مغربی تہذیب کے پیچھے دوڑنے اور اس ریس میں شریک ہونے کے بجائے اس کے ضروری اور مفید اجزاء اختیار کریں، اور ہر اس چیز کو ترک کر دیں جو دین، ان کی عزت و شرافت، ان کے اخلاق و آداب اور ان کی اسلامی شخصیت کے منافی ہو، ہمارے گھر اسلامی گھروں کا نمونہ ہوں، کوئی یورپین آدمی آئے اور کسی مسلمان کے گھر میں داخل ہو تو اسلامی نظم و نسق، ثقافت، حیا و عفت، شرم و حجاب، پردہ، احترام، چھوٹوں پر شفقت اور محبت و اخوت کے اسلامی مظاہر دیکھے، وہ شوہر اور بیوی، بھائی بہن، ماں باپ کے درمیان تعلقات اور زندگی کا وہ طرز اس کے سامنے ہو، جس سے وہ بالکل ناواقف ہے، بجائے اس کے کہ ہم ان کی تقلید کریں، وہ ہمیں دیکھ کر جب واپس جائیں تو ان کے دل کی آواز ہو کہ ہمیں اسلامی تہذیب و تمدن کی نقل کرنا چاہیے، وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے جا کر بتائیں کہ ہم نے ایک اسلامی ملک میں تھوڑا وقت گزارا، اور جو دیکھا وہ بیان سے باہر ہے، سچ یہ ہے کہ ہم نے جنت ارضی دیکھ لی، ہم نے ایک مسلمان کا گھر کیا دیکھا گویا جنت دیکھ لی، خدا کی قسم یہی اسلامی زندگی جنت ہے اور جو زندگی ہم گزار رہے ہیں وہ آگ کی بھٹی ہے۔“ (۱)

ہندوستان میں ہی خواتین کو ایک جگہ خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”بہنوں لو! بیبیوں لو! اپنے بچوں کو مسلمان بناؤ، مسلمان رکھو، اور اردو پڑھنا سکھاؤ، قرآن مجید پڑھنے کے قابل بناؤ، توحیدان کے دل میں بٹھاؤ، شرک و بدعت سے، بت پرستی سے، ان سب چیزوں سے روکو، اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کو توفیق دے، اگر یہ کام ہو گیا تو اس میں بہت کچھ ضمانت ہے اسلام کے بقاء کی اور تحفظ کی، ورنہ محض خارجی اور تنظیمی کوششیں اور محض اخبارات و رسائل اور محض کانفرنسیں، یہ مفید ہوں، لیکن کافی نہیں ہیں۔“ (۱)

ایک دوسری تقریر میں دونوں انداز میں فرماتے ہیں :

”ہم صاف کہتے کہ مسلمانوں کا اس ملک میں مسلمان بن کر رہنا، قرآن شریف پڑھنے کے قابل ہونا، اردو کتابوں سے فائدہ اٹھانا، اسلامی شعائر و احکام سے واقف ہونا، اسلامی تہذیب اختیار کرنا اور اس پر قائم رہنا اور توحید کے عقیدے پر مضبوطی سے جمنا، اس میں آدھی سے زیادہ ذمہ داری ہماری بیبیوں اور عورتوں پر ہے۔“ (۲)

کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے اصلاح کی دعوت کو دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

”اگر تم نے باہر پھرنا شروع کیا، بازار میں دل لگے لگا تو پھر گھر کی وہ نوازش ختم، اب تو بازاروں میں پھرنے والی عورتوں کی طرح تمہارا دل بھی پریشان ہونے لگے گا، یہ نہ خریدا وہ نہ خریدا، فلاں دکان پر یہ مال دیکھا تھا، فلاں دکان پر یہ سامان دیکھا تھا، فلاں ہار اتنے میں ملتا ہے، ہمیشہ پریشان رہو گی، دماغ پریشان، دل پریشان، گھر میں جی لگتا نہیں، شام میں ہوا خوری کے لیے باہر نکلیں اور دکان دکان، یہ مسلمان بیبیوں کا کام نہیں۔

اللہ نے اپنے رسول ﷺ کی بیویوں کے لیے پسند کیا وہی اپنے لیے پسند کرنا چاہیے، وہی ہمارے لئے نمونہ ہے، وہی قابل تقلید بات ہے ”وَلَا تَبْرَأْ جُنَّ نَبْرُجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى“، اسلام سے پہلے کا زمانہ جو خراب

زمانہ، جاہلیت کا زمانہ ہے، اس کی طرح بناؤ سنگار نہ کرو، اور نماز پڑھو، زکوٰۃ دو، نماز کے لیے جگہ مقرر کرو، جگہ پاک صاف ہو، وہاں تسبیح پڑھ سکو، کتابیں پڑھ سکو، اپنے بچوں کو دین کی باتیں سکھا سکو، جو وقت بچے اس میں شوہر کی خدمت کرو، بچوں کی تعلیم و تربیت میں وقت خرچ کرو۔“ (۱)

اسی تقریر میں آگے فرماتے ہیں :

”بس میری بہنو! اتنی بات عمل کرنے کو کافی ہے، پانچوں وقتوں کی نماز ادا کرو، شوہروں کے حقوق ادا کرو، اولاد کے حقوق ادا کرو، اللہ کے حقوق ادا کرو، اور سادہ زندگی رکھو، سادہ معاشرت اختیار کرو تو تمہیں اس ملک میں سکون نصیب ہوگا۔ اور تم تبلیغ کرو تو دوسری عورتیں بھی دیکھ کر کہیں کہ یہ قابل تقلید نمونہ ہے، نہیں تو تمہارا آنا مصیبت و وبال کی بات ہے اور اب ایسا نہ ہو کہ تم بالکل کھونہ جاؤ، یہاں جوئی تہذیب کا دریا بہہ رہا ہے خدا نخواستہ تم بھی ڈوب نہ جاؤ، اس کے لیے ضروری ہے کہ تمہاری زندگی سادہ ہو، اگر تمہاری زندگی سادہ ہوئی تو اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے گا، بہت سکھ اور چین کی زندگی نصیب کرے گا، رزق میں برکت ہوگی، اچھی اور سچی اولاد پیدا ہوگی، اور اگر یہاں آ کر تمہاری سادگی ختم ہوگئی اور وہی اسراف، وہی فضول خرچی، وہی فیشن پرستی، وہی غفلت، وہی تفریح کا شوق اور وہی فرمائش، اور وہی ان لوگوں کی نقل کرنا، تو پھر یہ زندگی آزار بن جائے گی اور گھر جہنم کا نمونہ بن جائیں گے۔“ (۲)

کابل (افغانستان) کی ایک تقریر میں بے پردگی، اور معاشرتی قدروں سے بغاوت کو قومی زوال کا پیش خیمہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

”میں نے قوموں اور تہذیب و تمدن کی تاریخ (اور خاص طور سے قوموں اور تہذیبوں کے ارتقاء و انحطاط کی تاریخ) کا مطالعہ بڑی توجہ اور انہماک سے کیا ہے، اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ قوموں اور ملتوں کے زوال، ان کی

تباہی و بربادی اور انتہائی ترقی یافتہ اور مسکور کن تمدنوں اور تہذیبوں کے زوال اور فنا کا سب سے اہم اور بنیادی سبب ہے ان کے عائلی نظام کا انتشار، گھریلو زندگی میں اعتدال و توازن کا فقدان، مرد و زن کے ارتباط باہمی میں فساد و اختلال، گھریلو زندگی سے عورتوں کی بے توجہی اور اس کی ذمہ داریوں سے فرار۔ تاریخ میں جتنی بھی زوال پذیر تہذیبیں اور پستی و انحطاط اور تباہی و بربادی کی طرف تیز قدموں سے بھاگتی ہوئی قومیں نظر آتی ہیں، وہاں یہ بیماری ضرور پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے کہ عورتوں نے گھریلو زندگی سے فرار اور اس کی ذمہ داریوں سے پہلو تہی شروع کر دی، وہ مامتا کے جذبہ سے محروم ہو گئیں، اولاد کی پرورش و پرداخت اور نئی نسل کی تربیت اور اس کی ذمہ داریوں سے گریز کرنے لگیں اور اپنے گھر کو سکون و اطمینان کا گھر بنانے سے غافل ہو گئیں، جہاں مرد کو امن و عافیت اور سکون و راحت کی دولت میسر آ سکے، وہ گھر میں داخل ہو تو محسوس کرے جیسے جنت میں آ گیا ہو، بلکہ اس کے بجائے وہ مردوں کی ذمہ داریوں اور ان کی کارگزاری کے میدانوں میں برابر کی شرکت، ان کی ہم سفری اور ہم صفیری، ہر میدان میں ان کے دوش بدوش کھڑے ہونے بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں ان کا مقابلہ کرنے کے شوق میں پاگل ہو گئیں، اور اس کے نتیجہ میں ان معاشروں میں، ذہنی و فکری انتشار، عام لاقانونیت، انارکی اور اخلاقی بحران پیدا ہو گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہلاکت کے غار کی طرف ان کے بڑھتے ہوئے قدم اور تیز ہو گئے۔ یہی قدیم یونانیوں کی کہانی ہے، اور یہی قدیم رومیوں اور ایرانیوں کے زوال کی داستان ہے، اور مجھے خطرہ ہے کہ کہیں مشرقی قومیں بھی اسی دردناک انجام سے دوچار نہ ہوں، اور رنج و فکر کی بات ہے کہ ہمارے مشرقی اسلامی معاشرہ میں اس کے آثار ظاہر بھی ہو چکے ہیں۔“ (۱)

یہ حضرت مولانا کی بڑی خصوصیت ہے کہ انہوں نے ہر طبقہ کو خطاب کیا ہے، کارخ

فقیری سے لے کر ایوان شاہی تک انہوں نے دین حق کی دعوت پہنچائی ہے، ہر طبقہ کے امراض بتائے اور ان کے علاج کی تدبیریں کی ہیں، سربراہان مملکت، عمائدین حکومت اور دانشور طبقہ کی خاص طور پر انہوں نے فکر رکھی ہے، ملک کے سربراہوں کو بھی انہوں نے خطاب کیا ہے اور مشورے دیئے ہیں۔ اس کی تفصیلات شروع کے ابواب میں گزر چکی ہے۔

عمومی امراض کی نشاندہی اور ان کا علاج

حضرت مولانا نے اپنی متعدد تقریروں میں بڑی قوت کے ساتھ یہ بات فرمائی ہے کہ اس وقت کا سب سے بڑا مرض یقین کی کمی ہے، جس کے نتیجے میں بے عملی، غفلت، مظاہر دین سے دوری اور متعدد امراض ہیں جو پیدا ہو رہے ہیں، اور یہی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلمان ہر محاذ پر پیچھے ہٹتے چلے جا رہے ہیں، اور ناکامیوں کا ان کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مولانا فرماتے :

”یقین دنیا کی بہت بڑی طاقت ہے، جب بھی کوئی مرد خدا کسی بات پر پہاڑ کی طرح جم گیا اور اس نے حالات کے سامنے سپر ڈالنے سے انکار کر دیا، اور اپنے یقین کا رشتہ مضبوط ہاتھوں سے تھام لیا تو زمانے کے بہتے ہوئے دھارے کا منہ پھر گیا اور مبصرین کے اندازے غلط نکل گئے، اسلامی تاریخ میں اس طرح کی مثالیں جا بجا ملتی ہیں۔“ (۱)

”آج عالم اسلام پر جو مصائب آرہے ہیں، اور دین کا ایوان جس طرح تزلزل میں ہے، مسلمانوں کے حوصلے جس طرح پست اور ان کی طبیعتیں جس طرح افسردہ ہوتی جا رہی ہیں اور وہ اسلام کے مستقبل سے گویا ناامید ہوتے جا رہے ہیں، یاس و ناامیدی کے الفاظ جس طرح زبانوں اور قلم پر آنے لگے ہیں اس میں اسی یقین کی ضرورت ہے جو گرتے ہوئے دلوں کو تھام لے، بجھتی ہوئی طبیعتوں کو گرمادے اور سوتی ہوئی ہمتوں کو جگا دے۔“ (۲)

صحیح نیت پر حضرت مولانا ہمیشہ زور دیتے رہے، متعدد مرتبہ یہ بات فرمائی کہ ”اس

امت کا اصل مرض بے نیکی ہے بد نیکی نہیں، بڑے سے بڑا کام کر جاتے ہیں مگر رضائے الہی کی نیت نہیں ہوتی۔“

اپنی تقریروں میں کئی جگہ مولانا نے یہ بات فرمائی ہے کہ آدمی کو اپنی فکر کم ہوتی ہے دوسروں کی زیادہ، یہ ایک بہت بڑا نقص ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

”ہمارے اجتماعی فلسفہ اور سیاسیات نے یہ ذہن پیدا کیا ہے کہ آدمی کی نظر دوسروں کے عیوب پر پڑتی ہے، اس کا محاسبہ زیادہ تر دوسروں سے ہوتا ہے، فلاں پارٹی یہ کر رہی ہے، فلاں طبقہ یہ کر رہا ہے، فلاں شخص اپنی ذمہ داری پوری نہیں کر رہا ہے، اور اس کی فرصت ہی نہیں ملتی کہ آدمی اپنا جائزہ لے اور دیکھے کہ ہم میں کیا نقص ہے؟“ (۱)

ہندوستان میں اصلاح معاشرہ کی تحریک

حضرت مولانا کی ”اصلاحیات“ میں ”اصلاح معاشرہ“ کو خاص اہمیت حاصل ہے، اپنی تقریروں میں، گفتگو میں، تحریروں میں مولانا ہمیشہ اس پر زور دیتے رہے ہیں۔ ہندوستان میں حضرت مولانا نے اس کی باقاعدہ تحریک چلائی ہے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کے خطبات صدارت میں یہ موضوع بہت نمایاں ہے۔ حکومت سے قانونی لڑائی لڑنے کے ساتھ ساتھ مولانا نے مسلم عوام کو بھی جھنجھوڑا ہے اور احتساب کی دعوت دی ہے، معاشرہ کی خرابیاں کھول کھول کر بیان کی ہیں اور معاشرہ کو ان سے پاک کرنے پر زور اور مؤثر دعوت دی ہے۔ اپنے ایک خطبہ صدارت میں فرماتے ہیں:

”جب ہم اپنی حکومت اور برادران وطن سے شکایت کرتے ہیں تو ہمیں آپ سے شکایت کرنے کا حق کیوں نہ ہو؟ ان سے تو شکایت کریں گے اور ان کا دامن پکڑیں گے، لیکن آپ کا گریبان پکڑ لیں گے اور وہ ہاتھ ہمارا ہاتھ نہیں ہوگا وہ دینی احتساب کا ہاتھ ہوگا، وہ شریعت کا ہاتھ ہوگا جو آپ کا گریبان پکڑے گا اور کہے گا کہ پہلے تم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو

کہ تم اس قانون پر کتنا چلتے ہو؟ تمھاری نگاہوں میں اس قانون کی کتنی حرمت ہے؟ تم جہاں اس قانون کو چلا سکتے ہو وہاں چلا رہے ہو کہ نہیں؟ تم تو اپنے گھروں میں اس قانون کو نہ چلاؤ اور حکومت سے مطالبہ کرو کہ وہ تمھارے قانون کو چلائے اس کا احترام کرے، یہ کیا بواجبی ہے؟“ (۱)

حضرت مولانا نے اپنی تقریروں میں معاشرہ کی جو خرابیاں بیان فرمائی ہیں ان میں شادی بیاہ کی فضول خرچیاں اور بے جا رسمیں، میراث کی غیر شرعی تقسیم اور معاملات کی خرابیاں بہت کھول کھول کر بیان فرمائی ہیں۔ ایک تقریر میں فرماتے ہیں :

”یہاں سے عہد کر کے جائیے کہ اب قانون شریعت پر آپ چلیں گے۔ یہ جہیز کی کیا مصیبت ہے، لڑکے والوں کی طرف سے مطالبات کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش ہوتی ہے، شرائط پیش کیے جاتے ہیں، ان کے پورا نہ ہونے پر محسوس لڑکیاں جلادی جاتی ہیں، ملک میں سیکڑوں واقعات پیش آتے ہیں۔“ (۲)

”آپ رحمۃ اللعالمین کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے ہندوستانی سماج میں، ہندوستان کے معاشرہ اور سوسائٹی میں یہ ظلم ہو! اس کو عقل قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، آپ کے ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں ہونا چاہیے تھا چہ جائیکہ آپ کے ہاتھوں ہو!“۔ (۳)

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے حضرت نے باقاعدہ ”اصلاح معاشرہ“ کی تحریک چلائی ہے۔ بورڈ کے علاوہ مدارس کے جلسوں میں، نکاح کے خطبوں میں مولانا نے اسلامی معاشرت اختیار کرنے کی مؤثر دعوت دی ہے اور اس کے بہتر نتائج مرتب ہوئے ہیں۔ مولانا کی داعیانہ اور اولوالعزمانہ زندگی کا یہ وہ روشن باب ہے جس کو کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

اصلاح باطن

حضرت مولانا کی اصطلاحیات میں ”اصلاح باطن“ کو ایک خاص مقام حاصل ہے، مولانا کی نظر میں اصلاح باطن کے بغیر انسان مکمل نہیں ہو سکتا، اسلامی نظام حیات میں ظاہری اعمال و افعال کی طرح باطنی کردار و اخلاق کی اہمیت تسلیم کی گئی ہے۔ اسلام کے مفکروں اور داعیوں میں حضرت مولانا کا یہ امتیاز ہے کہ انھوں نے کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا، ظاہری علوم و آداب کے ساتھ ساتھ باطنی اصلاح و کمالات کی طرف بھی انہوں نے بھرپور توجہ کی ہے اور یہیں سے ان کی دعوت و فکر دو آتشہ ہو جاتی ہے۔

مولانا ان باطنی کمالات و آداب کو ”فقہ باطن“ سے تعبیر کرتے ہیں، اور اس طرح انہوں نے تصوف کی مروجہ اصطلاح سے ایک پردہ اٹھایا ہے جو بہت سے ظاہر بین علماء کی نگاہوں پر پڑ گیا تھا۔

مولانا فرماتے ہیں :

”جب ہم شریعت اسلامی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و احوال پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو حصوں پر منقسم تھے، ایک کا تعلق افعال و حرکات اور امور محسوسہ سے تھا مثلاً قیام و قعود، رکوع و سجود، تلاوت و تسبیح، اذکار و ادعیہ، احکام و مناسک۔ فن حدیث نے اس کی روایت اور تدوین کی خدمت انجام دی، علم فقہ نے اس سے مسائل و جزئیات استخراج کرنے کا بیڑا اٹھایا، اور محدثین اور فقہائے امت نے (اللہ تعالیٰ ان کو اس کا ر عظیم کا بہترین صلہ عطا فرمائے) دین کو اس طرح محفوظ کر دیا کہ امت کے لیے اس پر عمل پیرا ہونا آسان ہو گیا۔

دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق ان باطنی کیفیات سے ہے جو ان افعال و حرکات کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں قیام و قعود، رکوع و سجود، ذکر و دعا، وعظ و نصیحت، گھر کے ماحول، میدان جہاد، غرض ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان کیفیات کی تعبیر ہم اخلاص

واحتساب، صبر و توکل، زہد و استغناء، ایثار و سخاوت، ادب و حیا، خشوع و خضوع، انابت و تقویٰ، دعا کے وقت دل کی شکستگی، دنیا پر آخرت کو ترجیح، رضائے الہی اور دیدار کا شوق، اور اس طرح کی اور دوسری باطنی کیفیات، اور ایمانی اخلاق سے کر سکتے ہیں، جن کی حیثیت جسم انسانی میں روح کی اور ظاہر میں باطن کی ہے..... پھر ان عنوانات کے تحت اور بہت سی جزئیات اور آداب و احکام ہیں، جنہوں نے اس کو ایک مستقل علم اور علمِ ہدایت کا درجہ دے دیا ہے، چنانچہ اگر اس علم کو جو اول الذکر کی شرح و تفسیر سے متعلق ہے ”فقہ ظاہر“ کہا جاسکتا ہے تو وہ علم جو ان کیفیات کی تشریح کرتا اور ان کے حصول کے لیے رہنمائی کرتا ہے ”فقہ باطن“ قرار دیا جاسکتا ہے۔“ (۱)

اس کے ساتھ ساتھ مولانا نے ان ظاہر پسند صوفیوں پر بھی نقد کیا ہے جنہوں نے اصطلاحات اور وسائل کو اصل قرار دے کر امت کے ایک طبقہ کو اس اہم ضرورت سے محروم رکھا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں :

”احسان اور فقہ باطن سب علمی و شرعی حقائق اور دین کے مسلمہ اصول ہیں، جو کتاب و سنت سے ثابت ہیں، اگر اہل تصوف اس مقصد کے حصول کے لیے (جس کو ہم تزکیہ و احسان سے تعبیر کرتے ہیں) کسی خاص متعین راستہ یا شکل پر اصرار نہ کرتے (اس لیے کہ زمان و مکان اور نسلوں کے مزاج اور ماحول کے ساتھ اصلاح و تربیت کے طریقے اور نصاب بھی بدلتے ہیں) اور وسیلہ کے بجائے مقصد پر زور دیتے تو اس مسئلہ میں آج سب یک زبان ہوتے، اور اختلاف کا سررشتہ ہی باقی نہ رہتا، سب دین کے اس شعبہ اور اسلام کے اس رکن کا جس کو ہم تزکیہ یا احسان یا فقہ باطن کہتے ہیں صاف اقرار کرتے، اور اس بات کو بلا تاویل قبول کرتے کہ وہ شریعت کی

روح، دین کا لب لباب اور زندگی کی بنیادی ضرورت ہے، اور یہ کہ جب تک اس شعبہ کی طرف کما حقہ توجہ نہ کی جائے، اس وقت تک کمال دین حاصل نہیں ہو سکتا، اور اجتماعی زندگی کی بھی اصلاح نہیں ہو سکتی، اور نہ صحیح معنی میں زندگی کا لطف آ سکتا ہے۔“ (۱)

اصلاح باطن کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اور اس کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

”اب ہم کو فراخ دلی کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے، اور قیود و اصطلاحات اور خواہشات اور تعصبات سے آزاد ہو کر سوچنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ ہم ایک دینی حقیقت سے (جو شریعت کے مسلمات میں سے ہے، اور کتاب و سنت اس کی دعوت دیتے ہیں، اور انسانی معاشرہ کو بھی اس کی شدید احتیاج ہے) محض ایک نئی اصطلاح اور ایک مروج نام کی وجہ سے گریز اختیار کرنے لگیں۔“ (۲)

حضرت مولانا نے ان نام نہاد صوفیوں پر سخت تنقید کی ہے جنہوں نے تصوف کو اپنے دنیاوی مقاصد کے لیے آلہ کار بنایا، اور اس کے ذریعہ سے دولت و عزت حاصل کی۔ لیکن وہ حضرات جنہوں نے اصل تزکیہ نفوس کی دعوت دی، جس کا نام احسان اور فقہ باطن ہے، ان کے وجود کو مولانا نے تجدید دین کا تسلسل قرار دیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں :

”اس میں شک نہیں کہ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو مسلم سوسائٹی بہت عرصہ ہو ادم توڑ چکی ہوتی، اور مادیت کی سرکش اور گرم لہر اس کے بچے بچے ایمان و یقین کا خاتمہ کر دیتی، قلوب کا اللہ تعالیٰ سے، زندگی کا روحانیت سے، معاشرہ کا اخلاق سے رشتہ منقطع ہو جاتا، اخلاص و احتساب ختم ہو جاتا، اور باطنی امراض کی کثرت ہوتی، قلوب و نفوس کی بیماریاں پھیلنیں اور طبیب نہ ملتا، اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے، حرص و طمع کا ان پر کلی تسلط ہوتا، غرض کہ دین کا وہ شعبہ جو نبوت کے شعبوں میں ایک شعبہ

ہے۔ (یعنی تزکیہ نفوس اور فقہ باطن) بالکل معطل ہو جاتا۔“ (۱)

حضرت مولانا نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں پوری قوت کے ساتھ ان صفات کو اختیار کرنے پر زور دیا ہے جن سے روح میں بالیدگی اور عمل میں جان پیدا ہوتی ہے، دل کی صفائی، اخلاص و اللہیت، انابت و خشوع، صبر و توکل، زہد و استغناء، یہ وہ صفات ہیں جو مولانا کی دعوت و فکر کی قوت کا راز اور مقبولیت کی دلیل ہیں۔ (۲) مولانا نے ان کی پر زور دعوت دی ہے۔

صفائی قلب

اصلاح باطن کا سب سے پہلا درجہ صفائی قلب ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **الْإِن فِي الْجَسَدِ مَضْغَةٌ، إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ. إِلَّا وَهِيَ الْقَلْبُ.** “ (خبردار ہو جاؤ! کہ جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ایسا ہے کہ اگر وہ درست ہو جائے تو پورا جسم صحیح ہو جاتا ہے اور اگر اس میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو پورے جسم پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ اور گوشت کا ٹکڑا دل ہے) اس حدیث کے حوالہ سے مولانا نے متعدد تقریروں میں دل کی صفائی پر زور دیا ہے، اور اس کی اہمیت بیان فرمائی ہے۔ ایک بلیغ مثال دیتے ہوئے مولانا اس کو یوں واضح کرتے ہیں :

”آپ کسانوں کو دیکھتے ہیں، خدا کے بنائے ہوئے صحیح اور فطری قانون کے مطابق کسان زمیں میں اہل چلاتا ہے تو زمین کتنا خزانہ اگل دیتی ہے، اسی طرح اگر دل کی کھیتی میں اہل چلایا جائے، اور خدا کے پیغمبروں کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق چلایا جائے، اور اس میں تھوڑی سی محنت صرف کی جائے اور یہ دل کی کھیتی لہلہا اٹھے اور پھلنے پھولنے لگے تو آپ سمجھ سکتے

(۱) ایضاً صفحہ ۲۲، ۲۳

(۲) معاصر کبار اولیاء اللہ کے یہاں مولانا کی محبوبیت کا راز بھی صفات ہیں۔ مشہور صاحب حال بزرگ حضرت شاہ وحی اللہ صاحب ایک مجلس میں جس میں حضرت مولانا موجود نہیں تھے بلا کسی سابقہ تقریب کے فرمانے لگے: ”سب کے دل دیکھے لیکن علی میاں جیسا دل کہیں نہیں دیکھا۔“ یہ واقعہ مولانا ابو بکر حسنی گو خود ان صاحب نے سنایا جو اس مجلس میں موجود تھے، اور حضرت مولانا سے متعارف نہیں تھے۔

ہیں کہ اس دنیا کا نقشہ کیا ہوگا؟! یہ حقیر زمین جو آپ کے قدموں تلے روندی جاتی ہے اس سے آپ نے اتنا بڑا فیض پایا۔ اگر آپ دل کی کھیتی میں خدا کے پیغمبروں کے دیئے ہوئے ہل چلاتے اور ان کے بتائے ہوئے قانون کے مطابق آپ اس کی خدمت کرتے اور اس میں ریاض کرتے، اور وہ کھیتی برگ و بار لاتی تو پھر آپ دیکھتے کہ دنیا میں کیسی بہار آتی ہے، اور جب دل کی کھیتی خزانہ اگل دیتی تو دنیا کا دامن کیسے کیسے موتیوں سے بھر جاتا، کیسے کیسے ولی کامل، کیسے کیسے خادم انسانیت، کیسے کیسے بے لوث و بے غرض انسان اور انسانوں کے لیے اپنا خون پانی ایک کرنے والے سامنے آتے جن کے کارناموں کا تصور کرنا بھی مشکل ہے!!“ (۱)

خواص میں تقریر کرتے ہوئے مولانا نے ایک جگہ فرمایا کہ آپ کی حیثیت ملت کے لیے دل کی سی ہے، اور دل کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں۔ ۱- حیات ۲- حرکت ۳- حرارت :

”بس اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ تینوں شرطیں ہم میں پائی جاتی ہیں یا نہیں، اگر حیات ہے لیکن حرکت نہیں ہے ہماری زندگی میں وقوف اور تعطل پیدا ہو گیا ہے، تو جیسے بہتا ہوا پانی رکنے کے بعد خراب ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اس میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح ہمارے معاشرہ اور حیات ملی میں بھی فساد آجائے گا۔ تیسری بات یہ کہ حرارت بھی ہو یعنی تعلق مع اللہ، عشق رسول، لقائے رب، جنت کا شوق، ایمان کی قوت اور حق بات کہنے کی جرأت۔“ (۲)

حرارت پیدا کرنے کا نسخہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”حرارت پیدا ہوتی ہے دعا و مناجات اور توکل سے، اللہ کے رشتہ میں

(۱) مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں صفحہ ۱۷۱، ۱۷۲

(۲) تحفہ کشمیر صفحہ ۲۸، ۲۹

تکلیف اٹھانے سے، کچھ مجاہدہ کرنا پڑے تو دل میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔“ (۳)

اخلاص و احتساب

اخلاص عمل کی کسوٹی ہے، اس سے عمل کے اندر جان پیدا ہوتی ہے، بڑے سے بڑا عمل اگر بغیر نیت کے یا غلط نیت سے کیا جائے تو وہ مقبول نہیں ہوتا۔ حضرت مولانا نے اس کی ضرورت و اہمیت کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے، متعدد تقریروں میں ان دو حدیثوں کا حوالہ دیا ہے جن میں رمضان کے روزوں اور تراویح کے لیے بھی ایمان و احتساب کی شرط لگائی گئی ہے، جب کہ یہ دونوں عام طور پر رضائے الہی کی نیت ہی سے کیے جاتے ہیں۔ مولانا اس سلسلہ میں یہ واقعہ نقل فرمایا کرتے تھے کہ ”ایک مرتبہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے روزہ پر میری تقریر نشر ہوئی، اس دن یا اس کے دوسرے دن ایک بڑے مسلمان سرکاری افسر کے یہاں ملاقات کے لیے جانا ہوا۔ انہوں نے کہا کہ مولانا ریڈیو پر میں نے آپ کی تقریر سنی، آپ نے بڑی اچھی تقریر کی، لیکن ایک بات آپ نے نہیں کہی کہ افطار کے وقت جو مزہ آتا ہے وہ دنیا کے کسی چیز میں نہیں آتا، اور میں تو روزہ رکھتا ہی اسی مزہ کے لیے ہوں۔“

مولانا یہ بھی فرماتے تھے کہ ”امت کا اصل مرض بے نیتی ہے بد نیتی تو کم ہی ہوتی ہے، لیکن بڑے سے بڑا عمل کرتے ہیں اور کوئی خیال بھی نہیں ہوتا کہ کیوں کر رہے ہیں؟ اس طرح وہ عمل ضائع ہو جاتا ہے۔“

صحیح نیت کے نتائج و اثرات بیان کرتے ہوئے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں :

”ہر وہ عمل جس کو انسان صرف رضائے الہی اور جذبہ اخلاص اور طاعت و فرمانبرداری کے ساتھ انجام دے وہ قرب الہی اور یقین و ایمان کے اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب تک پہنچنے کا ذریعہ ہے، اور وہ دین خالص ہے جو ہر شانہ سے پاک ہے، خواہ وہ عمل راہ خدا میں جہاد و قتال ہو، یا حکومت و انتظام یا دنیا کی نعمتوں سے استفادہ ہو، یا نفس کے جائز تقاضوں کی تکمیل، یا

رزق حلال و ملازمت کی کوشش ہو، یا جائز تفریح طبع کا سامان ہو، یا عاقلی اور از دو اجی زندگی سے لطف اندوزی ہو، اس کے برعکس ہر وہ عبادت یا دینی خدمت دنیا داری سمجھی جائے گی جو رضائے الہی کی طلب، خدا تعالیٰ کے اوامر و نواہی پر ایمان اور ان کی تکمیل سے خالی ہو اور غفلت و آخرت فراموشی کے دبیز پردے اس پر پڑے ہوں، خواہ وہ عمل فرض نماز، ہجرت و جہاد، ذکر و تسبیح اور راہ خدا میں شہادت ہی کیوں نہ ہو، ایسے عمل کرنے والا ہر شخص خواہ عالم و مجاہد ہو یا داعی و مبلغ، اس کو ثواب سے محرومی کا سامنا کرنا ہوگا، بلکہ خطرہ ہے کہ یہ اعمال اور خدمات اس کے لیے وبال اور اس کے اور خدا کے درمیان حجاب نہ بن جائیں۔“ (۱)

نیک صحبت کی ضرورت

تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس کے لیے حضرت مولانا نے نیک صحبت اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے اور اصلاح کا اس کو بہترین نسخہ قرار دیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں :

” انسان خواہ کتنا ہی دور اندیش اور باریک بین ہو، آئینہ ہی میں اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے، خوش بخت وہ ہے جو اپنی کمزوریوں اور ان اخلاقی امراض سے جیسے کبر، حسد، حرص و طمع، بخل، کینہ، عداوت، دنیا کی محبت، دولت کے عشق اور ہوس، اور مسلمان کی تحقیر و دناست جیسے اخلاق رذیلہ سے واقف ہو اور ان کے ازالہ اور ان سے خلاصی کی فکر رکھتا ہو، اور ان سے اسی طرح نبر و آڑما ہو جیسے اپنے جانی دشمن سے ہوتا ہے۔ اور وہ شخص بڑا قسمت ور اور خوش نصیب ہے جس کو کوئی ایسا ربانی عالم اور طبیب حاذق میسر آ جائے، جو اس کو متنبہ کرے، اور ان بعض اخلاقی کمزوریوں اور مخفی بیماریوں سے آگاہ کرے اور ان سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ تجویز کرے، اور اس کو آسان اور ممکن العمل بنا دے، اس کا نور باطن مستفید و مریض میں سرایت کرے، اس کی صفات و خصوصیات کا اس پر پرتو پڑے، اس کے محاسبہ نفس اور خوف و خشیت

کو دیکھ کر وہ عبرت اور سبق حاصل کرے۔

قدیم زمانہ میں صحبت حسب سے آسان طریقہ علاج تھا، اور بڑے بڑے ائمہ فرین اور علماء خدا کے ایسے مخلص و ربانی بندوں کی تلاش میں رہتے تھے، خواہ علم میں ان سے کم مرتبہ ہی کیوں نہ ہوں، کیوں کہ ان کو ان کی مجلس اور صحبت میں وہ کچھ ملتا تھا جو اصلاح حال و تربیت باطنی میں ممد و معاون تھا، نفس اور شیطان سے حفاظت کا ذریعہ ہوتا۔ امام احمد بن حنبلؒ کے صاحبزادہ نے ایک مرتبہ اپنے والد ماجد سے اس بات کی شکایت کی کہ وہ محض ایسے لوگوں کی مجالس و عطا و تذکیر میں شریک ہوتے ہیں جو علم میں ان سے فروتر اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کے مستحق ہیں، اس سے ان کو شرم ہوتی ہے، اور بعض مرتبہ لوگوں کو غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ امام عالی تبار نے فرمایا: ”یا بنی! انما یجلس المرء حیث یجد صلاح قلبہ“ (بیٹا! آدمی وہیں بیٹھتا ہے جہاں اپنے قلب کا نفع دیکھتا ہے۔) (۱)

حضرت مولانا آگے لکھتے ہیں :

”اگر کسی کو یہ صحبت میسر نہ آئے تو اس کو بہت ہشیار رہنے کی ضرورت ہے، وہ اپنے نفس اور باطنی حالات پر خصوصی توجہ دے، اور ایک صاحب بصیرت نقاد یا غیر جانب دار حاکم یا اتالیق بن کر اس کا جائزہ لیتا رہے اور اپنی روحانی بیماریوں اور کمزوریوں سے واقف ہونے کی کوشش کرے۔“ (۲)

نفس کے علاج کے لیے حزیذ فرماتے ہیں :

”اس سلسلہ میں ذکر و دعا کی کثرت اور ان خطرناک روحانی امراض کے مہلک نتائج سے اندیشہ و خوف اور اپنے نفس پر بے اعتمادی اور اس سے بے اطمینانی، غفلت اور غافلوں اور روحانی و قلبی امراض میں گرفتار، نفسانی تاویلات اور شیطانی مکر و فریب میں مبتلا لوگوں کی صحبت سے اجتناب مفید و معاون ہوگا۔“ (۳)

اصلاح و استفادہ سے کوئی مستغنی نہیں

حضرت مولانا نے جگہ جگہ یہ فکر پیش کی ہے کہ کوئی کیسی بھی دینی ترقی کر جائے لیکن اس کے ساتھ اس کا نفس ہے جو کسی مرحلہ پر بھی اس کو دھوکہ دے سکتا ہے، اس لیے اصلاح نفس کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی، اور اس کے لیے استفادہ ضروری ہے تاکہ ایمان کی صوفشانی کا تسلسل جو عہد صحابہ سے چلا آ رہا ہے وہ چلتا رہے اور شمع سے شمع جلتی رہے۔

